درِ زنداں



رزاق شاہد کوہلر

ناول رزاق شاہد کوہلر

درِ زنداں

''ابے او گیدڑ خان! اُٹھتے ہو کہ اُتاروں تیرے بھیجے میں گولی؟'' بابا جان کی کرخت آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی تو میں گہری نیند سے بوکھلا کر یوں جاگا جیسے کسی نے میرے سر پر بم پھوڑ ڈالا ہو۔

''جج.....جج.....جی..... بابا جان۔'' میں نے خوف سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''مم..... میں سوتو.....نہیں رہا تھا۔''

''مجھ سے..... سردار دلاور خان سے جھوٹ بولتے ہو۔'' بابا جان نے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی رائفل یوں سیدھی کی جیسے مجھ پر فائر کرنا چاہتے ہوں۔ ''تم سو نہیں رہے تھے تو کیا سونے کا ڈرامہ کر رہے تھے۔''

''قسم سے..... بابا جان.....مم..... میں ذرا کمر سیدھی کر رہا تھا۔'' میں نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

''شرم سے ڈوب مرو گیدڑ کے بچے...... کمر تو عورتیں سیدھی کرتی ہیں۔''

''کک..... کیا مردوں کی کمر نہیں ہوتی.......''

''چپ..... خنزیر کے بچے'' بابا نے قطع کلامی کی۔ ''کیا مرد بچے پیدا کرتے ہیں؟...... بولو..... جواب دو''

''تو کیا کمر سیدھی کرنے کے لیے بچے پیدا کرنا ضروری ہیں؟''

"بالکل ضروری ہے۔" اُنھوں نے جواب دیا۔ "عورت بچے پیدا کرتی ہے، اس لیے اُس کی کمر میں درد ہوتا ہے اور اس درد سے نجات حاصل کرنے کے لیے جب وہ بستر پہ لیٹتی ہے تو اُس وقت وہ اپنی کمر سیدھی کر رہی ہوتی ہے اور اسے "کمر سیدھی کرنا" بولتے ہیں۔"

بابا جان نے "کمر سیدھی کرنا" کی جس خوب صورت پیرائے میں وضاحت کی تھی، وہ میرے تو کیا.... میرے فرشتوں کے گمان میں بھی نہیں تھی۔ بابا جان ایک روایتی پٹھان تھے اور وہ بھی قبائلی چنانچہ اُن کی وضاحت اُن کے اپنے تئیں تو بالکل درست تھی تاہم میرے لیے مضحکہ خیز تھی۔ سو میں نے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا تو وہ مجھے خشمگیں نظروں سے گھورنے لگے۔

میں نے کہا۔ "واہ بابا جان واہ..... کیا کمال کی وضاحت کی ہے، آپ کو تو پروفیسر ہونا چاہیے تھا۔"

وہ ایک دم نرم پڑتے ہوئے بولے۔ "مسکہ مت لگاؤ بچے...... میں جانتا ہوں کہ میں بالکل اَن پڑھ ہوں۔"

"سوری بابا جان! وہ........"

"سوری کے بچے۔" اُنھوں نے بگڑ کر میری بات کاٹی۔ "کتنی بار منع کیا ہے کہ میرے سامنے فرنگیوں کی زبان مت بولا کر...... خانہ خراب کسی دن مارا جائے گا میرے ہاتھ سے..... کیا اپنی زبان میں معافی نہیں مانگ سکتے تھے؟"

میں نے کہا۔ "سوری تو ایک عام سا لفظ ہے اور آج کل اس ملک کی سبھی زبانوں میں تواتر سے استعمال ہوتا ہے۔"

"میں لعنت بھیجتا ہوں تیری سوری پر..... مجھ سے صرف پشتو میں بات کیا کر۔"

"او...... ٹھیک ہے بابا جان۔" میں جو "اوکے" کہنے والا تھا عین وقت پر سنبھل گیا۔

"اچھا چل اب نہا دھو کر تیاری کر۔" بابا جان نے نرم انداز میں حکم سنایا۔

کیا ہم کہیں جا رہے ہیں؟"

"تمہیں نہیں معلوم؟" اُن کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ "کیا مور جان (امی جان) نے نہیں بتایا؟"

”بتایا تو تھا لیکن........“

”لیکن کیا؟“ بابا جان نے آنکھیں نکالیں۔

”اس طرح کے ہنگامے اور شور شرابے مجھے اچھے نہیں لگتے۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

”میں زندگی بھر پچھتا تا رہوں گا۔“ اُنھوں نے تاسف سے سر ہلایا۔ ”بہت بڑی غلطی کی ہے میں نے، مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

”کیا نہیں کرنا چاہیے تھا؟“ میں نے سوال کیا۔

”غلطی۔“

”کون سی غلطی؟“ میں نے حیرانی کے عالم میں پوچھا۔

”تمہارا نام شیر دل خان رکھنے کی غلطی۔“

”نام تو اچھا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”اسی لیے تو پچھتا رہا ہوں کہ نام اچھا ہے لیکن تمہارے لیے مناسب نہیں ہے۔“

”کیوں مناسب نہیں ہے؟“ میں نے الجھ کر پوچھا۔

”بکری کو شیر کا نام دینا نا مناسب نہیں تو کیا ہے؟“ وہ بھڑک اُٹھے۔ ”تم نے میرے گھر میں کیا سوچ کر جنم لیا؟“

”میں نے اپنی مرضی سے تھوڑی جنم لیا ہے؟“

”تو کیا میری مرضی سے جنم لیا ہے؟“

”مرضی تو اُوپر والے کی تھی بابا جان، تاہم اِس میں آپ کا تعاون ضرور شامل تھا۔“ میں نے جھٹ سے جواب دیا۔

”تم بہت بے شرم ہو شیر دل خان۔“ بابا جان بے اختیار ہنس دیے۔ ”میں تم سے باتوں میں نہیں جیت سکتا۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں یہ بات تو ہے میں نے سولہ جماعتیں پاس کی ہیں جب کہ آپ نے صرف محلے کے

مولوی سے نورانی قاعدہ پڑھا تھا برسوں پہلے۔"

"کاش تم اسی طرح بہادر بھی ہوتے۔" بابا جان دوبارہ افسردہ ہو گئے۔ "تو میں تم پر فخر کرتا.... پھر یار دوست یوں میرا مذاق نہ اُڑاتے۔"

"میں بزدل نہیں ہوں بابا جان۔" میں نے احتجاج کیا۔ "امن پسند ہوں..... اس لیے بندوق کو ناپسند کرتا ہوں۔ آپ لوگوں کے مذاق کی پرواہ نہ کیا کریں۔ اُن کا تو کام ہی باتیں بنانا ہے۔"

"لعنت ہے تیری اس امن پسندی پہ..... بندوق تو مرد کا زیور ہے۔"

"مجھے اس زیور کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے منہ بنا کر کہا۔ "یہ وہ زیور ہے جو انسانوں کی جان لیتا ہے۔ یہ دراصل......."

"اچھا اب بک بک نہ کرو۔" اُنھوں نے میری بات کاٹی۔ "جلدی سے تیار ہو جاؤ، بہت دیر ہو گئی ہے۔"

"میں نہیں آسکتا۔" میں نے انکار میں سر ہلایا۔ "آپ مہر دل خان کو ساتھ لے جائیں۔"

"وہ بھی جا رہا ہے اور تمہیں بھی ساتھ لے کر جاؤں گا۔ ابھی اگر مگر چھوڑو اور دس منٹ کے اندر تیار ہو جاؤ۔" بابا جان نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔

دراصل بابا جان مجھے ایک شادی کی تقریب میں لے جانا چاہتے تھے مگر مجھے فطرتی طور پر ایسے ہنگاموں سے بے حد نفرت تھی۔ میں بچپن ہی سے تنہائی پسند تھا۔ روایتی پٹھانوں سے قطعی مختلف ذہن وافکار رکھتا تھا۔ لڑائی، جھگڑے، مارا ماری اور فضول گوئی سے مجھے سخت چڑ تھی۔ میں پٹھانوں میں نسل در نسل چلنے والی دشمنیوں سے بھی نالاں تھا۔ پٹھان ہوتے ہوئے بھی میں نے آج تک کسی قسم کے ہتھیار کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ یہاں ہتھیار کو عزت وفخر کی علامت سمجھا جاتا ہے، گھر میں بے شک فاقے چل رہے ہوں مگر ہتھیار رکھنا ضروری ہے اور وہ بھی جدید سے جدید انداز کا۔ یہاں جس کے پاس ہتھیار نہ ہو لوگ اُسے غریب بلکہ قابلِ تحقیر سمجھتے ہیں جب کہ پٹھانوں کی خودداری کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ اُن کی خودداری کو سمجھنے کے لیے یہ واقعہ ہی کافی ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک پٹھان کے گھر میں جب فاقوں کی نوبت آ گئی تو چاروناچار وہ گھر سے مانگنے کے لیے نکل پڑا۔ ایک گھر کا دروازہ بجا کر اُس نے گداگروں کے مانند صدا لگائی۔ "اللہ کے نام پر بابا.... صرف

دس روپے کا سوال ہے.... میرے بچے دو دنوں سے بھوکے ہیں۔"

چند لمحوں کے بعد ایک بچی دس روپے کا نوٹ لیے باہر نکلی اور پٹھان کی طرف نوٹ بڑھاتے ہوئے بولی۔"

یہ لیں بابا۔"

پٹھان نے بلا تردد بچی کے ہاتھ سے دس روپے کا نوٹ جھپٹا اور تیوری چڑھا کر بولا۔"بابا کی بجائے" خان صاحب" بولتے ہوئے کیا زبان جلتی تھی؟"

بچی نے جھٹ سے کہا۔"مانگنے والے کو بابا نہیں تو کیا پاپا بولوں گی؟"

پٹھان نے نوٹ بچی کے قدموں میں پھینکا اور خالی ہاتھ گھر لوٹ آیا۔

پٹھانوں کی ضد مشہور ہے۔ یہ اپنے دشمن کا قبر تک پیچھا کرتے ہیں۔ مرتے ہیں یا پھر مار ڈالتے ہیں لیکن مجھ میں پٹھانوں والی کوئی ایک خصلت بھی نہیں تھی۔ مجھے کبھی کسی پر غصہ نہیں آتا تھا۔ میں اکثر گالی کا جواب بھی مسکراہٹ سے دیا کرتا تھا۔ میں نے ایم اے تک تعلیم حاصل کی تھی اور شاید یہ تعلیم ہی کا اثر تھا کہ میں پٹھان ہوتے ہوئے بھی پورے علاقے میں بزدل مشہور تھا۔ مہردل خان میرا چھوٹا بھائی تھا جب کہ اُس سے چھوٹی ہماری اکلوتی اور لاڈلی بہن زرغونہ تھی۔ مہردل خان اپنے اکھڑ پن کی وجہ سے بابا جان کو بے حد پیارا تھا۔ بابا جان اُسے اپنا صحیح جانشین سمجھتے تھے اور مجھے بھی قبائلی سردار بننے کا کوئی خاص شوق نہیں تھا۔ سو میں خوش تھا کہ بابا جان کی نظرِ انتخاب میرے بجائے مہردل خان پر پڑی ہے۔ میں سرداری کے جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ یہ میرے بس سے باہر تھی۔ ایک قبائلی سردار کو جس رعب ودبدبہ کی ضرورت ہوتی ہے میں اُس سے عاری تھا۔ نرم خوئی میری سرشت میں شامل تھی۔ میں کسی مجرم کے ساتھ بھی سختی نہیں کر سکتا تھا۔

ایسی صورت حال میں اگر بابا جان کی نظرِ انتخاب مہردل خان پر نہ پڑتی تو پھر کس پر پڑتی؟ میں بابا جان کو حق بجانب سمجھتا تھا، اس لیے مجھے اُن سے کوئی گلہ نہیں تھا۔ مجھے اگر اُن سے کوئی گلہ تھا تو صرف اتنا کہ وہ مجھے اب تک نہیں سمجھے تھے۔ میں ہنگاموں اور شور شرابے سے دُور بھاگتا تھا جب کہ وہ مجھے زبردستی ایسی جگہوں پر لے جاتے تھے۔ مجھے ہتھیاروں سے نفرت تھی جب کہ وہ میرے ہاتھ میں ہتھیار تھمانا چاہتے تھے۔ میں روایتی لڑائی جھگڑوں کو سخت ناپسند کرتا تھا جب کہ وہ مجھے مہردل خان کی طرح ہتھ چھٹ بنانے پر تلے رہتے تھے۔ میرے بچپن

سے لے کر آج تک بابا جان مجھے نہیں سمجھ سکے تھے اور نہ آئندہ ایسے کوئی آثار نظر آتے تھے۔

بابا جان کے باہر جانے کے بعد میں نے وال کلاک پر نظر ڈالی تو صبح کے نو بجنے والے تھے۔ چونکہ وہ سردیوں کا موسم تھا اس لیے دھوپ ابھی تک پوری طرح نہیں پھیلی تھی۔ ویسے بھی ہم جس علاقے میں رہتے تھے وہ اُونچے اُونچے پہاڑوں میں گھرا ہوا تھا۔ وہاں سورج کافی دیر سے طلوع ہوا کرتا تھا۔ جلدی جلدی تیار ہو کر میں کمرے سے باہر نکلا تو مور جان میرے لیے ناشتا لگا چکی تھی۔ جب کہ بابا جان اور مہر دل خان ناشتے سے فارغ ہو کر گپیں ہانک رہے تھے۔

"شیر دل خان! تمہارے پاس ناشتا کرنے کے لیے صرف پانچ منٹ ہیں۔" میں ابھی ناشتا کرنے کے لیے بیٹھا ہی تھا کہ بابا جان نے حکم سنایا۔

"پانچ منٹ میں ناشتا کیا نہیں جاتا بلکہ "ہڑپا" جاتا ہے۔" میں نے احتجاج کیا۔

"تو پھر ہڑپ کرو۔"

"میں بھینس نہیں ہوں۔"

"بھینس نہیں ہو تو پھر وقت پہ اُٹھنا تھا، یہ کوئی ناشتا کرنے کا وقت ہے۔"

"خان جی! بچے کو ناشتا تو آرام سے کرنے دیں۔" مور جان نے مداخلت کی۔

"تم چپ رہو شاہ بی بی۔" بابا جان نے بگڑ کر کہا۔ "یہ باپ بیٹے کا معاملہ ہے، بیچ میں مت بولو۔"

"خان جی! آپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ میں اِس کی ماں ہوں۔" مور جان نے احتجاج کیا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم اِس گیدڑ کی ماں ہو۔"

"اور آپ اِس گیدڑ کے باپ ہیں۔" مور جان نے ترکی بہ ترکی جواب دیا اور پھر حسب معمول بابا جان اور مور جان کے درمیان لفظوں کی جنگ چھڑ گئی۔ چنانچہ مجھے آرام سے ناشتا کرنے کا وقت مل گیا۔

☆......☆......☆

جیپ لہراتی بل کھاتی تنگ پہاڑی سڑک پر رواں دواں تھی۔ یہ فور وہیل ڈرائیو ایک طاقت ور جیپ تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ مہر دل خان نے سنبھال رکھی تھی، جب کہ میں بابا جان کے ساتھ عقبی نشست پر بیٹھا ہوا

تھا۔ ہماری منزل چچا بہرام گل کا گاؤں تھا، جو وہاں سے لگ بھگ بیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔ چاچا بہرام گل کے اکلوتے بیٹے منور گل کی شادی تھی۔ اِس شادی میں ہماری شمولیت بہت ضروری بلکہ ناگزیر تھی، کیوں کہ چاچا بہرام گل باباجان کے بچپن کے دوست تھے۔ اُن کی یہ دوستی برسوں پر محیط تھی۔ چاچا بہرام گل باباجان کو اپنا بڑا بھائی سمجھتے تھے اور باباجان کا بے حد احترام بھی کرتے تھے۔ باباجان بھی اُن پر جان چھڑکتے تھے۔ دونوں کی دوستی بے مثال تھی اور جاننے والے اُن کی دوستی پر رشک کیا کرتے تھے۔

''باباجان!'' میں نے جیپ میں چھائی خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ ''میں نشانہ بازی کے مقابلے میں حصہ نہیں لوں گا۔''

''تیرا تو باپ بھی حصہ لے گا۔'' باباجان نے جواب دیا۔

''شوق سے لے، مجھے کیا؟''

''گیدڑ خان! میں نے بحاورتاً یہ بات کہی ہے۔'' باباجان غصے سے بولے۔ ''حصہ تو تم نے ہی لینا ہے۔''

''میں بندوق کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔'' میں نے اٹل لہجے میں کہا۔ ''آپ بھلے مجھے جان سے ہی کیوں نہ مار ڈالیں۔''

''جان سے مارنے کی نوبت آئی تو یہ بھی کر گزروں گا۔''

''تو ابھی مار ڈالیں ناں.... اتنی دُور لے جانے کی کیا ضرورت ہے؟'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''میں آپ کو روزِ حشر اپنا خون معاف کردوں گا۔''

''بھائی جان! کیا آپ چپ نہیں بیٹھ سکتے۔'' مہردل خان نے مداخلت کی۔ ''کیوں باباجان کو غصہ دلاتے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''باباجان کیوں مجھے جہالت کے رستے پر زبردستی ڈالنا چاہتے ہیں؟ جب کہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مجھے ہتھیاروں سے نفرت ہے۔ میں بندوق کو چھونا بھی نہیں چاہتا، نشانہ بازی کے مقابلے میں حصہ لینا تو دُور کی بات ہے۔''

''تجھے اَن دیکھی محبوبہ کے خواب دیکھنے سے فرصت ملے تو تم کچھ اور سوچو ناں؟'' باباجان نے مجھے پر

چوٹ کی۔" تجھے پڑھا کر میں پچھتا رہا ہوں۔ کاش اُس وقت میں نے بہرام گل بھائی کی بات مان لی ہوتی تو آج یہ دن دیکھنا نہ پڑتے۔"

"آپ دنیا کے پہلے باپ ہیں جو اولاد کو پڑھا کر پچھتا رہے ہیں۔"

"میں تو اِس بات پر بھی پچھتا رہا ہوں کہ تم جیسے بزدل انسان نے میرے گھر میں جنم لیا ہے۔" بابا جان نے طیش کے عالم میں جواب دیا۔

"تو نکال دیں مجھے اپنے گھر سے، خارج کر دیں اپنی ولدیت سے..... کس نے منع کیا ہے آپ کو؟"

"ضرور نکال دیتا اگر تیری مور جان کا خیال نہ ہوتا۔"

"بابا جان! خدا کے لیے.... اب جانے دیں۔" مہر دل خان نے دوبارہ مداخلت کی۔ "بھائی کی جگہ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں... آپ بس اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ نشانہ بازی کے مقابلے کے لیے میں جو ہوں، میں آپ کا سر نہیں جھکنے دوں گا۔"

بابا جان بولے۔ "کاش میں نے اس گدھے کا نام شیر دل خان نہ رکھا ہوتا۔ یہ نام تمہارے لیے موزوں تھا مہر دل خان۔"

"بالکل موزوں تھا۔" میں نے طنز کیا۔ "یہ واقعی اس قابل ہے کہ اسے مہر دل کی بجائے کوئی ایسا نام دیا جاتا جو اِس کے لیے اسم بہ مسمّٰی ہوتا۔ مہر دل کا مطلب تو مہربان دل یا رحم دل ہوتا ہے۔"

"بس باتیں کرنا آتا ہے... عورتوں کی طرح۔" بابا جان نے میرے طنز پر ریمارکس پاس کیے۔

"یہ فن بھی تو کسی کسی کو آتا ہے۔"

"میں لعنت بھیجتا ہوں ایسے فن پر۔" بابا جان نے جل کر کہا۔ "کاش تُو پیدا نہ ہوا ہوتا۔"

"اپنی مرضی سے کوئی بھی پیدا نہیں ہوتا۔"

"خدا کے لیے لالہ! چپ ہو جائیں۔" مہر دل خان زچ ہو کر بولا۔ "اور بابا جان آپ بھی جانے دیں... اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں یہ نہیں بدلنے والے۔"

بابا جان نہ جانے کیا سوچ کر خاموش ہو گئے، حالانکہ یہ بات اُن کی فطرت کے سراسر خلاف تھی۔ میں بھی

چپ سادھ کر ارد گرد کے نظاروں میں کھو گیا۔ تقریباً ساڑھے دس بجے ہم چاچا بہرام گل کے ہاں پہنچ گئے۔ اُن کا حجرہ (اوطاق یا بیٹھک) لگ بھگ پانچ کنال پر محیط تھا۔ حجرے میں بے شمار لوگ موجود تھے جو لان میں کرسیوں پر براجمان تھے اور چائے کے ساتھ ساتھ دیگر لوازمات سے محظوظ ہو رہے تھے۔ چاچا بہرام گل کے نوکر مہمانوں کی سیوا میں مصروف تھے۔ ہم پر نظر پڑتے ہی چاچا بہرام گل دوڑ کر آگے بڑھے اور والہانہ انداز میں بابا جان سے لپٹ گئے۔ اُنھوں نے پٹھانوں کے روایتی انداز میں بابا جان سے معانقہ کیا اور پھر مجھ سے اور مہر دل خان سے بھی بڑے خلوص اور محبت کے ساتھ باری باری بغل گیر ہوئے۔ اس کے بعد وہ بابا جان سے بولے۔ ”بھائی جان! میں صبح سے آپ کی راہ دیکھ رہا تھا آپ بہت دیر سے پہنچے ہیں۔ خیر تو تھی؟“

”تمہارے اس نالائق بھتیجے کی وجہ سے دیر ہوئی ہے۔“ بابا جان نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ آنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ بڑی مشکل سے اسے راضی کیا ہے۔“

کیوں بھئی؟“ چاچا بہرام گل میری طرف متوجہ ہوئے۔ ”کیا ہم سے کوئی ناراضی ہے؟“

”نہیں چاچا۔“ میں نے قدرے نادم انداز میں کہا۔ ”میں بھلا آپ سے کیسے ناراض ہو سکتا ہوں؟“

”تو پھر نہ آنے کی کیا وجہ تھی؟“

”وہ چاچا.... کیا ہے کہ میں ذرا ہنگاموں سے دُور رہنا پسند کرتا ہوں، دراصل مجھے افراتفری اور شور شرابے سے گھبراہٹ ہوتی ہے۔“

”شیر دل خان! مرد بنو مرد۔“ چاچا نے کہا۔ ”تم پٹھان ہو، تمہیں اس طرح کی باتیں زیب نہیں دیتیں۔ ایک پٹھان کی زندگی میں ہنگامے نہ ہوں، یہ بھی بھلا کوئی بات ہے؟.... اور تم تو ابھی نوجوان ہو اس عمر میں تو انسان موت کا سامنا کرتے ہوئے بھی نہیں گھبراتا..... تمہارے بابا جان اور میں نے نہایت ہنگامہ خیز زندگی گزاری ہے۔ بارہا ہم نے موت کی نگاہوں میں نگاہیں ڈالی ہیں اور ہر بار موت کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ میں تجھے اپنی نوجوانی کا کون کون سا قصہ سناؤں؟ اتنے زیادہ واقعات ہیں کہ سناتے سناتے دن سے رات اور رات سے صبح ہو جائے گی مگر واقعات ختم نہیں ہوں گے۔“

”ارے یار! یہ تم کن چکروں میں پڑ گئے؟“ بابا جان نے مداخلت کی۔ ”بھینس کے سامنے بین بجانے

سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔"

"بھائی جان آپ زیادتی کر رہے ہیں میرے بھتیجے سے۔" چاچا بہرام گل شکایتی انداز میں بولے۔" یہ چھ فٹ کا کڑیل نوجوان ہے۔ ماشاءاللہ شکل وصورت میں بھی لاکھوں میں ایک ہے اور سونے پہ سہاگا یہ کہ سولہ جماعتیں بھی پاس ہے۔ پھر بھی آپ اسے بھینس کہہ رہے ہیں؟"

"ہاں کہہ رہا ہوں.... کیوں کہ یہ بھی بھینس کی طرح موٹی عقل کا ہے۔ اسے لاکھ سمجھاؤ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔" باباجان نے دل کی بھڑاس نکالی۔

"اچھا اب تشریف تو رکھو ناں.... اس موضوع پر بعد میں بات کرلیں گے۔" چاچا بہرام گل نے موضوع ہی بدل دیا۔" آپ اتنی دُور سے آئے ہیں تھکے ہوئے ہوں گے، تھوڑی دیر آرام وغیرہ کرلیں پھر تو شادی کا ہنگامہ شروع ہوجائے گا۔"

چونکہ موسم سرما کا تھا، اس لیے ہم بھی وہیں لان میں دوسرے مہمانوں سے قدرے الگ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ہمارے بیٹھتے ہی چاچا بہرام گل کے نوکر دوڑ کر پہنچ گئے، اُن کے ہاتھوں میں کھانے پینے کے لوازمات تھے۔ ان لوازمات میں سرفہرست ہم قبائلیوں کا مشہور ومعروف قہوہ، خشک میوہ جات، اعلیٰ قسم کی مٹھائیاں اور چائے پسند کرنے والے مہمانوں کے لیے چائے کا انتظام کیا گیا تھا۔ باباجان اور مہردل خان نے قہوہ کے ساتھ خشک میوہ پسند کیا تھا جب کہ میں نے چائے اور مٹھائی کو فوقیت دی تھی۔ قہوے اور خشک میوے کو میں کم ہی پسند کیا کرتا تھا۔ دراصل دورانِ تعلیم ہی مجھے چائے پینے کا شوق پڑا تھا۔ پہلے کالج اور پھر یونیورسٹی کے دوستوں کے ساتھ چائے پینے کا کچھ ایسا چسکا پڑا کہ میں اپنے روایتی قہوے کو بھول گیا۔ میں آپ کو اپنے روایتی قہوے کے متعلق بتاتا چلوں۔ یہ قہوہ کالی پتی کو پانی میں ابال کر تیار کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ یہ کڑوا ہوتا ہے اس لیے اس کے ساتھ گڑ استعمال کیا جاتا ہے۔ کپ سے ایک گھونٹ قہوے کا لیا اور ٹرے میں سے گڑ اُٹھا کر تھوڑا سا دانتوں سے کھرچ لیا، کپ کے ختم ہونے تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ گھونٹ گھونٹ قہوہ پیتے جاؤ اور گڑ کھرچتے جاؤ۔ خاصہ ایڈونچرس مشروب ہے اور غالباً ہمارے پڑوسی ملک افغانستان نے متعارف کرایا ہے۔ جیسا کہ بعد میں چرس اور رشین کلاشنکوف کو متعارف کرایا گیا، جس نے آج قبائلی علاقے تو رہے ایک طرف پورے ملک میں

فیشن کا رُوپ دھار لیا ہے۔ اب وہ دن ہوا ہوئے جب پنجاب اور سندھ میں دشمنوں پر لاٹھیوں یا پھر کلہاڑیوں سے دھاوا بولا جاتا تھا۔ اُس وقت آتشیں ہتھیار صرف قبائلی علاقوں اور صوبہ سرحد تک محدود تھے مگر اب ہر ایرے غیرے، نتھو خیرے کو دستیاب ہیں۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا مہمانوں کی آمد بڑھتی گئی۔ انہی مہمانوں میں بالکل غیر متوقع طور پر مجھے یونیورسٹی کے زمانے کا ایک دوست مل گیا۔ سو میں نے بابا جان اور مہر دل خان کو وہیں لان میں چھوڑا اور اپنے دوست کے ساتھ وہاں سے کھسک گیا۔ راشد ملک نامی میرا وہ دوست جنوبی پنجاب کا رہنے والا تھا مگر اُن دنوں اُن کی فیملی پشاور میں سیٹل تھی۔ راشد کا والد وہاں ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ میں ایک اعلیٰ عہدے پر تعینات تھا۔ چنانچہ حکومت کی طرف سے انھیں پشاور میں بہترین رہائش گاہ اور دیگر سہولیات میسر تھیں۔

☆......☆......☆

''تم یہاں کیسے بھئی؟'' حجرے سے باہر قدم رکھتے ہی میں نے راشد کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے پوچھا۔ ''چاچا بہرام گل سے کیا کوئی رشتہ داری ہے یا پھر گواچی ہوئی گج کی طرح ایسے ہی بوتھا چک کر آ گئے ہو؟'' کالج اور یونیورسٹی میں چونکہ میرے اکثر دوست اُردو اور پنجابی اسپیکر تھے، اس لیے میں نہ صرف اُردو بلکہ پنجابی بھی روانی کے ساتھ بول لیتا تھا۔

راشد بولا۔ ''رشتہ داری تو کوئی نہیں ہے، بس پاپا کی چاچا بہرام گل کے ساتھ دیرینہ علیک سلیک ہے۔ اُنھوں نے دعوت نامہ تو سب کے لیے بھجوایا ہے مگر پاپا کے کچھ سرکاری کام پینڈنگ پڑے ہوئے تھے، سو وہ خود تو نہیں آسکے تاہم اُنھوں نے مجھے بھیج دیا ہے۔''

''گڈ....'' میں نے خوشی کا اظہار کیا۔ ''یہ تو بہت ہی اچھا ہوا... مجھے تم سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔''

''کیسی باتیں؟'' اُس نے قدرے حیرت سے پوچھا۔ ''کیا کوئی خاص بات ہے؟''

''خاص سے بھی خاص.....چل کہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔''

علاقہ اگرچہ پہاڑی تھا مگر سر سبز و شاداب تھا۔ ہم حجرے سے تو ویسے بھی باہر آ چکے چنانچہ وہاں سے آگے کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ تقریباً دس منٹ کی واکنگ کے بعد ہم ایک مناسب مقام تک پہنچ گئے۔ یہ ایک کشادہ

اور ہموار سطح والی چٹان تھی، یہاں بیٹھ کر ہم بے فکری سے باتیں کر سکتے تھے۔ یہاں کوئی بھی ہمیں ڈسٹرب نہیں کر سکتا تھا۔ یہ چٹان پختہ سڑک سے قدرے ہٹ کر واقع تھی۔ ہم دونوں چٹان پر چڑھ کر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

"ہاں اب بتاؤ....وہ کون سی خاص بات ہے؟" راشد نے بیٹھتے ہی پُر تجسس انداز میں سوال کیا۔

میں نے کہا۔ "پہلے وعدہ کرو کہ تم میرا مذاق نہیں اُڑاؤ گے؟"

"کیوں....میں بھلا کیوں مذاق اُڑاؤں گا؟" اُس کے تجسس پر حیرت غالب آ گئی۔

"کیوں کہ بات ہی کچھ ایسی ہے....نا قابلِ یقین۔"

"تم پٹھانوں کی ہر بات نا قابلِ یقین ہوتی ہے یار....بہر حال تم بات کرو، میں سن رہا ہوں۔"

"تو ٹھیک ہے پھر سنو......یہ تقریباً چھ ماہ پہلے کی بات ہے۔ موسم گرمیوں کا تھا مگر جیسا کہ تم جانتے ہمارے علاقے میں بہت کم گرمی پڑتی ہے اس لیے ہم زیادہ تر اندر کمروں میں ہی سوتے ہیں۔ دوسرا یہاں گرمیوں میں بارشیں بھی خوب ہوتی ہیں چنانچہ........."

"یہ تم اپنی خاص بات کر رہے ہو یا مجھے موسم کا حال بتا رہے ہو؟" اُس نے بگڑ کر میری بات کاٹی۔

"بات کر رہا ہوں یار....تم سنو تو سہی۔"

"او کے...." اُس نے اپنے سرمئی بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ "تمہید باندھنے کی بجائے اصل بات کرو....ابھی شادی کا پروگرام شروع ہو جائے گا۔ یہ نہ ہو کہ تمہاری بات ہی ادھوری رہ جائے۔"

میں نے کہا۔ "تمہید تو باندھنا پڑے گی ورنہ میں اپنی بات تمہیں اچھی طرح نہیں سمجھا سکوں گا۔"

"چل ٹھیک ہے مگر تمہید مختصر ہونی چاہیے۔"

"او کے مختصر ہی ہو گی۔" اتنا کہہ کر میں لحہ بھر کے لیے خاموش ہو گیا۔ میرا ذہن جیسے سوچوں میں مستغرق ہو گیا۔ وہ مناظر جو میں کئی بار دیکھ چکا تھا انھیں راشد کے سامنا دہرانا اتنا آسان نہیں تھا جتنا کہ میں سمجھ رہا تھا۔

"اوئے! کیا سوچ رہے ہو؟" راشد نے قدرے جھنجلا کر پوچھا۔

"وہی جو تم سے کہنا ہے۔"

"تو کہو ناں؟"

''سمجھ نہیں آتی کہ بات کیسے اور کہاں سے شروع؟''

''لعنت ہے تمہاری سمجھ پر۔'' وہ زچ ہو گیا۔ ''بتانا ہے تو بتاؤ ورنہ میں واپس جا رہا ہوں۔''

''یار ایک تو تم ناراض بہت جلدی ہو جاتے ہو۔'' میں نے شکوہ کیا۔

''میں ناراض نہیں ہوں یار.....تم ٹائم ضائع کر رہے ہو۔''

''اچھا تو پھر سنو۔'' میں نے دوبارہ ہمت باندھی۔ ''منظر دل کو موہ لینے والا تھا۔ چاروں طرف پھل دار درخت تھے جن پر ہمہ قسم کے پھل موجود تھے۔ وہاں پھولوں کی بھی بہتات تھی۔ سورج پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا مگر اُس کی تمازت میں چاند کی روشنی جیسی ٹھنڈک تھی۔ دھیمی دھیمی ہوا چل رہی تھی، جس کی سرسراہٹ میں ایک نغمگی تھی۔ ایسی نغمگی جو سماعتوں میں رس گھول دیتی ہے۔ وہ ایک نہایت ہی خوب صورت وادی تھی۔ اتنی حسین وجمیل کہ لگتا تھا جیسے جنت کا کوئی ٹکڑا اُٹھا کر زمین پر رکھ دیا گیا ہو۔ وہاں ایک شفاف پانی کا چشمہ رواں تھا۔ اُس چشمے کا پانی اِس قدر صاف وشفاف تھا کہ اُس کی تہہ میں سنہری ریت اور رنگین پتھروں کے ٹکڑے تک چمکتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ خوش آواز پرندے پھل دار درختوں پر چہک رہے تھے جب کہ قسم قسم کی رنگین پروں والی تتلیاں پھولوں پر منڈلا رہی تھیں۔ اِس قدر حسین وجمیل پرندے اور رنگین تتلیاں وہ زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔''

''کون دیکھ رہا تھا؟'' راشد کا سوال میری سماعتوں سے ٹکرایا۔

''پہلے پوری بات سن لو، سوال بعد میں کرنا...... ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ وہ سارا منظر اُس کے لیے نیا تھا بلکہ نیا کیا اُس کے تصور سے بھی ماورا تھا۔ پھل دار درختوں پر ایسے ایسے پھل موجود تھے جو اس سے قبل اُس کی آنکھوں نے نہیں دیکھے تھے۔ اُسے ان پھلوں کے نام تک نہیں آتے تھے۔ اسی طرح وہ رنگین پروں والی نرم ونازک تتلیاں بھی اُس کی نگاہوں کے لیے اجنبی تھیں اور وہ پھل دار درختوں پر اُڑتے پھدکتے پرندوں سے بھی ناواقف تھا۔ وہ سحرزدہ سا چشمے کے کنارے کھڑا ہوتا ہے کہ ایسے ہی وقت چشمے کے دوسرے کنارے پر موجود پھول دار پودوں کی اوٹ سے ایک نہایت ہی خوب رو اور پری پیکر لڑکی نمودار ہوتی ہے، جو سرتا پا سفید ریشمی لباس میں ملبوس ہوتی ہے۔ وہ کچھ اس انداز سے چل رہی ہوتی ہے جیسے ہوا میں تیر رہی ہو۔

بظاہر وہ پُر وقار انداز میں قدم اُٹھاتی ہے مگر اُس کے پاؤں زمین کو چھوتے ہوئے محسوس نہیں ہوتے۔ وہ جو پہلے ہی فطرت کے مناظر دیکھ کر سحر زدہ سا ہوتا ہے، یہ منظر دیکھ کر پتھر کا بت بن کر رہ جاتا ہے۔ لڑکی چشمے کے کنارے عین اُس کے سامنے پہنچ کر رک جاتی ہے، تب وہ جیسے ہوش میں آکر غور سے اُس پری پیکر کو دیکھتا ہے۔ لڑکی کے ملیح چہرے پر رنج و ملال کے آثار ہوتے ہیں۔ جیسے وہ بہت تکلیف میں ہو۔ اُس کی بڑی بڑی سیاہ غزالی آنکھوں سے بے بسی جھلک رہی ہوتی ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اُس کی آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگتے ہیں۔ لڑکی کے آنسو دیکھ کر اُس کا دل کٹ کر رہ جاتا ہے۔ وہ اُسے تسلی دینے کے لیے لب کشائی کرتا ہے مگر اُس کی آواز جیسے حلق میں پھنس کر رہ جاتی ہے۔ وہ پوری توانائی صرف کرنے کے باوجود بول نہیں پاتا، تب اُس پر ایک بے بسی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اُس کے اندر ایک طوفان برپا ہوتا ہے لیکن لب گویائی سے محروم ہوتے ہیں۔" بات کرتے کرتے میں ایک دم خاموش ہو گیا۔

"پھر کیا ہوا؟" جوں ہی میری بات ختم ہوئی راشد نے بے تابی سے پوچھا۔

"مجھے خود بھی نہیں معلوم۔" میں نے اُداسی کے عالم میں جواب دیا۔

"کیوں نہیں معلوم؟"

"اس لیے کہ اِس کے بعد خواب دیکھنے والے کی آنکھ کھل جاتی ہے۔"

"یہ خواب کس نے دیکھا ہے؟" اُس نے سوال کیا۔

میں نے دیکھا ہے.....اور کئی بار دیکھا ہے۔"

"تیرا معدہ خراب ہے، کسی اسپیشلسٹ کو دکھاؤ۔" اُس نے سنجیدگی سے مشورہ دیا۔

"یہ مذاق نہیں ہے دوست! میں گزشتہ چھ ماہ سے یہ خواب دیکھتا آرہا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ یہ خواب جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ وہ لڑکی کہیں نہ کہیں ضرور موجود ہے اور میں اُسے تلاش کروں گا۔"

"کہاں تلاش کرو گے؟" اُس کے انداز میں طنز تھا۔

"اپنے علاقے میں۔"

"تمہارے علاقے میں تو کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جو تم نے خواب میں دیکھی ہے۔"

''ہوگی ضرور ہوگی۔'' میں نے پُر زور انداز میں کہا۔ ''ہمارے علاقے میں ایسی خوب صورت وادیاں ہیں کہ اُنھیں دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے۔''

''او کے۔'' اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''لیکن مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آتی کہ تم اُس خواب والی لڑکی کو کیوں تلاش کرنا چاہتے ہو؟''

''مجھے اُس سے پیار ہوگیا ہے.... اور مجھے لگتا ہے جیسے اُسے میری مدد کی ضرورت ہے۔''

''بات سمجھ میں آرہی ہے۔'' اُس نے طنزیہ انداز میں تائید کی۔ ''تم شہزادہ گل بکاؤلی ہو اور وہ ہوگی شہزادی شہر بانو.... اور یہ تو طے ہے کہ وہ لازماً کسی ظالم جادوگر کی قید میں ہوگی۔ تم اُسے جادوگر کی قید سے چھڑاؤ گے اور پھر اُسے اُس کے ملک لے جاؤ گے جہاں ہمیشہ کی طرح شہزادی کا والد بزرگوار یعنی کہ بادشاہ سلامت بستر مرگ پہ پڑا زندگی کی آخری سانس گن رہا ہوگا.... بلکہ شاید تمہارے جانے تک گن چکا ہوگا یا اگر بچے بھی ہوں گے تو محض چند سانس.... چونکہ شہزادی بادشاہ کی اکلوتی اولاد ہوگی اور عالمِ نزع میں یقیناً بادشاہ کی عقل بھی کام نہیں کر رہی ہوگی، تو ایسے میں وہ یقیناً شہزادی کا ہاتھ ایک احمق پٹھان کے ہاتھ میں دینے کے لیے تیار ہو جائے گا..... اِس کے بعد بادشاہ سلامت خوشی خوشی اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دے گا جب کہ تم اور شہزادی شہر بانو ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگو گے۔''

میں نے کہا۔ ''تم دوست ہو کہ دشمن؟ میں نے مشورہ مانگنے کے لیے تمہیں اپنے دل کی بات بتائی ہے۔ تم تو اُلٹا میرا مذاق اُڑا رہے ہو..... یہ کیسی دوستی ہے؟''

''میں نہیں..... تم خود اپنا مذاق اُڑا رہے ہو، ایسی بات کسی سے بھی کہو گے تو وہ تم پر ہنسے گا..... حماقت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔''

''مطلب تم بھی بابا جان کی طرح مجھے احمق سمجھتے ہو؟''

''تو اور کیا سمجھوں؟'' اُس نے جھنجھلا کر پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''مجھے مشورہ دو، میں کیا کروں؟''

''تم کوئی کام کرو، سیانے کہتے ہیں کہ خالی دماغ شیطان کا کارخانہ ہوتا ہے.... تجارت کرو، کوئی

کاروبار کرو.... کہیں جاب وغیرہ کرلو.... میں یقین سے کہتا ہوں کہ پھر تم ایسے خواب نہیں دیکھو گے۔" اُس نے ناصحانہ انداز میں جواب دیا۔

"لیکن مجھے اپنے خوابوں کی صداقت پر پورا یقین ہے۔"

"یقین ہے تو پھر مشورہ کس لیے مانگ رہے ہو؟.... اُسے تلاش کرو... اگر وہ واقعی کہیں ہوئی تو تمھیں مل جائے گی۔"

میں نے کہا۔"میں تو تلاش کرنا چاہتا ہوں لیکن بابا جان میری بات نہیں مانتے، اُنھیں کون منائے گا؟"

"ظاہر ہے تم ہی مناؤ گے اور کون منائے گا؟"

"میں تو منا منا کر تھک چکا ہوں، البتہ تم میری سفارش کر دو تو........"

"مجھے پاگل کتے نے تو نہیں کاٹا۔" اُس نے قطع کلامی کی۔"تمھارے بابا ایک قبائلی پٹھان ہیں اور وہ بھی چٹے اَن پڑھ.... اُن کے منہ لگنا اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے جب کہ میرا ابھی مرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

"پلیز راشد پلیز.... میری خاطر۔" میں نے التجائیہ انداز میں کہا۔"صرف ایک بار بابا جان سے بات کر کے تو دیکھو.... ہو سکتا ہے وہ تمھاری بات مان کر مجھے اجازت دے دیں۔"

"نہیں۔" اُس نے زور سے انکار میں سر ہلایا۔"آدمی کی عزت اُس کے اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ مجھے بے عزت ہونے کا کوئی شوق نہیں ہے۔"

"یار تم ہمت تو کرو..... پٹھان اپنے مہمان کی کوئی بات نہیں ٹالتے۔"

"میں چاچا بہرام گل کا مہمان ہوں نہ کہ تمھارے بابا جان کا۔ مجھے معاف کر دو بھائی! میں خود اپنے ہاتھوں سے پھانسی کا پھندا اپنے گلے میں نہیں ڈال سکتا۔ تم چاچا بہرام گل سے بات کیوں نہیں کرتے؟"

میں نے کہا۔"وہ دونوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ چاچا بہرام گل میرے بجائے بابا جان کا ساتھ دیں گے۔"

"سوری میں تمھارے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔" اُس نے حتمی انداز میں جواب دیا۔

''ملک ہو کر بزدلوں جیسی باتیں کیوں کرتے ہو؟'' میں نے اُسے جوش دلانے کی کوشش کی۔ ''بابا جان تجھے کھا تو نہیں جائیں گے.... چوہے کہیں کے۔''

''مجھے چوہا ہی رہنے دیں بھئی۔'' اُس نے دونوں ہاتھ جوڑے۔ ''یہ دیکھ اور مجھے معاف کر دے۔''

پھر اس سے قبل کہ میں اُس سے کچھ کہتا معا حجرے کی جانب سے شور اُٹھا اور میرا دل بے اختیار ڈھڑکنے لگا۔ وہ بلاشبہ لڑنے جھگڑنے کی آوازیں تھیں، گالیاں اور چیخیں واضح سنائی دے رہی تھیں۔ اِن آوازوں میں بابا جان اور مہر دل خان کی آوازیں نمایاں تھیں۔ مجھ پر لرزے کی سی کیفیت طاری ہو گئی جب کہ راشد پشتو زبان سے ناواقف ہونے کی بناء پر مطمئن تھا تاہم وہ میری طرف جواب طلب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

''یہ لوگ اس قدر شور کیوں کر رہے ہیں؟'' راشد کی نگاہوں کا سوال بالآخر اُس کی زبان پر آ گیا۔

''شا.....شا.....شاید.....لل.....لل.....لڑائی.....ہو.....رہی.....ہے۔'' میں نے بدقت تمام خوف ودہشت سے اٹکتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

اُس نے بے یقینی کی کیفیت میں میری طرف دیکھا اور پھر ہنس کر بولا۔ ''اوہ.....تو تم مجھے ڈرا رہے ہو؟..... بہت غلط بات ہے یار...میں یہاں مہمان ہوں، کچھ تو خیال کرو.....لوگ تو پٹھانوں کی مہمان نوازی کی مثالیں دیتے ہیں، تم کیسے پٹھان ہو کہ اپنے ہی مہمان کو خوف زدہ کرنے کی کوشش کر رہے ہو؟''

''مم.....میں.....تمہیں.....خوف.....خوف زدہ.....نن.....نہیں کر رہا.....تم.....مم.....مجھے غلط.....'' شدتِ خوف سے میں بات ہی مکمل نہیں کر پا رہا تھا۔

وہ بولا۔ ''بس رہنے دے یار! یہ اداکاری تمہارے بس کا روگ نہیں ہے....چل دیکھتے ہیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے؟''

''مم.....میں نہیں آ سکتا.......تم جاؤ.....'' میں نے زور سے انکار میں سر ہلایا۔

''مم.....میں.....یہیں ٹھیک ہوں۔''

''بکواس مت کرو۔'' وہ ایک دم بگڑ گیا۔ ''کیا مجھے بزدل سمجھتے ہو؟''

''نن.....نہیں.....یہ.....یہ بات.....نہیں ہے۔''

"تو پھر کیا بات ہے، تم آتے کیوں نہیں؟" اُس نے بدستور بگڑے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"مم.....میری.....طبیعت.....ٹھیک نہیں ہے۔" میں نے بہانہ بنایا۔ "تم.....جاؤ.....مم..... میں بعد میں.....آجاؤں گا۔"

اُس نے پہلی بار غور سے میری طرف دیکھا۔ بے شک مجھے اپنا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر میں جانتا تھا کہ میرے چہرے پر یقیناً ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔ میں سرتاپا کانپ رہا تھا۔ دل میرے پہلو میں پارے کی طرح اُچھل رہا تھا۔ میری یہ کیفیت اُس سے چھپی نہ رہ سکی۔ چند لمحے وہ میری طرف کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا پھر نرم لہجے میں بولا۔ "سوری یار! تمہاری حالت تو سچ مچ خراب لگ رہی ہے۔ تم کہیں بلڈ پریشر کے مریض تو نہیں ہو.....کبھی بی پی چیک کرایا ہے؟"

میرے بہانے کو اُس نے خود ہی ایک جواز فراہم کر دیا تھا، سو میں نے سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں.....چیک تو کبھی نہیں کرایا.....لیکن اب کرانا پڑے گا۔"

وہ بولا۔ "یہ اتنا بڑا گاؤں ہے یہاں کوئی ڈاکٹر تو ضرور ہوگا؟"

"شاید۔"

"تو آؤ پھر پتا کرتے ہیں۔"

"مم.....میں چل نہیں سکتا۔" میں نے کمزوری آواز میں جواب دیا۔

اُسے اچانک ہی خطرے کا احساس ہوا تو وہ عجلت آمیز انداز میں بولا۔ "تم حوصلہ مت ہارنا.....میں کچھ کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ یہاں ڈاکٹر نہ بھی ہوا تو کوئی ڈسپنسر وغیرہ ضرور ہوگا.....ڈونٹ وری میں یوں گیا اور یوں آیا۔"

مجھے تسلی دینے کے بعد وہ حجرے کی طرف بھاگا، جب کہ میں وہیں بیٹھا رہ گیا۔ ایسی صورت حال مجھے زندگی میں پہلی بار پیش آ رہی تھی۔ میں اس سے قبل اپنی اس کمزوری سے آگاہ نہیں تھا۔ میں امن پسند تو بقول بابا جان کے بزدلی کی حد تک تھا مگر اس قدر ڈرپوک نکلوں گا، یہ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ فی الحال تو میری یہ حالت صرف میرے دوست راشد نے ہی دیکھی تھی، جس کے سامنے میرا بھرم رہ گیا تھا لیکن اس کے بعد کبھی نہ کبھی

تو میری یہ کمزوری دنیا والوں کے سامنے آنا ہی تھی۔ تب پھر کیا ہوگا؟ یہ سوچ کر میری حالت مزید بگڑ گئی، مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میرا دم نکلنے والا ہو۔ میرا دل لمحہ بہ لمحہ ڈوبتا جا رہا تھا کہ ایسے ہی وقت حجرے کی جانب سے فائرنگ کی آواز آنے لگی۔ میری نگاہوں کے سامنے ایک دم اندھیرے کی چادر تن گئی اور دل کی دھڑکن جیسے رک سی گئی۔ اس کے بعد میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا، میں شاید مرنے والا تھا۔

☆......☆......☆

جب دوبارہ میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ایک صاف ستھرے بستر پر پایا۔ یہ چاچا بہرام گل کے حجرے ہی کا ایک کمرا تھا۔ میرے اردگرد بابا جان، مہر دل خان، چاچا بہرام گل اور راشد کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی موجود تھے۔ بابا جان اور مہر دل خان بہت پریشان لگ رہے تھے تاہم میرے ہوش میں آنے کے بعد اُن کی پریشانی قدرے کم ہو چکی تھی البتہ ایک نامعلوم قسم کی بے چینی اُن کے چہروں پر بدستور نظر آ رہی تھی۔

"شیر دل خان! تمہیں کیا ہو گیا تھا؟" بابا جان نے میرے ہوش میں آتے ہی سوال کیا۔ "تم کیوں بے ہوش ہو گئے تھے؟"

"پتا نہیں بابا جان! بس اچانک ہی طبیعت بگڑ گئی تھی۔" میں نے نحیف سی آواز میں جواب دیا۔

"کیوں نہیں پتا؟" اُنھوں نے گھور کر پوچھا۔

"بھائی جان! ڈاکٹر کو تو آنے دیں.... یہ کیا تفتیش شروع کر دی ہے؟" چاچا بہرام گل نے مداخلت کی۔

"مجھے ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہے۔" میں اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔"

"اچھی بات ہے لیکن چیک کرانے میں کیا حرج ہے؟" چاچا بہرام گل نے کہا۔ "ڈاکٹر بس آتا ہی ہوگا۔"

"چاچا! جب مجھے کچھ ہوا ہی نہیں تو پھر ڈاکٹر کی کیا ضرورت ہے؟ آپ نے........."

"چپ چاپ بیٹھے رہو۔" بابا نے بگڑ کر قطع کلامی کی۔ "پہلے ہی میرا دماغ کھول رہا ہے.... بھیجے میں گولی اُتار دوں گا۔"

"انکل! پلیز....." راشد نے مداخلت کی۔ "آپ دوسروں کا غصہ اس پر کیوں نکال رہے ہیں.... اس میں اس کا کیا قصور ہے؟"

"بچے! تم اِدر میلمہ (مہمان) اے۔ اَم کو یہ بی مالوم اے کہ تم اِس خدائی خوار کا ملگرے (دوست) اے، خو.... اِس کو کچھ سمجاؤ گنا یہ تو امارا کوئی بات بی نہیں مانتا اے۔" بابا نے اسی گلابی اُردو میں جواب دیا، جو ہم پٹھانوں کا طرہء امتیاز ہے۔

"آپ فکر نہ کریں انکل! میں اِسے ضرور سمجھاؤں گا مگر آپ سے بھی میری ایک ریکوئسٹ ہے۔"

"اَم سے کیا اے بچے؟"

"گزارش، درخواست ہے انکل۔"

"درخواست اے تو پھر کرو بچے! امارا بس میں ہوا تو ضرور مانے گا۔"

"شکریہ انکل.... بات دراصل یہ ہے کہ آپ لوگ شیر دل خان کا پرابلم نہیں سمجھ رہے۔ یہ ایک........"

"بچے!" بابا نے قطع کلامی کی۔ "اَم سے آسان اُردو میں بات کرو..... اَم بالکل اَن پڑھ اے۔"

"سوری انکل۔" راشد نے قدرے نادم انداز میں جواب دیا۔

"ٹیک اے ٹیک.... اَم سمج گیا اے..... تم ماپی مانگتا اے، ابی آگے بات کرو۔"

وہ بولا۔ "انکل! بات دراصل یہ ہے کہ شیر دل ایک پڑھا لکھا نوجوان ہے، اِس لیے آپ لوگوں کے مقابلے میں بڑی حد تک نرم دل ہے۔ آپ لوگ اس کے احساسات وجذبات کا خیال رکھا کریں۔ یہ اگر لڑائی جھگڑوں سے دُور رہنا چاہتا ہے تو آپ اس کی بات مان لیا کریں۔ یہ فطرتاً آپ لوگوں سے بہت مختلف ہے اور یہ تو شاید آپ کو بخوبی معلوم ہوگا کہ انسان کی فطرت تبدیل نہیں ہو سکتی..... اس معاملے میں ہر انسان بے بس ہوتا ہے۔"

"تمارا بات اَم سمج گیا بچے لیکن اَم بی فطرت سے مجبور اے۔ اَم کو بزدل لوگ بالکل اچا نہیں لگتا۔ ابی تم بولو اَم کیا کرے؟"

"انکل آپ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں۔"

"اَم ایسا بالکل نہیں کر سکتا۔" بابا جان نے انکار میں گردن ہلائی۔ "اَم پٹان لوگ دشمنی کے بغیر نہیں جی سکتا۔ ابی تم نے دیکا اے گنا.... امارا ایک اور دشمنی ہو گیا اے۔ یہ امارا بیٹا اے اس کو دشمنی تو کرنا پڑے گا ورنہ اِدر کا لوگ

اُم کو طعنے دے گا۔"

بابا کی بات سن کر بے اختیار میرا دل دھڑک اُٹھا تاہم میں نے خود کو نارمل رکھتے ہوئے سوال کیا۔"باباجان! آپ کا کس کے ساتھ جھگڑا ہوا ہے؟"

"صمد یار خان سے۔" اُنھوں نے حقارت سے کہا۔"اسمبلی میں پہنچ کر خود کو خُدا سمجھنے لگا ہے مگر میرا نام بھی دلاور خان ہے، میں دیکھ لوں گا اُسے۔"

"کس بات پر جھگڑا ہوا تھا؟"

"سچ سننے کی ہمت نہیں ہے اُس میں۔" بابا نے بتایا۔"میں نے اُسے اُس کی اوقات یاد دلائی تو بھڑک اُٹھا اور مجھے دھمکیاں دینے لگا۔ مہردل نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی تو اُس نے مہردل پر ہاتھ اُٹھا دیا۔ ردِّعمل میں مہردل نے اُس پر گن تان لی، اگر میں بروقت مداخلت نہ کرتا تو آج مہردل نے اُسے ٹھکانے لگا دیا تھا۔ گولی چلی ضرور تھی مگر وہ بچ گیا۔ بعد میں اُس کے محافظوں نے ہوائی فائرنگ شروع کر دی تو بہرام بھائی نے اُنھیں حجرے سے باہر نکال دیا۔"

میں نے کہا۔"یہ اچھا نہیں ہوا باباجان! آپ جانتے ہیں کہ صمد یار خان بہت طاقت ور آدمی ہے۔ اُس کی دشمنی ہمیں بہت مہنگی پڑے گی۔"

"چپ ہو جاؤ بزدل آدمی!" باباجان گرج کر بولے۔"تمھیں اس دشمنی میں حصہ لینے کے لیے کوئی مجبور نہیں کرے گا۔"

بابا کے تیور بتا رہے تھے کہ اب میں نے کچھ بولا تو وہ غصے سے پاگل ہو جائیں گے، لہٰذا میں نے چپ رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔ ویسے بھی بابا کو کسی بات پر قائل کرنا مشکل ہی نہیں تھا بلکہ ناممکن تھا۔ ہتھیلی پر سرسوں جمائی جا سکتی تھی مگر باباجان سے اُس کے مزاج کے خلاف کوئی بات نہیں منوائی جا سکتی تھی۔ وہ ایسے ہی ضدی انسان تھے۔ ہمیشہ اپنی بات کو ہی مقدم سمجھتے تھے۔ اُس کا شمار انسانوں کی اُس قبیل میں ہوتا تھا جو کسی عقلی دلیل کو نہیں مانتے، اپنی ضد کی خاطر اپنی جان تک داؤ پر لگا دیتے ہیں۔

ہم قبائلیوں میں ایسے جھگڑے معمول کی بات ہوتے ہیں چنانچہ سوائے میرے وہاں کوئی شخص بھی پریشان

نہیں تھا۔ حتیٰ کہ میرا چھوٹا بھائی مہردل جس کے غصے اور کم عقلی کی وجہ سے اتنا بڑا اور سنگین وقوعہ ظہور پذیر ہوا تھا، وہ بھی سب کچھ بھول بھال کر شادی کے ہنگاموں میں کھویا ہوا تھا۔ پریشان تھا تو صرف میں.... میرا دماغ برابر اس وقوعے میں اُلجھا ہوا تھا۔ مجھے صدیار خان جیسے بااثر اور منتقم مزاج سردار سے کسی بھلائی کی توقع نہیں تھی۔ بابا جان تو پہلے ہی اُس کی ناپسندیدہ شخصیات میں شامل تھے۔ گزشتہ الیکشن میں بابا جان نے کھل کر اُس کی مخالفت کی تھی مگر وہ ہمیشہ کی طرح الیکشن جیت کر صوبائی اسمبلی میں پہنچ چکا تھا اور تھوڑے ہی دنوں میں اُسے کوئی نہ کوئی وزارت بھی ملنے والی تھی۔ اس کے بعد وہ کیا کچھ کرتا؟ یہ مجھ پر واضح تھا..... اُس سے درگزر کی توقع رکھنا حماقت تھی۔ وہ کسی بھی قیمت پر اتنے سنگین واقعے کو نہیں بھلا سکتا تھا..... اب مجھے ہی کچھ کرنا تھا۔ دشمنی کی یہ آگ جو تھوڑی دیر قبل سلگائی گئی تھی، اِسے شعلہ بننے سے پہلے ہی بجھانا ضروری تھا۔

میرا دماغ تیزی سے اس مسئلے کا کوئی حل سوچنے میں مصروف تھا مگر کوشش کے باوجود مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ حجرے میں موجود سب لوگ شادی کے ہنگامے میں مصروف تھے۔ ڈھول کی تھاپ اور شہنائی کی سُریلی دھن پر علاقائی رقص شروع تھا۔ کچھ ناچ رہے تھے تو کچھ اُن پر نئے کڑکڑاتے ہوئے کرنسی نوٹ نہایت ہی بے دردی کے ساتھ نچھاور کر رہے تھے۔ یہ کرنسی نوٹ سکہ رائج الوقت رقاصوں کے پیروں تلے دھول مٹی میں لتھڑا جا رہا تھا اور یہ سب کچھ تیسری دنیا کے ایک ایسے ملک وقوع پذیر ہو رہا تھا جس کی گلیوں میں بھوک نے کئی دہائیوں سے ڈیرے ڈال رکھے تھے جہاں کے باسی بھوک اور غربت سے تنگ آکر شب و روز خودکشیاں کر رہے تھے۔ اپنے جگر گوشوں پہ برائے فروخت کے اشتہار لگا کر چوراہوں پر کھڑے تھے۔ میں جو پہلے ہی کچھ کم پریشان نہیں تھا، یہ منظر دیکھ کر مزید پریشان اور دُکھی ہو گیا۔ راشد بالکل میرے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا لیکن وہ میری حالت سے بے خبر رقص سے محظوظ ہو رہا تھا۔ غالباً وہ پہلی بار قبائلی پٹھانوں کا رقص لائیو دیکھ رہا تھا۔ اِس سے قبل شاید اُس نے ایسا رقص کسی وڈیو میں یا ٹی وی پر دیکھا ہوگا۔ اُس وقت ہم دونوں کھرے بان سے بُنی گئی ایک کھاٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔

''راشد!'' میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اُسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ ''مجھے تم سے ایک سنجیدہ مسئلے پر بات کرنی ہے۔ چلو باہر چل کر بات کرتے ہیں۔''

''مجھے رقص دیکھنے دو یار۔'' اُس نے قدرے جھنجھلا کر جواب دیا۔

میں نے کہا۔''پلیز راشد میں بہت پریشان ہوں۔ میں تم سے ایک مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیا مصیبت ہے یار۔'' وہ ایک دم بگڑ گیا۔''تمہاری پریشانیاں کب ختم ہوں گی؟''

''مجھے تمہارے مشورے کی ضرورت ہے دوست۔'' میں نے منت کے انداز میں کہا۔''میں اپنے مسائل تم سے شیئر نہیں کروں گا تو اور کس سے کروں گا؟ پلیز صرف چند منٹ کے لیے میری بات سُن لو۔''

''تم بات کرو میں سُن رہا ہوں۔''

''یہاں بہت شور شرابا ہے، تمہیں میری بات کی سمجھ ہی نہیں آئے گی۔ مجھے ایک بہت ہی سنجیدہ مسئلے پر بات کرنی ہے۔''

''رقص ختم ہونے کے بعد کر لینا۔''

''یہ رقص تو اب نصف شب تک جاری رہے گا اور میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ مجھے ایک فوری فیصلہ کرنے کے لیے تمہارے مشورے کی ضرورت ہے۔''

''اُف خدایا! کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔'' وہ زچ ہو کر بولا۔''نہ جانے تمہارے مسئلے کب ختم ہوں گے؟ میں یہاں سیر و تفریح کرنے کے لیے آیا تھا۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ یہاں آ کر مجھے تمہارے لیے مشیر کی خدمات سرانجام دینا پڑیں گی تو شاید یہاں آنے کی غلطی میں بھول کر بھی نہ کرتا۔''

بہرکیف چار و ناچار اُسے وہاں سے اُٹھنا ہی پڑا۔ ذرا دیر کے بعد ہم حجرے کے ایک ایسے کمرے میں پہنچ گئے جہاں ہمارے علاوہ کوئی دوسرا شخص موجود نہیں تھا۔ اگرچہ وہاں تک ڈھول اور شہنائی کی آواز پہنچ رہی تھی مگر یہ آواز بڑی حد تک پست تھی۔ وہاں ہم اطمینان سے بات کر سکتے تھے۔

''ہاں اب بکو میں جناب کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' راشد نے فی الفور سوال کیا۔

''میں صدیار خان سے ملنا چاہتا ہوں۔'' میں نے بلا جھجک جواب دیا۔

''کیا..... کیا..... کیا؟..... تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟'' اُس نے مشکوک نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔''یا پھر تم نے چرس بھرا سگریٹ پی رکھا ہے؟ احمق انسان وہ تمہیں دیکھتے ہی گولی مار دے گا۔ ابھی کچھ

ہی دیر قبل تمہارے بھائی نے اُس کی جان لینے کی کوشش کی ہے اور پھر تمہارے باپ اور بھائی ہی کی وجہ سے اُسے بے عزت ہو کر یہاں سے نکلنا پڑا۔ اُس کے سینے پر تو اِس وقت سانپ بلکہ بلیک کوبرا لوٹ رہے ہوں گے۔ تمہارا اگر واقعی خودکشی کرنے کا پروگرام بن چکا ہے تو پھر کہیں سے زہر ڈھونڈ کر پھانک لو۔ کم سے کم آسان موت تو مرو گے۔"

میں نے کہا۔" وہ مجھے گولی نہیں مار سکتا، دراصل.........."

"کیوں نہیں مار سکتا؟" اُس نے میری بات کاٹی۔" کیا تم اُس کے مامے لگتے ہو یا پھر خود کو سپر مین سمجھتے ہو؟"

"یہ ہم پٹھانوں کی روایات کے خلاف ہے، ہم گھر آئے دشمن پر ہاتھ نہیں اُٹھاتے، مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی روایات سے انحراف نہیں کرے گا۔"

"لیکن مجھے اُس پر قطعی یقین نہیں ہے۔" راشد نے انکار میں سر ہلایا۔" وہ یہاں سے بہت بے عزت ہو کر گیا ہے اور تم اُس کے زخموں پر نمک چھڑکنے جا رہے ہو، وہ تمہاری بات سننے کی بجائے تمہارے ہاتھ پاؤں توڑنا زیادہ پسند کرے گا۔"

"یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے، تم صرف یہ بتاؤ کہ میرے ساتھ چلو گے یا نہیں؟" میں نے فیصلہ کن انداز میں پوچھا۔

"میں یہ رسک نہیں لے سکتا، تم کسی اور کو ساتھ لے جاؤ۔"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ یہاں کوئی بھی میرا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں ہوگا اور دوسری یہ کہ میں خود بھی کسی دوسرے کو ساتھ نہیں لے جانا چاہتا۔"

"کیوں؟" اُس نے حیرت سے استفسار کیا۔

"میں بابا سے مخفی رکھنا چاہتا ہوں یہ بات، کسی اور کو ساتھ لے جانے سے یہ بات چھپی نہیں رہ سکے گی۔"

"مطلب مجھے قربانی کا بکرا بنانا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا۔" تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ تم بلاوجہ ڈر رہے ہو۔"

راشد بڑی دیر تک ٹال مٹول کرتا رہا مگر آخر کار میں نے اُسے ساتھ چلنے پر آمادہ کر ہی لیا۔

☆......☆......☆

دوسرے دن شادی کی تقریب اختتام پذیر ہوئی تو پلان کے مطابق میں راشد کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ یہ کوئی ایسی قابلِ اعتراض بات نہیں تھی مگر بابا جان کو چونکہ مجھ سے خداواسطے کا بیر تھا اس لیے وہ بگڑ گئے۔

''تم کیا کرو گے پشاور جا کر؟'' اُنھوں نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

''یونی ورسٹی کے ساتھیوں سے ملوں گا۔''

''کیا کرو گے اُن سے مل کر؟''

''بابا جان! کیا دوستوں سے ملنا جرم ہے؟ اور پھر میں وہاں کسی اچھے سے ڈاکٹر سے اپنا چیک اپ بھی کرالوں گا۔''

بابا جان بولے۔''تو یوں کہو ناں کہ ڈاکٹر سے ملنا چاہتے ہو؟''

میرا تیر عین نشانے پہ لگا اور بابا جان ڈاکٹر کا حوالہ سن کر مجھے اجازت دینے کے لیے راضی ہوگئے تاہم اُنھوں نے مجھے جلدی واپس لوٹنے کی سختی کے ساتھ تاکید کر دی تھی۔ صمد یار خان پشاور میں سیٹل تھا، شاید بابا جان کو اُن کی طرف سے خطرے کا احساس تھا ورنہ اس سے قبل اُنھوں نے کبھی بھی مجھے اس طرح کی تاکید وغیرہ نہیں کی تھی۔ میں جیسا بھی تھا بابا جان کی اولاد تھا اور اولاد والدین کو اپنی تمام خامیوں سمیت پیاری ہوتی ہے۔ اگرچہ میری امن پسندی کی وجہ سے بابا جان اکثر مجھ سے نالاں رہتے تھے اور میری امن پسندی اُن کے نزدیک بزدلی تھی لیکن اولاد بزدل ہوتے ہوئے بھی والدین کی آنکھ کا تارا ہوتی ہے۔ اُس روز زندگی میں مجھے پہلی بار بابا جان کی محبت کا احساس شدت کے ساتھ ہوا تھا۔ میں دل ہی دل میں ندامت محسوس کر رہا تھا۔ بابا جان کو دھوکا دیتے ہوئے میرا دل دکھ رہا تھا مگر میں مجبور تھا۔ چاہتے ہوئے بھی اُنھیں سچ نہیں بتا سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ سچ سُن کر مجھے کبھی بھی اجازت نہیں دیں گے سو دل پر ایک بوجھ لیے میں راشد کے ساتھ وہاں سے رخصت ہوگیا۔

راشد کے پاس اپنی سوزوکی کار تھی۔ ہم ظہر کے وقت وہاں سے نکلے اور رات کے تقریباً سات بجے پشاور

پہنچ گئے۔ راشد کا گھر پشاور شہر کی ایک معروف کالونی میں واقع تھا۔ کالونی میں زیادہ تر مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والی فیملیز کے مکانات تھے تاہم راشد کے والد چونکہ پشاور یونی ورسٹی میں پروفیسر کے عہدے پر کام کر رہے تھے سو اُنھیں ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے ایک بنگلہ نما گھر الاٹ کیا گیا تھا۔ ایک کنال کے رقبے میں تعمیر کیا گیا یہ بنگلہ نہایت ہی دیدہ زیب تھا۔ اس میں پانچ کمرے، وسیع کاریڈور، کار پورچ، کچن، باتھ روم اور جدید ٹوائلٹ موجود تھے۔ بنگلے کا لان گو کہ کشادہ نہیں تھا مگر اُس کی خوب صورتی میں کوئی کلام نہیں تھا۔

راشد کا کلاس فیلو اور دوست ہونے کے ناتے مجھے وہاں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ راشد کے والد پروفیسر ملک منیر احمد سے میری یہ اولین ملاقات تھی مگر اُن کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے مجھے ایک لمحے کے لیے بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔ وہ بلاشبہ ایک بہترین انسان تھے۔ رات کے کھانے کے بعد وہ دیر گئے تک مجھ سے گفت گو کرتے رہے، یہاں تک کہ جب میں جمائیاں لینے لگا تو وہ بادل نخواستہ رخصت ہو گئے۔

''کیسے لگے میرے ڈیڈ؟'' پروفیسر کے جاتے ہی راشد نے سوال کیا۔

میں نے کہا۔ ''ایک دم مشفق اور جینئس، کاش میرے بابا جان بھی ایسے ہی ہوتے۔''

''یہ شکوہ ہے کہ رشک؟''

''دونوں۔''

''وہ کیسے؟'' اُس نے چونک کر پوچھا۔

''انکل پہ رشک ہے اور بابا جان سے شکوہ ہے۔ وہ اگر انکل کی طرح پروفیسر ہوتے تو زندگی کتنی خوش گوار ہوتی؟ تم بہت خوش قسمت ہو راشد کہ تمھیں ایک پڑھا لکھا باپ ملا ہے۔''

اُس نے ہنس کر کہا۔ ''یہ تیرے بابا جان کا نہیں بلکہ دادا جان کا قصور ہے۔''

''قصور جس کا بھی ہو سزا تو مجھے مل رہی ہے ناں؟''

''اب کڑھنے کا کیا فائدہ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ اب تم کل کے بارے میں سوچو...... میں تو اب بھی تمھیں یہی مشورہ دوں گا کہ تمہارا اصد یار خان سے ملنا مناسب نہیں ہے۔ تمھیں کچھ ہو گیا تو میں انکل دلاور کو کیا منہ دکھاؤں گا؟''

میں نے کہا۔ ''یہ تمہارا وہم ہے مجھے ان شاء اللہ کچھ بھی نہیں ہوگا۔''

''میں نے پٹھانوں کی دشمنیوں کے متعلق بہت کچھ سن رکھا ہے۔تم لوگ بہت منتقم مزاج ہوتے ہو۔''

''ہم لوگ بااصول اور مہمان نواز بھی تو مشہور ہیں، یہ بلاوجہ کے خدشات دل سے نکال دو، ایسی کوئی بھی بات نہیں ہوگی۔ پٹھان جتنا بھی گیا گزرا ہو اپنی روایات سے انحراف نہیں کرسکتا۔''

''صمدیار خان گیا گزرا نہیں ہے۔'' اُس نے دلیل پیش کی۔

''بے شک گیا گزرا نہیں ہے مگر پٹھان تو ہے ناں؟''

''اس کا مطلب ہے کہ تم اپنی ضد نہیں چھوڑو گے؟''

''میں ایک باراُس سے ضرور ملوں گا۔'' میں نے پُرعزم انداز میں کہا۔ ''تمہیں اگر کوئی خطرہ ہے تو بے شک میرا ساتھ مت دینا، میں تم سے کوئی شکوہ نہیں کروں گا۔''

''میں نے تمہارا ساتھ دینے سے کب انکار کیا ہے؟'' اُس نے شکایتی انداز میں سوال کیا۔

''اوکے..... اگر یہ بات ہے تو اب اس ٹاپک پہ کوئی بات نہیں ہوگی، جو ہوتا ہے ہونے دو۔''

''ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔'' اُس نے بات ختم کرتے ہوئے جواب دیا۔



دوسرے روز ناشتا کرنے کے بعد ہم دونوں نے گاڑی نکالی اور صمدیار خان کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔اُس کی رہائش گاہ شہر کے جس علاقے میں تھی، وہاں بڑے بڑے بیوروکریٹس اور وزراء رہتے تھے۔آئندہ کچھ روز تک صمدیار خان بھی صوبائی منسٹر بننے والا تھا۔اپنی آبائی سیٹ وہ جیت چکا تھا اور جس سیاسی پارٹی سے ٹکٹ لے کر اُس نے الیکشن لڑا تھا، وہ پارٹی بھاری اکثریت سے جیتنے کے بعد اقتدار کی زمام کار سنبھالنے والی تھی۔گو کہ پارٹی کی شہرت کچھ اچھی نہیں تھی اُس پر الیکشن میں دھاندلی کرنے کے الزامات تھے مگر اب اُسے اقتدار میں آنے سے کوئی بھی نہیں روک سکتا تھا۔اُنھیں عوام نے ووٹ دے کر منتخب کیا تھا۔دھاندلی کا الزام لگانے والوں کے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں تھا جسے بنیاد بنا کر الزام لگانے والے اُس پارٹی کے اقتدار کے رستے میں دیوار بنتے۔

پون گھنٹے کے بعد میں اور راشد اُس علاقے میں داخل ہوگئے جہاں جگہ جگہ سکیورٹی اہل کار تعینات تھے۔ ہر گاڑی کی نہایت ہی باریکی کے ساتھ تلاشی لی جارہی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر کفِ افسوس ملنے کو جی چاہتا تھا۔ انتخابی مہم کے دوران خود کو قوم کا خادم کہنے والے اقتدار کی کرسی تک پہنچنے کے بعد کیسے گرگٹ کی طرح رنگ بدل چکے تھے۔

''دیکھو یہ منظر۔'' راشد گاڑیوں کی ایک لمبی قطار کے عقب میں اپنی گاڑی روکتے ہوئے بولا۔ ''یہ قوم کے خادموں کا علاقہ ہے۔ یہ لوگ بھوکی ننگی قوم کے مسائل حل کریں گے۔''

میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''قوم پہلے خود کو قوم تو ثابت کرے۔ بھیڑ بکریوں کو حکمران نہیں چرواہے ملتے ہیں۔''

''ٹھیک کہتے ہو یار۔'' اُس نے ایک ٹھنڈی آہ خارج کی۔ ''ہم واقعی دنیا کی بدنصیب ترین قوم ہیں''

''قوم نہیں بھیڑیں ہیں اور بھیڑیں بھی ایسی جنھوں نے بھیڑیوں کو اپنا نگہبان بنا رکھا ہے۔''

''تم سیاست میں ٹرائی کیوں نہیں کرتے؟''

''تم شاید بھول رہے ہو کہ میں کسی کی تلاش میں نکلنے والا ہوں۔''

''اچھا تو وہ خوابوں والی؟'' اُس نے قہقہہ لگایا۔

''ہاں وہی.......اس میں دانت نکالنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''مجھے تیری قسمت پہ رونا آتا ہے یار۔'' اُس نے مایوس انداز میں سر ہلایا۔ ''تم نے پڑھ لکھ کر صرف گنوایا ہے۔''

''باباجان کی طرح باتیں مت کرو، مجھے اچھا نہیں لگتا۔''

''سچ کسی کو بھی اچھا نہیں لگتا، اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔''

''بس رہنے دے مجھے تیری ہمدردی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' میں اکتا کر سامنے دیکھنے لگا۔

پھر اس سے قبل کہ وہ میری بات کا کوئی جواب دیتا دو سکیورٹی اہل کار ہماری گاڑی کی تلاشی لینے کے لیے آدھمکے۔

''نیچے آؤ بادشاہو!'' اُن میں سے ایک موٹی توند والا بولا جس کے بازوؤں پر حوالداری کا بلا چسپاں تھا۔
ہم بلاتردد گاڑی سے نیچے اُتر کر ایک طرف کھڑے ہو گئے جبکہ وہ دونوں گاڑی کی تلاشی لینے لگے۔
گاڑی کی اچھی طرح تلاشی لینے کے بعد اُنھوں نے ہمیں جانے کا اشارہ کر دیا۔ اس دوران ایک کانسٹیبل بیریئر ہٹا چکا تھا۔ ہماری گاڑی تیزی سے آگے بڑھی اور بائیں طرف ٹرن لے کر ایک کشادہ اور صاف وشفاف روڈ پر دوڑنے لگی۔ ہمارے دائیں بائیں قوم کے خادموں کے بنگلے اور عالیشان کوٹھیاں ایستادہ تھیں۔ یہ کوٹھیاں دراصل عوام کہلانے والی اُن بھیڑ بکریوں کی مرہونِ منت تھیں جنھیں گزشتہ نصف صدی سے قوم کے یہ خادم سبز باغ دکھاتے چلے آرہے تھے اور یہ سلسلہ بدستور چلتا دکھائی دیتا تھا کہ میں قوم کے حالات سے بخوبی واقف تھا۔ قوم نے ابھی شعور کی سیڑھی پر قدم رکھنا تو کجا..... سیڑھی دیکھی ہی نہیں تھی۔ سو قوم اس سے بھی ناواقف تھی کہ شعور کی یہ سیڑھی کتنی طویل ہے؟
قوم کے ان خادموں کی صبح چونکہ بارہ بجے کے بعد ہی ہوا کرتی تھی اس لیے روڈ تقریباً سنسان ہی تھی۔ تاہم ان خادموں کے چیلے چانٹے (آپ چمچے بھی کہہ سکتے ہیں) اور گھریلو ملازم ہمیں اپنے اردگرد کہیں پیدل تو کہیں سائیکل پہ سوار نظر آرہے تھے۔
''صمد یار خان کی رہائش گاہ کا ایڈریس تمھیں معلوم ہے؟'' راشد نے سکوت توڑا۔
''نہیں۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کسی سے پوچھنا پڑے گا۔''
''او کے اس آدمی سے پوچھ لیتے ہیں۔'' اُس نے مخالف سمت سے آنے والے ایک سائیکل سوار کی طرف اشارہ کیا اور پھر گاڑی کی رفتار کم کر دی۔
''سنیے بھائی۔'' سائیکل سوار کے قریب پہنچ کر راشد نے گاڑی روکتے ہوئے اُسے ہاتھ سے نزدیک آنے کا اشارہ کیا۔
''کیا بات ہے جناب؟'' سائیکل سوار نے قریب آکر پوچھا۔
راشد بولا۔ ''ہم نے صمد یار خان کی رہائش گاہ پر جانا ہے۔ وہ کس طرف ہے؟''
''اسی سڑک پر تقریباً نصف کلومیٹر کے فاصلے پر دائیں طرف واقع ہے جناب۔'' سائیکل سوار جواب دیتے

ہوئے رخصت ہو گیا۔

راشد نے گاڑی آگے بڑھائی اور ذرا سی دیر کے بعد ایک پُرشکوہ عمارت کے سامنے روک دی جس کے مین گیٹ پر صمدیار خان کی نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ گیٹ بند تھا تاہم ذیلی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ ہم گاڑی سے اُتر کر کھڑکی کے نزدیک پہنچ گئے۔ کھڑکی کے عین سامنے ایک مسلح گارڈ کرسی پر بیٹھا تازہ اخبار ملاحظہ فرما رہا تھا۔ میں نے کھنکار کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا تو وہ اخبار کرسی پر رکھتے ہوئے تیزی سے باہر آ گیا۔

''جی جناب! کس سے ملنا ہے؟'' گارڈ نے مشکوک انداز میں پوچھا۔

''صمدیار خان سے۔''

''کیوں؟'' اُس نے اُلجھ کر سوال کیا۔

''ایک ضروری کام ہے۔''

''کیسا کام؟''

''کیا یہ تفتیش کرنا ضروری ہے؟'' مجھے غصہ آ گیا۔

''بالکل ضروری ہے، یہ صاحب کا حکم ہے۔ بتاؤ کون ہو تم لوگ اور صاحب سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟''

''میں سردار دلاور خان کا بیٹا شیر دل خان ہوں اور یہ میرا دوست ملک راشد ہے۔''

''اندر آ جاؤ۔'' گارڈ نے ذومعنی انداز میں کہا۔ ''تم لوگوں کا تو صاحب انتظار کر رہا ہے۔''

''وہ کس لیے؟'' میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔

''یہ بات تو تم لوگوں کو صاحب بتائے گا۔ ابھی چلو۔'' اُس نے ہم دونوں کو گن پوائنٹ پر رکھتے ہوئے حاکمانہ انداز میں جواب دیا۔

ہم نے جونہی کھڑکی کے اندر پاؤں رکھے تو تین مسلح گارڈز نے ہمیں گھیر لیا۔ ہمیں ہانک کر اندر لانے والے گارڈ نے فوراً کھڑکی بند کر دی تھی۔ اب ہم چار مسلح گارڈز کے نرغے میں تھے۔ اُن کے تیور بتا رہے تھے کہ اگر ہم دونوں میں سے کسی نے بھی کوئی غلط حرکت کی تو وہ بلاتردد گولی چلا دیں گے۔ یہ صورت حال میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھی۔ میں خود کو پہلی بار ایسی سچویشن میں گھرا ہوا دیکھ رہا تھا چنانچہ مجھ پر فوراً گھبراہٹ طاری

ہوگئی۔ مسلح گارڈز حلیے اور شکل وصورت سے پٹھان لگ رہے تھے اور میں پٹھانوں کی سرشت سے بخوبی آگاہ تھا۔ یہ لوگ کرتے پہلے اور سوچتے بعد میں ہیں۔ میری طرح راشد بھی سہما ہوا تھا لیکن پھر بھی وہ ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے گارڈز سے مخاطب ہوگیا۔ ''ہم کوئی چور ڈاکو نہیں ہیں تمہارے صاحب کے مہمان ہیں...... تم لوگ اچھا نہیں کر رہے ہو، میں صاحب سے........''

''چُپ شا میلمہ بچے (خاموش مہمان کے بچے)'' ایک خطرناک صورت گارڈ نے راشد کی بات کاٹی۔ ''ابی تم نے منہ سے ایک لفظ بی نکالا تو اَم تمارا سر میں گولی مارے گا۔ اَم کو مجبور نہیں کرو۔''

راشد اُس کے تیور دیکھ کر فوراً چپ ہوگیا تاہم اُس نے مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کر دیا تھا کہ میں گارڈز سے اپنی زبان میں بات کروں مگر مجھ پر تو پہلے ہی لرزے کی کیفیت طاری تھی۔ میرا حلق خشک ہو چکا تھا اور آنکھوں میں خوف کے سائے رقص کر رہے تھے۔

''تم میں سے دلاور خان کا بیٹا کون اے؟'' گارڈ نے ہمیں گھورتے ہوئے سوال کیا۔

''ہم دونوں ہی دلاور خان کے بیٹے ہیں۔'' راشد نے جواب دیا۔

''یہ جھوٹ بول رہا ہے۔'' ہمیں باہر سے اندر ہانک کر لانے والا گارڈ شستہ اُردو میں چلایا اور پھر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''دلاور خان کا بیٹا یہ ہے۔''

''کیا یہ ٹیک بولتا اے؟'' گارڈ نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔ ''تم ای دلاور کا بیٹا اے ناں؟''

راشد نے کہا۔ ''تمہارے ساتھی کو غلط فہمی ہوئی ہے، ہم دونوں ہی دلاور خان کے بیٹے ہیں۔''

میں راشد کو متحیر انداز میں دیکھ رہا تھا۔ مجھے اُس سے اس قدر بہادری کی توقع نہیں تھی۔ وہ بے خطر پرائی آگ میں کُود پڑا تھا۔ اُس کے اس قدم سے بالکل غیر متوقع طور پر میرا خوف زائل ہوگیا اور زندگی میں پہلی بار میں نے ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں میں ہی دلاور خان کا بیٹا ہوں، اسے جانے دو۔''

''یہ بکواس کرتا ہے۔'' راشد مجھے غصے سے گھورتے ہوئے بولا۔ ''ہم دونوں بھائی ہیں۔''

''بکواس میں نہیں، تم کر رہے ہو۔'' میں نے چلا کر کہا۔ ''تم میرے کچھ بھی نہیں لگتے، جاؤ چلے جاؤ یہاں سے یہ میرا اور صمد یار خان کا معاملہ ہے۔''

”نہیں جانتا۔“ اُس نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا۔

”تیری تو......“ میں نے آگے بڑھ کر اُسے گریبان سے پکڑا اور پھر آنکھ دبا کر ایک مخصوص اشارہ کر دیا۔ ”جاتے ہو یا دوں ایک کان کے نیچے؟“

”کیا یہ مجھے جانے دیں گے؟“ اُس نے گارڈز کی طرف اشارہ کیا۔

”کبھی نہیں جانے دے گا۔“ خطرناک صورت گارڈ نے مداخلت کی۔

میں نے پشتو میں کہا۔”اسے جانے دو، تمہارے صاحب کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔“

”نہیں۔“ گارڈ نے انکار میں سر ہلایا۔”ہم تم دونوں کو خان صاحب کے سامنے پیش کریں گے۔“

چاروناچار ہمیں گارڈ کے حکم کی تعمیل کرنا پڑی۔ گن پوائنٹ پر مختلف راہداریوں سے گزرتے ہوئے آخرکار ہم ایک شان دار کمرے میں پہنچ گئے، جہاں صمد یار خان پورے کروفر کے ساتھ ایک غیر ملکی صوفے پر بیٹھا سگار کے کش لگا رہا تھا۔ اُس نے باری باری ہم دونوں کا ناقدانہ جائزہ لیا اور پھر اُس کے چہرے پر مکروہ قسم کی مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی

”ہوں۔“ اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔”تو دلاور خان نے تم دونوں کو مرنے کے لیے میرے ہاں بھیج دیا۔“

”نہیں جناب! ایسی کوئی بھی بات نہیں ہے بلکہ میں تو آپ سے معذرت کرنے آیا ہوں۔“

وہ مسکرایا۔”میں جانتا ہوں کہ تم دلاور خان کے بیٹے ہو، واقعی باپ سے بڑھ کر چالاک ہونا چاہیے تمہیں......مگر تم سے ایک غلطی ہوگئی ہے۔ تمہیں میرے گھر میں نہیں گھسنا چاہیے تھا۔“

”سر! میں نے کہا ہے ناں کہ میں آپ سے معافی طلب کرنے آیا ہوں۔ آپ کے گارڈز کو غلط فہمی ہوئی ہے، ہم کسی بُرے ارادے سے نہیں آئے ورنہ یوں خالی ہاتھ اور دن کے وقت کیوں آتے؟“

بات میں وزن تھا وہ سوچ میں پڑ گیا۔ یہ میرے لیے سنہری موقع تھا چنانچہ میں نے عاجزانہ انداز میں کہا۔” میں اپنے باپ اور بھائی کے کیے پر سخت نادم ہوں اور اُن کی جگہ میں آپ سے ہاتھ جوڑ کر ریکوسٹ کرتا ہوں کہ جو کچھ ہوا اُسے بھول جائیں۔ ہمارے دلوں میں آپ کے لیے کوئی میل نہیں ہے۔“

''ہوں۔'' اُس نے سر ہلایا۔'' کہتے تو تم ٹھیک ہی ہو مگر کیا عجیب بات نہیں ہے کہ خطا کوئی کرے اور معافی کوئی مانگے ؟ تمہارے بھائی اور باپ کے دل میں اگر میل نہیں ہے تو معافی مانگنے کے لیے اُنھیں آنا چاہیے تھا۔''

''سر! آپ ایک مایہ ناز سیاست دان ہیں۔'' میں نے خوشامد کا سہارا لیا۔'' میں آپ سے باتوں میں نہیں جیت سکتا تاہم میں آپ سے سچے دل سے معافی طلب کرنے آیا ہوں۔''

''برخوردار! مجھے تمہارے خلوص پر کوئی شک نہیں ہے لیکن معافی تیرے بھائی اور باپ کو ہی مانگنا پڑے گی اُن سب لوگوں کے سامنے جن کے بیچ اُنھوں نے مجھے بے عزت کیا تھا۔''

''سر پلیز......'' راشد نے مداخلت کی۔'' آپ ہمارے بزرگوں کی جگہ ہیں اور ہم آپ کے پاس.........''

''یہ کون ہے؟'' اُس نے راشد کو بات مکمل کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

''میرا دوست ہے جناب۔''

''تو پھر اسے ہمارے معاملے میں مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، اس کی بھلائی خاموشی ہی میں ہے۔'' اُس نے نخوت سے جواب دیا اور راشد کے چہرے پر ندامت کے رنگ بکھر گئے۔

''سر! اس قدر غرور اللہ تعالیٰ کے غضب کو آواز دینے کے مترادف ہے۔'' راشد نے ناگوار انداز میں اُسے گھورا۔ ''میرا دوست آپ سے صدقِ دل کے ساتھ معافی طلب کرنے آیا ہے اور آپ اس کی سادگی کا تماشا بنا رہے ہیں؟ آپ کیسے پٹھان ہیں کہ گھر آئے مہمان کو بے عزت کر رہے ہیں؟ میں نے تو پٹھانوں کے بارے میں سنا تھا کہ......'' راشد کی بات ابھی ادھوری ہی تھی جب صدیار خان نے گارڈز کو مخصوص اشارہ کر دیا۔

مالک کا اشارہ پاتے ہی گارڈز بھوکوں کتوں کی طرح راشد پر ٹوٹ پڑے۔ وہ اُسے نہایت ہی بے رحمی کے ساتھ پیٹ رہے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر مجھ پر ایک بار پھر گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ وہ میری خاطر پٹ رہا تھا، مجھے اُس کی مدد کرنا چاہیے تھی مگر میری ازلی امن پسندی میرے آڑے آ رہی تھی۔ راشد حتی المقدور خود کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن چار کے مقابلے میں ایک کی اوقات ہی کیا ہوتی ہے۔ چنانچہ اُس وقت راشد کا بھی وہی حشر ہو رہا تھا جو کسی بھی اکیلے لڑنے والے کا ہوا کرتا ہے۔ گارڈز اُس کی یوں پٹائی کر رہے تھے جیسے پولیس والے کسی

لاوارث مجرم کی کرتے ہیں۔ مجھ پر بے بسی اور ڈر کی کیفیت طاری تھی۔ لڑنا تو کجا میں تو اُس وقت فریاد کرنے سے بھی ڈر رہا تھا۔ اسی کیفیت میں کئی لمحات گزر گئے، یہاں تک کہ راشد مار کھاتے کھاتے زمین پر گر گیا۔ ایسے ہی وقت میری نظر راشد کے لہولہان چہرے پر پڑی تو میں دوڑ کر صمد یار خان کے قدموں میں گر گیا۔

''خان جی! آپ کو اللہ کا واسطہ، اُس کے رسول ﷺ کا واسطہ..... پلیز میرے دوست پر رحم کریں اسے معاف کر دیں۔'' میں نے اُس کے پاؤں پکڑتے ہوئے کسی کمی کمین کی طرح فریاد کی۔

''بچا سکتے ہو تو بچا لو اپنے دوست کو۔'' وہ حقارت سے بولا۔ ''ایک قبائلی سردار کے بیٹے ہو کر یوں بے غیرتوں کی طرح میرے قدموں میں کیوں لوٹ رہے ہو؟''

''مم...... میں لڑنے نہیں آیا خان جی۔'' میں نے اُس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ ''رحم کی بھیک مانگنے آیا ہوں۔''

''نامرد کہیں کے! بھیک تو بھکاری مانگتے ہیں۔'' اُس نے صوفے سے اُٹھ کر مجھے ٹھوکر لگائی۔ ''تف ہے تم پر..... خود کو ایک سردار کا بیٹا کہلاتے ہو؟''

ایک لمحے کے لیے میری مُردہ رگوں میں لہو کی حرارت پیدا ہوئی، جی چاہا کہ انجام کی پرواہ کیے بغیر اس ظالم انسان پر جھپٹ پڑوں لیکن لمحہ بھر کا یہ جوش جلد ہی ٹھنڈا پڑ گیا۔ مسلح گارڈز کی موجودگی میں اُس پر حملہ کرنا اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا جب کہ مجھے زندگی سے بے حد پیار تھا چنانچہ میں کسی صورت میں یہ رسک لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''خان جی! میں بھکاری سہی، پر خدا کے لیے میرے دوست کو معاف کر دیں۔'' میں دوبارہ اُس کے قدموں سے لپٹ گیا۔

''اور مجھے بھکاریوں سے نفرت ہے۔'' اُس نے مجھے ایک اور ٹھوکر رسید کی۔ ''اُٹھو اور لڑ کر اپنے دوست کی جان بچاؤ ورنہ میرے گارڈز تم دونوں کو گولی مار دیں گے۔''

''مم...... مجھے...... لڑنا نہیں آتا۔'' میں نے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''ٹھیک ہے تو پھر میرا ایک کام کر دو، میں تم دونوں کو چھوڑ دوں گا۔'' وہ ذومعنی انداز میں بولا۔ ''کیا خیال

ہے کرو گے؟“

”ہاں...... ہاں کروں گا۔“ میں نے جھٹ سے کہا۔ ”آپ کام بتائیں؟“

”گڈ۔“ اُس نے سر ہلایا اور پھر گارڈز سے تحکمانہ لہجے میں بولا۔ ”بس اب اسے چھوڑ دو، اتنا سبق کافی ہے اس کے لیے۔ مجھے یقین ہے کہ آئندہ یہ کبھی پرائے معاملے میں ٹانگ نہیں اڑائے گا۔“

گارڈز نے حکم کی پیروی کی اور نیم بے ہوش راشد کو چھوڑ دیا۔ اس کے بعد صدیار خان کے حکم پر نہ صرف راشد کو پانی پلایا گیا بلکہ ایک گارڈ نے کسی ماہر ڈسپنسر کی طرح راشد کی مرہم پٹی بھی کر دی تھی۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد صدیار خان نے ایک گارڈ کو قریب بلا کر اُس کے کان میں کھسر پھسر کی تو گارڈ بھاگتا ہوا باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

تھوڑی دیر کے بعد گارڈ دوبارہ کمرے میں داخل ہوا اور ہاتھ میں موجود گتے کا ایک درمیانے سائز کا ڈبہ صدیار خان کے سامنے موجود سنگِ مرمر کے ٹیبل پر رکھ دیا۔ صدیار خان نے ڈبہ کھول کر دیکھا اور پھر قہقہہ لگا کر بولا۔ ”اب آئے گا مزا...... دلاور خان نے مجھ سے دشمنی مول لے کر اچھا نہیں کیا۔“

تمام گارڈز کے چہروں پر معنی خیز مسکراہٹ طاری تھی۔ جب کہ میں پریشانی کے عالم میں اُنھیں مسکراتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرنے والے ہیں؟

”اوئے!“ صدیار خان نے ایک گارڈ کو پکارا۔ ”ذرا بھاگ کر ویڈیو کیمرا تو لانا...... یہ یادگار منظر محفوظ ہونا چاہیے کبھی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔“

”ابھی لایا خان جی۔“ کہہ کر گارڈ تیزی سے باہر نکل گیا۔

میں مسکین سی صورت بنا کر رحم طلب انداز میں صدیار خان کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن اُس کے درشت چہرے پر سوائے تمسخر کے کچھ بھی نہیں تھا۔ غالباً اُس کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا تھا جو مخلوق ہوتے ہوئے بھی دولت اور طاقت کے بل بوتے پر خدا بنے پھرتے ہیں۔ شاید ایسے ہی کسی وقت کے لیے شاعر نے کہا ہوگا۔

ابلیس تیری ایک خدا سے نہ بن سکی
مجھ کو بھی دیکھ کتنے خداؤں کی زد میں ہوں

اس دوران باہر جانے والا گارڈ وڈیو کیمرا لے کر پہنچ گیا۔ صمدیار خان نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور گارڈ سے بولا۔ ”جونہی میں اشارہ کروں تم شوٹ کرنا شروع کر دینا اور خبردار اگر سین ذرا سا بھی خراب شوٹ ہوا تو میں تجھے گولی مار دوں گا۔“

”بے فکر رہیں خان جی! پہلے کبھی ایسا ہوا ہے جو اب ہوگا؟“ گارڈ نے فخریہ انداز میں دانتوں کی نمائش کی۔

”گڈ۔“ صمدیار خان نے ستائشی انداز میں کہا۔ ”اگر فلم انڈسٹری زوال کا شکار نہ ہوتی تو میں ضرور ایک فلم بناتا اور کیمرا مین تم ہوتے۔“

”یہ ڈبہ اُٹھاؤ۔“ صمدیار خان نے مجھے مخاطب کیا۔ ”اور میرے سامنے فرش پر بیٹھ جاؤ۔“

میں نے بلا چون وچراں ڈبہ اُٹھایا اور فرش پر بیٹھ گیا۔ راشد اب مکمل طور پر اپنے حواسوں میں آ چکا تھا تاہم وہ ڈرا سہما نظر آ رہا تھا اور بے بس انداز میں میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کی نگاہوں میں بے شمار سوالات تھے ،جن کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ سو میں نے اُس سے نگاہیں چرا لیں۔

”ڈبہ کھولو۔“ صمدیار خان نے حکم صادر کیا۔

میں نے کسی معمول کی طرح اُس کے حکم پر عمل کیا اور ڈبہ کھول دیا مگر پھر یوں ہراساں ہو کر کھڑا ہو گیا جیسے ڈبے میں سانپ اور بچھو بھرے ہوں۔

”یہ.......یہ.......کیا ہے؟“ میں نے بوکھلا کر پوچھا۔

”یہ چوڑیاں ہیں۔“ اُس نے قہقہہ لگایا۔ ”عورتیں اور نامرد پہنتے ہیں......شاباش پہنو تمہیں ان میں اپنے سائز کا نمبر مل جائے گا۔“

”لل......لل......لیکن......مم......میں......“

”خاموش۔“ وہ گرجا اور میری بات ادھوری رہ گئی۔ ”پہنو ورنہ میرے گارڈز تم دونوں کو گولی ماردیں گے۔“

”د......دیکھو......خان جی! مم......میں......“

”گارڈز۔“ وہ چیخا اور میں یک دم خاموش ہو گیا۔ ”اس کے دوست کو گولی ماردو۔“

”نہیں۔“ میں نے چلا کر کہا۔ ”مم......میں پہنتا ہوں......گو......گولی مت چلانا۔“

اُس نے ہاتھ کے اشارے سے گارڈز کو روک دیا اور پھر میری طرف متوجہ ہو گیا۔ "بلا جھجک ہو کر پہنتے جاؤ چوڑیاں ٹوٹتی رہتی ہیں پروا مت کرنا۔"

میں نے سر جھکایا اور ڈبے سے چوڑیاں نکال کر اپنی کلائی میں چڑھانے لگا جب کہ وڈیو کیمرے والے گارڈ نے یہ شرم ناک منظر فلمانا شروع کر دیا۔ میں جیسے خود کو ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ میری امن پسندی نے ایک پل میں میری عزت کا جنازہ نکال دیا تھا۔ چوڑیاں کے ساتھ ساتھ میرا دل بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔ ٹوٹنے والی چوڑیوں نے میری کلائی زخمی کر ڈالی تھی مگر جو چوڑیاں میری کلائی گھیر چکی تھیں اُنھوں نے میری روح کو گھائل کر دیا تھا۔ میں اب کسی کے سامنے نظر اُٹھانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ صدیار خان اور اُس کے گارڈز قہقہے لگا رہے تھے۔ میرا سر بدستور ندامت اور احساسِ ذلت کے باعث جھکا ہوا تھا۔ نجانے کتنے ہی لمحات گزر چکے تھے جب اچانک صدیار خان نے مجھے سر اُٹھانے کا حکم دیا مگر میں حرکت کرنے سے قاصر رہا۔ جب انسان اپنی ہی نظروں سے گر جائے تو پھر وہ سر اُٹھانے کے قابل کہاں رہتا ہے؟ میں بھی اُس وقت سر اُٹھانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ سو سر جھکائے بیٹھا رہا۔

"سر اُٹھاؤ بزدل چوہے!" وہ چلایا۔ "ورنہ کندھوں پہ یہ سر ہی نہیں رہے گا۔"

"یہ سر نہیں منوں وزنی بوجھ ہے جو میرے کندھوں پہ دھرا ہے۔" میں نے بے بسی کے عالم میں جواب دیا۔ "مجھ پر ایک احسان کریں، اسے جھکا ہی رہنے دیں۔"

"تیرا سر اگر جھکا رہا تو یہ وڈیو نامکمل رہ جائے گی۔ سر اُٹھاؤ اگر تمھیں اپنے دوست کی زندگی پیاری ہے۔"

"نہیں شیر دل خان۔" غیر متوقع طور پر راشد نے مداخلت کی۔ "مجھے موت قبول ہے مگر تم سر مت اُٹھانا۔"

"میں تین تک گنوں گا اگر اس دوران تم نے سر نہ اُٹھایا تو اپنے دوست کو زندہ نہیں پاؤ گے۔" اُس نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور پھر گنتی شروع کر دی۔ "ایک......دو......"

اس سے قبل کہ اس کی گنتی مکمل ہوتی میں نے سر اُٹھا لیا۔

"گڈ......یہ ہوئی ناں مردوں والی......سوری سوری......" اُس نے ایک مکروہ قہقہہ لگایا۔ "مجھ سے غلطی ہو گئی، دراصل مجھے ہیجڑوں والی بات کہنا چاہیے تھا۔"

راشد بولا۔ "یہ تم نے اچھا نہیں کیا، انھوں نے تمہاری مووی بنالی ہے۔"

صدیار خان نے اُسے گھورا۔ "تم چپ رہو ورنہ تمہاری مووی بھی بناڈالیں گے۔"

"بہترین مووی بنی ہے جناب۔" مووی بنانے والے گارڈ نے فخریہ انداز میں بتایا۔

"گڈ۔" صدیار خان نے اثبات میں سرہلایا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوکر بولا۔ "اب تم لوگ جاسکتے ہو لیکن میری ایک بات یاد رکھنا اگر تم نے کوئی بھی غلط قدم اُٹھایا تو میں یہ مووی ملک کے تمام چینلز پر چلوادوں گا۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ دوبارہ غصے ہوگیا۔ "کیا تم اپنی عریاں فلم بنوانا چاہتے ہو؟ تمہاری خاموشی بتاتی ہے کہ تم کوئی غلط قدم اُٹھانے کے بارے میں سوچ رہے ہو؟ میں تمہیں تنبیہ کرتا ہوں کہ مجھ سے بچ کر رہنا ورنہ پچھتانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔"

"نہیں ہم کچھ بھی نہیں کریں گے۔" میرے بجائے راشد نے جواب دیا۔

"اوکے اب دفع ہوجاؤ۔" اُس نے حقارت سے کہا، تب میں اور راشد چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گئے۔



کمرے سے باہر نکلتے ہی میں نے چوڑیاں اُتار کر پھینک دیں۔ راشد بولا۔ "اب انھیں اُتارنے کا کیا فائدہ؟ پہنے رکھتے، تمہیں دیکھ کر انکل دلاور کو خوشی ہوتی۔"

میرے دل پر ایک چوٹ سی لگی، جسے بچانے کی خاطر میں نے یہ ذلت اُٹھائی تھی وہی مجھ پر طنز کے تیر چلا رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "راشد! میں نے یہ ذلت محض تیری خاطر گوارا کی ہے ورنہ میں مرجاتا مگر............"

اپنی بزدلی کا الزام مجھے نہ دو۔" اُس نے زہریلے لہجے میں قطع کلامی کی۔ "تم خود کو پٹھان کہتے ہو، کیا پٹھان ایسے ہوتے ہیں؟...... تیری طرح بزدل۔"

"اسلحے کی نوک پر میں کیا کرتا...... کیا تجھے اور خود کو مرنے دیتا؟"

"ہاں مرنے دیتے۔" وہ چلایا۔ "بے عزت ہوکر جینے سے مرجانا ہی بہتر ہوتا ہے۔"

"مجھے تم سے زیادہ دکھ ہے اس بے عزتی کا، میں جس کرب اور احساسِ ذلت سے گزر رہا ہوں تم اُس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ جی چاہتا ہے خودکشی کرلوں۔"

”تیرے جیسے بزدل ایک دن خودکشی ہی تو کرتے ہیں۔“

”راشد پلیز......“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میرے زخموں پر نمک پاشی مت کرو، میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں اور منت کرتا ہوں کہ تم یہ بات کسی کو بھی نہیں بتاؤ گے۔ تجھے میری دوستی کا واسطہ۔“

”میں لعنت بھیجتا ہوں تیری دوستی پر اور قسم کھاتا ہوں کہ آج کے بعد تیری شکل بھی نہیں دیکھوں گا۔“ اُس نے حقارت سے جواب دیا۔

اس دوران ہم اپنی گاڑی تک پہنچ گئے۔ راشد کھڑکی کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں نے اُس کی حالت کے پیشِ نظر کہا۔ ”تم زخمی ہو گاڑی مجھے چلانے دو۔“

”زخمی ہوں مرا تو نہیں ہوں۔“ وہ تلخی سے بولا۔ ”چپ چاپ بیٹھ جاؤ۔“

اُسے تناؤ کی کیفیت میں دیکھ کر میں چپ چاپ اُس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اُس نے گاڑی اسٹارٹ کی گیئر لگایا اور پختہ روڈ پر ڈال دی۔ مختلف چوراہوں پر سے گزرتے ہوئے ہم مین روڈ پر پہنچ گئے، اس دوران ہمارے بیچ خاموشی ہی رہی تھی لیکن جونہی ہم کشادہ روڈ پر پہنچے میں نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ ”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا، میں نے تم سے ایک ریکوئسٹ کی تھی؟“

وہ بولا۔ ”تم نے کون سا بہادری کا کام کیا ہے کہ میں کسی کے سامنے ذکر کروں گا؟“

”میں مجبور تھا میرے دوست! تم سمجھنے کی کوشش.........“

”مجھے دوست مت کہو۔“ اُس نے قطع کلامی کی۔ ”میں کسی بزدل کا دوست کہلانا نہیں چاہتا۔ خواہ مخواہ میں انکل دلاور کو غلط سمجھتا رہا حالانکہ وہ اپنی جگہ درست ہیں۔ تم مرد کہلانے کے لائق نہیں ہو۔“

”راشد!“ میں چلایا۔ ”تم......تم حد سے بڑھ رہے ہو، میری دوستی کا ناجائز فائدہ اُٹھا رہے ہو......تم خود کو سمجھتے کیا ہو؟“

”کم از کم ہیجڑہ تو بالکل نہیں سمجھتا۔“ اُس نے مذاق اُڑانے والے انداز میں جواب دیا۔

”گاڑی روکو۔“ میں نے چیخ کر کہا۔

”نہیں روکتا......کیا کرلو گے؟“

"روکو ورنہ......."

"ورنہ کیا؟" اُس نے میری بات کاٹ دی۔

"ورنہ یہ......." میں نے ایک جھٹکے سے کھڑکی کھولی اور چلتی ہوئی گاڑی سے باہر چھلانگ لگا دی۔

میں ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل پختہ سڑک پر گرا اور لڑھکتا ہوا سڑک کے کنارے تک چلا گیا۔ میں ابھی تک سنبھلا بھی نہیں تھا کہ راشد دوڑتا ہوا پہنچ گیا۔

"احمق انسان! یہ کیا کیا؟" اُس نے چیخ کر پوچھا اور پھر مجھے اُٹھنے میں مدد دینے لگا۔

"جو ایک بزدل کو زیب دیتا ہے میں نے وہی کیا ہے۔" میں نے درد سے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

"سوری۔" اُس نے پہلی بار ندامت کا اظہار کیا۔ "میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔"

"لفظوں کے لگے زخم کبھی مندمل نہیں ہوتے، تم جاؤ مجھے کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں خود ہی چلا جاؤں گا۔"

"میں تمہیں اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔" اُس نے انکار میں سر ہلایا۔

"مجھے تمہاری مدد نہیں چاہیے۔" میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "آج سے تیرے اور میرے رستے الگ الگ ہیں۔"

"بکواس مت کرو۔" وہ جھنجھلا کر بولا۔ "تمہیں میری ذمہ داری پر انکل دلاور نے بھیجا ہے۔ میں خود تجھے تیرے گاؤں تک چھوڑ کر آؤں گا۔"

"بڑی مہربانی میں خود چلا جاؤں گا۔"

میں لنگڑاتے ہوئے آگے بڑھا، میرے گھٹنوں اور کہنیوں پر خاصی خراشیں آئی تھیں۔ دائیں ٹانگ میں درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں مگر میں جیسے تیسے برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے چل پڑا۔

"یہاں تماشا مت بناؤ۔" وہ میرا راستہ روکتے ہوئے بولا۔ "سمجھنے کی کوشش کرو تم یہاں پشاور میں غیر محفوظ ہو، تمہاری زندگی کو خطرہ ہے۔"

"مجھے تمہاری ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔"

"نہیں ہٹتا...... کیا کر لو گے؟" اُس نے بناوٹی غصے کا اظہار کیا۔

''میں......میں تمہارا سر پھاڑ ڈالوں گا۔''

''پھاڑ ڈالو کوئی پرواہ نہیں ہے۔''

''راشد!'' میں چلایا مگر وہ آگے بڑھ کر مجھ سے لپٹ گیا۔

''مجھے معاف کر دو شیر دل!'' وہ مجھے اپنی باہوں میں بھینچتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میں نے جان بوجھ کر تمہارا دل دُکھایا ہے ورنہ میں جانتا ہوں کہ بندوق کے سامنے ساری بہادری ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ تمہاری جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کرتا۔''

یونی ورسٹی کے زمانے میں وہ میرا بہترین دوست تھا اور یہ دوستی اب تک قائم چلی آ رہی تھی۔ ہم لڑتے بھی تھے اور پھر مان بھی جاتے تھے۔ مگر یہ پہلا موقع تھا جب وہ مجھے مناتے ہوئے جذباتی ہو گیا تھا۔ میں چپ رہا مگر وہ بولتا رہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے بہت زیادہ خفا ہو اور تمہیں خفا ہونا بھی چاہیے لیکن دوست! خدا گواہ ہے کہ تمہاری بے بسی میں نے اپنے دل میں محسوس کی ہے۔ ذلت کا وہ احساس جو تم نے محسوس کیا ہے وہ میرے دل میں بھی نشتر چبھو رہا ہے۔ میرے سینے میں آگ لگی ہوئی ہے، کبھی نہ بجھنے والی آگ کاش میں یہ آگ صمد یار خان کے خون سے بجھا سکتا۔''

میں نے کہا۔ ''راشد! مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ میں نے یہ ذلت اپنی فیملی کے تحفظ کے لیے برداشت کی ہے۔ میری ذلت سے اگر یہ دشمنی ختم ہو جائے تو میرے لیے یہ سودا مہنگا نہیں ہے۔ میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو محض اپنی انا کی تسکین کے لیے اپنے ہی جیسے انسانوں کے خون سے ہولی کھیلتے رہتے ہیں۔ اگر میرے یہ خیالات و افکار بزدلی ہیں تو پھر مجھے بزدل کہلانے میں کوئی ندامت نہیں ہے۔''

''تم بزدل نہیں ہو میرے دوست۔'' وہ مجھ سے الگ ہوتے ہوئے بولا۔ ''بزدل تو دراصل صمد یار خان جیسے لوگ ہوتے ہیں جو اسلحے کے بل بوتے پر شیر بنے پھرتے ہیں اور جب ایسے فرعونوں کو کوئی موسیٰ ٹکراتا ہے تو کسی چوہے کی طرح بل میں گھس جاتے ہیں۔''

''ہاں ظلم کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے اور یہ قانونِ قدرت ہے کہ اُس نے ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ پیدا کیا ہے۔ صمد یار خان آج کا فرعون ہے اور فرعون کبھی موسیٰ کی نگاہوں سے چھپ نہیں سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ

ایک دن کوئی موسیٰ آئے گا اور اسے اس کے ظلم سمیت زندہ دفن کر دے گا۔''

راشد نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ٹھیک کہتے ہو، کیا پتا وہ موسیٰ تمہارے ہی گھر سے نکلے؟''

''اللہ بہتر جانتا ہے کہ کب، کہاں اور کیا کیا ہونا ہے؟''

راشد نے کہا۔ ''اچھا چھوڑو...... بہت دیر ہوگئی ہے، اب چلنا چاہیے۔''

''او کے۔'' میں نے گاڑی کی طرف قدم بڑھائے جو سڑک کے کنارے چند قدموں کے فاصلے پر کھڑی ہوئی تھی۔ اگلے ہی لمحے ہم دونوں گاڑی میں سوار ہو کر راشد کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆......☆......☆

راشد کے گھر والے ہم دونوں کو زخمی دیکھ کر خاصے پریشان ہو گئے اور ہم پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ راشد ابھی اُنھیں مطمئن کرنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ عین اسی لمحے راشد کے پاپا پروفیسر منیر احمد آ دھمکے۔

''یہ...یہ...تم دونوں کو کیا ہوا ہے، کیا کسی سے جھگڑا ہوا ہے؟'' اُنھوں نے پریشانی کے عالم میں سوال کیا۔

راشد بولا۔ ''نہیں پاپا! ہمارا کسی سے کیا جھگڑا ہونا تھا وہ دراصل بس ایسے ہی مذاق مذاق میں ہم دونوں زخمی ہو گئے ہیں، معمولی سے زخم ہیں پریشانی والی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کیوں فکر کرتے ہیں ایک دو دن میں یہ زخم ٹھیک ہو جائیں گے۔''

''بات معمولی اور غیر معمولی کی نہیں ہے بلکہ سچ اور جھوٹ کی ہے۔ تم کچھ چھپا رہے ہو، سچ بتاؤ کیا ہوا ہے؟''

''پاپا یقین کریں میں سچ کہہ رہا ہوں، ہمارا............''

''راشد!'' پروفیسر نے قطع کلامی کی۔ ''میں تمہارا باپ ہوں، تمہیں باپ کے سامنے جھوٹ بولتے ہوئے شرم نہیں آتی؟ میں جو یونیورسٹی میں اپنے اسٹوڈنٹس کو سچائی کا درس دیتا ہوں، کیا اپنے گھر میں جھوٹ کو رواج دینا شروع کر دوں؟''

''میں بتاتا ہوں انکل!'' میں نے مداخلت کی۔ ''دراصل............''

''نو......'' اُنھوں نے انکار میں سر ہلایا۔ ''تم کیوں بتاؤ گے، وہی بتائے گا جس سے میں نے پوچھا ہے۔''

”ٹھیک ہے پاپا۔“ راشد نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔”میں ہی بتا دیتا ہوں۔ دراصل چند لفنگوں سے ہماری لڑائی ہوئی ہے۔ وہ چار تھے جب کہ ہم دو...... مگر ہم نے اُن کی خوب پٹائی کی ہے، بس اسی مارا ماری میں مجھے اور شیر دل کو بھی چند چوٹیں آگئیں۔“

”کون تھے وہ لوگ؟“ پروفیسر نے مشکوک انداز میں پوچھا۔

”پتا نہیں ہم اُنھیں نہیں جانتے۔“

”لڑائی کس بات پر ہوئی تھی؟“

”اُنھوں نے اپنی گاڑی ہماری گاڑی کے عین سامنے اس طرح پارک کر رکھی تھی کہ ہمارے لیے وہاں سے گاڑی نکالنا ممکن ہی نہیں تھا۔ ہم نے اُن سے گاڑی ہٹانے کی ریکوئسٹ کی تو وہ گاڑی ہٹانے کی بجائے ہم سے اُلجھ پڑے اور پھر بات بڑھتے بڑھتے ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔“ راشد نے بڑی مہارت سے جھوٹ بولتے ہوئے جواب دیا۔

پروفیسر نے کہا۔”میں نے کتنی بار تمھیں منع کیا ہے کہ ایسے لوگوں کے منہ مت لگا کرو، کسی دن بات تھانے کچہری تک پہنچ گئی تو میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق بھی نہیں رہوں گا۔ اپنا نہیں تو کم از کم باپ کی عزت کا ہی سوچ لیا کرو۔“

”انکل! اس میں راشد کا کوئی قصور نہیں ہے پہل اُنھوں نے کی تھی۔“ میں نے دوبارہ مداخلت کی۔

”اوکے۔“ اُنھوں نے سر ہلایا۔”چونکہ تم یہاں مہمان ہو اس لیے میں تمہارے دوست کو معاف کرتا ہوں لیکن دوبارہ ایسی غلطی نہیں ہونی چاہیے۔“

”شکریہ انکل! آئندہ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔“

”کھانا وغیرہ کھا لیا تم نے؟“

”نہیں...... ہم ابھی ابھی آئے ہیں۔“ راشد نے جواب دیا۔

پروفیسر بیوی اور بیٹی کی طرف متوجہ ہو گئے۔”بھئی تم دونوں یہاں کیا کر رہی ہو، جاؤ کھانا لگاؤ۔“

راشد کی امی آنٹی خدیجہ بولی۔”کھانا تیار ہے میں ابھی لگاتی ہوں۔“ اتنا کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

"تم بھی جاؤ حنا! ماں کا ہاتھ بٹاؤ۔" پروفیسر نے بیٹی کو ہاتھ سے جانے کا اشارہ کیا۔

حنا مجھ پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر باہر نکل گئی۔ تب پروفیسر راشد سے پیش آنے والے واقعہ کی تفصیلات سننے لگا۔

راشد نے بڑی مہارت کے ساتھ ایک فرضی کہانی سنا دی۔ پروفیسر کو ذرا سا گمان بھی نہیں گزرا تھا کہ جو کچھ اسے سنایا گیا ہے وہ راشد کے ذہن کی اختراع ہے۔



دو دن میں نے مزید راشد کے ہاں قیام کیا اور تیسرے دن جانے کی تیاری کرنے لگا۔ راشد میرے جانے پر اُداس تھا وہ مجھے مزید ٹھہرانا چاہتا تھا لیکن مجھے بابا جان کی طرف سے بذریعہ موبائل فون وارننگ موصول ہو چکی تھی کہ میں فوراً گھر پہنچ جاؤں بصورت دیگر بابا جان خود مجھے لینے کے لیے پہنچ جاتے۔ سو میں نے راشد سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "تم فکر مت کرو اگلی بار جب میں آؤں گا تو پورا ایک ہفتہ یہاں ٹھہروں گا۔"

وہ بولا۔ "ابھی کچھ دنوں کے بعد سرما کی چھٹیاں ہونے والی ہیں۔ پاپا اور امی چاہتے ہیں کہ ہم اس بار کی چھٹیاں اپنے آبائی شہر ملتان میں گزاریں، اگر تم ملتان دیکھنا چاہتے ہو تو پھر ایک دن قبل یہاں پہنچ جانا۔ میں تجھے شہرِ اولیاء کی سیر کراؤں گا۔"

میں نے کہا۔ "میں کوشش کروں گا اگر بابا جان مان گئے تو پھر ضرور آؤں گا۔ مجھے بھی ملتان دیکھنے کا بہت شوق ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اب چلو میں تجھے بس اسٹاپ تک ڈراپ کر دیتا ہوں۔"

ہم نکلنے ہی والے تھے کہ عین اُسی وقت آنٹی خدیجہ کمرے میں داخل ہوئی، اُس نے ہاتھ میں دو بھاری شاپنگ بیگ اُٹھا رکھے تھے۔

"شیر دل!" آنٹی نے مجھے مخاطب کیا۔ "میں یہ تمہاری امی اور زرغونہ کے لیے کچھ تحائف لائی ہوں۔ جاتے ہوئے یہ ساتھ لیتے جانا اور ہاں اپنی امی اور زرغونہ سے میرا اور حنا کا سلام کہنا۔ زرغونہ کے لیے تحائف حنا نے بھجوائے ہیں۔"

”آنٹی! اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟ مفت میں اتنا خرچ کر ڈالا؟“

وہ بولی۔” بیٹے! تم پٹھانوں کی طرح ہم جنوبی پنجاب والے بھی مہمانوں کو خالی ہاتھ رخصت نہیں کرتے۔ یہ ہمارے کلچر کا حصہ ہے۔“

”پھر بھی آنٹی یہ بہت زیادہ ہیں۔ بابا جان محسوس کریں گے۔“میں نے اعتراض کیا۔

”وہ اعتراض کریں تو کہنا کہ یہ اُن کی بہن خدیجہ نے بھجوائے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تم پر غصہ نہیں کریں گے۔“

”ٹھیک ہے آنٹی جیسے آپ کی مرضی۔“میں نے اُس کے ہاتھ سے شاپنگ بیگ لے لیے۔

اس کے بعد میں نے آنٹی سے اجازت طلب کی تو اُس نے ایک ماں کی طرح مجھے بے شمار دعاؤں کے سائے میں رخصت کر دیا۔ راشد نے مجھے بس اسٹاپ، ڈراپ کیا، میرے لیے ایک کوسٹر میں سیٹ بک کرائی اور پھر ٹکٹ میرے حوالے کرتے بولا۔

”گاڑی کی روانگی میں ابھی کچھ وقت باقی ہے۔ میں یہ وقت ضرور تمہارے ساتھ گزارتا لیکن مجھے حنا کو کالج سے پک کرنا ہے۔ دیر ہوگئی تو وہ پریشان ہوگی۔“

”میں کوئی بچہ نہیں ہوں یار۔“میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔”تم جاؤ، حنا کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ میں چلا جاؤں گا۔“

”اوکے۔“وہ مجھ سے الوداعی معانقہ کرتے ہوئے بولا۔”گھر پہنچتے ہی مجھے کال کر دینا۔

”بے فکر رہو ضرور کروں گا۔“

اس کے بعد وہ مجھے خدا حافظ کہتے ہوئے رخصت ہو گیا۔ میں جا کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی کوسٹر کی تمام سیٹیں پُر ہوگئیں۔ ڈرائیور نے اسٹیرنگ سنبھالا اور گاڑی آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔ کشادہ روڈ پر پہنچتے ہی گاڑی کی رفتار بڑھنے لگی۔ پشاور شہر سے نکلتے ہی ڈرائیور نے گاڑی کرم ایجنسی کی طرف جانے والی سڑک پر ڈال دی۔ میرا گاؤں کرم ایجنسی سے آگے مغرب کی جانب تھا۔ وہاں سے افغانستان کی سرحد نزدیک ہی تھی، جہاں حق و باطل کا معرکہ اپنے آخری مراحل میں تھا اور باطل ہمیشہ کی طرح ذلت اُٹھانے کے بعد راہِ فرار

اختیار کرنے والا تھا۔

ظہر کے وقت بخیر و عافیت میں اپنے گھر پہنچ گیا۔ بابا جان اُس وقت گھر میں موجود نہیں تھے۔ مہردل بھی نہیں تھا تاہم مور جان اور زرغونہ نے میرا والہانہ استقبال کیا اور مجھ سے سفر کے احوال پوچھنے لگیں۔ جب اُنھوں نے آنٹی خدیجہ کے دیے ہوئے تحائف دیکھے تو زرغونہ کے چہرے پر خوشی کے رنگ بکھر گئے مگر مور جان قدرے پریشان ہو کر مجھ سے بولیں۔ ''شیر دل! یہ تحائف تمہارے بابا جان کو اچھے نہیں لگیں گے۔ وہ ناراض ہو جائیں گے۔ انھیں لانے کی کیا ضرورت تھی؟''

میں نے کہا۔ ''مور جان! یہ میں اپنی مرضی سے نہیں لایا بلکہ آنٹی خدیجہ نے زبردستی مجھے تھمائے ہیں، میں کیا کرتا؟''

''تم اُسے اپنے بابا جان کے متعلق بتا دیتے ناں کہ.........''

''بابا جان کو میں منا لوں گی۔'' زرغونہ نے مور جان کی بات کاٹی۔ ''آپ کیوں فکر کرتی ہیں؟''

''بہتر ہوگا انھیں کہیں چھپا دو۔'' مور جان نے تشویش زدہ انداز میں جواب دیا۔

''کیوں چھپا دیں؟'' زرغونہ مچلی۔ ''کیا بھائی چوری کر کے یا کسی سے چھین کر لائے ہیں؟''

مور جان نے کہا۔ ''تم اپنے بابا کو مجھ سے زیادہ جانتی ہو کیا؟''

''ہاں جانتی ہوں کہ بابا جان مجھ سے بے حد پیار کرتے ہیں وہ میری کوئی بات ٹال ہی نہیں سکتے۔''

''چپ رہو۔'' مور جان نے اُسے ڈانٹا۔ ''تمہارے بابا جان ایسی باتیں پسند نہیں کرتے۔ خواہ مخواہ شیر دل کی شامت آ جائے گی۔ وہ ظہر کی نماز پڑھنے گئے ہیں آتے ہی ہوں گے، اس سے پہلے کہ اِن چیزوں پر اُن کی نظر پڑے انھیں کہیں چھپا دو۔''

میں نے کہا۔ ''مور جان! زرغونہ ٹھیک کہتی ہے آپ بابا جان کی فکر بالکل نہ کریں، آنٹی خدیجہ کا پیغام سننے کے بعد مجھے پختہ یقین ہے کہ وہ ان تحائف کا قطعی بُرا نہیں منائیں گے۔''

''اُنھوں نے پہلے کبھی تمہاری بات پر یقین کیا ہے جو آج کریں گے۔''

''اُنھیں یقین کرنا پڑے گا، میں فون پر آنٹی خدیجہ سے اُن کی بات کرا دوں گا۔''

”کیا آج تم نے سچ مچ باپ کے ہاتھوں سے مرنے کا سوچ لیا ہے؟“

”وہ کیوں اور کیسے؟“ میں نے اُلجھ کر پوچھا۔

”کیا تم نے جانتے کہ تمہارے بابا جان انجان عورتوں سے کلام نہیں کرتے؟“ مور جان نے اُلٹا سوال کر دیا۔

میں نے جواب دینے کی بجائے ایک زبردست قہقہہ لگا دیا۔ مور جان نے میری طرف مشکوک انداز میں دیکھا اور پھر پوچھا۔ ”کیا تم نے چرس پی رکھی ہے؟“

”نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں نے آج تک کسی بھی نشیلی چیز کی شکل تک نہیں دیکھی۔“

”تو پھر یوں دانت نکال کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟“

”یہ بات میں آپ کو نہیں بتا سکتا۔“

”کیوں نہیں بتا سکتے؟“ مور جان کو غصہ آ گیا۔

”کیونکہ یہ ایک سیکرٹ ہے اور میں صرف بابا جان کو ہی بتاؤں گا۔“

”کہاں ہے سیگریٹ؟“ مور جان نے چونک کر پوچھا۔

اب کی بار میں نے اور زرغونہ نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا تھا۔ مور جان ہمیں یوں پاگلوں کی طرح ہنستے دیکھ کر چند لمحوں کے لیے تو ہکا بکا رہ گئیں اور پھر ایک دم غصہ ہو کر بولیں۔ ”کیا تم دونوں کا دماغ چل گیا ہے، یوں پاگلوں کی طرح کیوں ہنس رہے ہو کیا میں نے کوئی لطیفہ سنا دیا ہے؟“

”بالکل مور جان! آپ نے ایک دلچسپ لطیفہ سنایا ہے۔“ زرغونہ نے ہنس کر جواب دیا۔ زرغونہ نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی اور وہ ”سیکرٹ“ کا مطلب سمجھتی تھی۔

”آنے دو اپنے بابا جان کو پھر تم سے پوچھتی ہوں۔“ مور جان نے دھمکی دی۔

زرغونہ بولی۔ ”وہ بھی آپ ہی پر ہنسیں گے۔“

”کیوں مجھ پر کیوں ہنسیں گے؟“ مور جان نے آنکھیں نکالیں۔

”کیونکہ آپ سیکرٹ کو سیگریٹ سمجھتی ہیں۔ حالانکہ سیکرٹ کا مطلب ہوتا ہے راز، بھید۔“ زرغونہ نے ہنس

کر جواب دیا۔

''اچھا اچھا......'' مورجان نے کھسیا کر کہا۔ ''اب زیادہ سیانے نہ بنو، چار جماعتیں کیا پڑھ لیں کہ ماں پر ہی رعب جمانا شروع کر دیا۔''

''بھئی کون شاہ بی بی پر ہمارے ہوتے ہوئے رعب جما رہا ہے؟'' باباجان نے بالکل ہی اچانک کمرے میں داخل ہو کر سوال کیا۔

زرغونہ نے کہا۔ ''باباجان! مورجان سیکرٹ اور سیگریٹ کو ایک ہی چیز سمجھتی ہیں۔''

''تو کیا یہ الگ الگ چیزیں ہیں؟'' باباجان نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوال کیا۔

''آپ بھی کمال کرتے ہیں باباجان! سیکرٹ انگریزی میں............''

''انگریزی کا نام مت لو۔'' باباجان نے ڈانٹ کر زرغونہ کی بات کاٹی اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ ''شیر دل! تم کب پہنچے ہو؟''

''ابھی ابھی پہنچا ہوں باباجان۔'' میں نے سعادت مندی سے کہا اور پھر آگے بڑھ کر باباجان کے گلے لگ گیا۔

''تمہارے جانے کے بعد تمہاری بہت یاد آئی تھی یار۔'' وہ میری پشت سہلاتے ہوئے پیار بھرے انداز میں بولے۔ ''اتنے دن لگانے کی کیا ضرورت تھی؟''

''چند ہی تو دن لگائے ہیں باباجان۔''

''میرے لیے تو یہ چند دن بھی بہت تھے یار۔'' اُنھوں نے مجھے بھینچ کر چھوڑ دیا۔

باباجان کا اتنا پیار پا کر میرے آنکھوں سے خوشی کے آنسو چھلکنے لگے۔ مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ مجھ سے اس قدر پیار کرتے ہیں۔ زندگی میں پہلی بار میں نے باباجان کو اس طرح جذباتی ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں تو اُنھیں بچپن ہی سے ایک سنگدل انسان سمجھتا آ رہا تھا۔ اُس دن پہلی بار مجھے معلوم ہوا کہ اکثر باپ دیکھنے میں بے شک اپنی اولاد کے لیے پتھر دل نظر آتے ہیں مگر اندر سے وہ مکھن کی طرح نرم و ملائم ہوتے ہیں۔ دھوپ میں رکھی برف کے مانند ایک پل میں پگھل کر پانی بن جاتے ہیں۔ اُس روز مجھے اپنے باباجان پر بے حد پیار آیا تھا، اتنا کہ شاید میں بتانا بھی چاہوں تو بھی نہ بتا سکوں۔ شاید مجھے لفظ ہی نہ ملیں اپنے باباجان کی تعریف بیان کرنے کے

لیے، بالکل اُس بچے کی طرح جسے ماں کی تعریف پر مضمون لکھنے کے لیے تیس منٹ کا وقت دیا گیا تھا مگر اُس نے صرف ایک جملہ لکھ کر پیپر ماسٹر جی کو پکڑا دیا تھا۔ ماسٹر نے جب پیپر پر نظر ڈالی تو لکھا تھا۔ ''میری ماں کی تعریف بیان کرنے کے لیے تیس منٹ بہت کم ہیں۔''

''تم رو رہے ہو بیٹے؟'' بابا جان نے میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر پوچھا۔

''یہ.........یہ تو خوشی کے آنسو ہیں بابا جان۔'' میں آنسو صاف کرتے ہوئے مسکرایا۔ ''دراصل آپ کا پیار دیکھ کر ایسے ہی دل بھر آیا تھا۔''

''یہ تو تھوڑا سا پیار ہے یار! جب تم مہردل کی طرح بندوق سے کھیلنے لگو گے تو تب دیکھنا میں تم سے کتنا پیار کرتا ہوں؟''

''بس میرے لیے اتنا پیار ہی کافی ہے بابا جان۔'' میں نے جھٹ سے جواب دیا اور بابا جان مجھے گھور کر رہ گئے۔

''یہ سامان کون لایا ہے؟'' اچانک بابا جان نے ٹیبل پہ رکھے شاپنگ بیگ دیکھ کر سوال کیا۔

''یہ تحائف ہیں اور آنٹی خدیجہ نے زرغونہ اور مور جان کے لیے دیے ہیں۔''

''یہ خدیجہ کون ہے؟'' بابا جان اپنے اصل روپ میں آگئے۔

''خدیجہ آنٹی راشد کی ماں ہیں بابا جان۔'' میں نے بتایا۔

''راشد کی ماں کے ساتھ ہمارا کیا تعلق ہے؟ دوستی راشد اور تمہارے بیچ ہے اور تحائف زرغونہ اور اُس کی ماں کے لیے بھجوائے جا رہے ہیں.....کیوں؟ تم میں عقل ہے کہ نہیں؟ جس نے جیسا کہا بس مان لیا جاہل کہیں کے! کیا تم اپنے باپ دادا کی روایات پسِ پشت ڈال چکے ہو؟''

''بابا جان! اس میں میری کوئی غلطی نہیں ہے۔ اُنھوں نے یہ تحائف مجھے زبردستی تھمائے ہیں۔'' میں نے اپنی صفائی پیش کی۔

''اور تم اُٹھا کر لے آئے، تم میں شرم ہے کہ نہیں؟''

''آپ اُن سے خود بات کرلیں۔'' میں نے جیب سے موبائل فون نکالتے ہوئے کہا۔ ''اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔''

''دُور ہو جاؤ میری نظروں سے۔'' وہ گرجے۔ ''ورنہ مار مار کر کھال اُدھیڑ ڈالوں گا۔''

''آپ ایک بار اُن سے بات کرلیں پھر بے شک میری کھال اُتار دینا۔'' میں نے آنٹی خدیجہ کا نمبر ملاتے ہوئے سیل فون کان سے لگا لیا۔

تیسری بیل پر آنٹی نے کال ریسیو کرتے ہوئے ''ہیلو'' کہا تو میں نے فون کا اسپیکر آن کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''آنٹی! بابا جان آپ کے تحائف دیکھ کر غصہ ہو رہے ہیں۔ اُن سے بات کر کے میری پوزیشن کلیئر کریں۔''

''اوکے اُنھیں فون دیں۔''

''جی اچھا......دیتا ہوں۔'' آنٹی کو جواب دے کر میں نے فون بابا جان کی طرف بڑھایا۔ ''یہ لیں......وہ آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔''

''السلام علیکم خان لالہ!'' فون کے اسپیکر سے خدیجہ آنٹی کی پُر مسرت آواز اُبھری اور بابا جان جو فون لینے سے کترا رہے تھے، خدیجہ آنٹی کے منہ سے ''لالہ'' کا لفظ سن کر فون لینے پر مجبور ہو گئے۔ دراصل بابا جان کا کوئی بہن بھائی نہیں تھا اور آج زندگی میں پہلی بار کسی نے اتنے پیار سے اُسے لالہ کہا تھا اور وہ بھی ایک عورت نے، خوشی بابا جان کے چہرے سے پھوٹ رہی تھی۔

''وعلیکم السلام بہن جی! کیسا اے تم؟'' بابا جان نے اُن کے سلام کا جواب دیتے ہوئے گلابی اُردو میں پوچھا۔

''میں تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں لالہ! آپ سنائیں کیسے ہیں؟'' اسپیکر سے آنٹی کی آواز اُبھری۔

''اَم بی بالکل ٹیک اے، بس امارا اُردو توڑا کمزور اے۔ تم کو سمج تو آتا اے کنا؟''

''لالہ! آپ کی اُردو تو ماشاء اللہ ایک دم فسٹ کلاس ہے۔'' آنٹی نے ہنس کر جواب دیا۔

''نئیں بہن جی! اَم نے کلاس ملاس کوئی نئیں پڑا۔ جب اَم چوٹا تا تو اِدر مسجد میں مولوی صاب سے قاعدہ پڑا تا۔''

آنٹی کا تو پتا نہیں مگر بابا جان کی بات سن کر میری اور زرغونہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔ تب مور جان نے ہمیں غصے

سے گھورتے ہوئے باہر نکل جانے کا اشارہ کر دیا۔ زرغونہ نے مور جان کے اشارے کو نظر انداز کر دیا مگر میں باہر نکل گیا کیونکہ مجھ سے ہنسی روکنا محال ہوا جا رہا تھا۔ بابا جان بے چاری اُردو کے ساتھ وہی سلوک کرتے تھے جو ہماری ایک معروف اداکارہ انگلش کے ساتھ کرتی ہے (نام تو آپ جان ہی گئے ہوں گے)

☆......☆......☆

رات کے کھانے پر بابا جان بار بار آنٹی خدیجہ کی تعریف کر رہے تھے۔ میرے جانے کے بعد نہ صرف زرغونہ نے آنٹی خدیجہ سے بات کی تھی بلکہ مور جان نے بھی اُن سے پشتو میں بات کی تھی۔ ترجمان کے فرائض زرغونہ نے ادا کیے تھے۔ یہ ہماری ایک پنجابی فیملی سے پہلی قرابت داری تھی، جس پر مجھے آج بھی فخر ہے اور مرتے دم تک رہے گا۔ راشد کا خاندان واقعی دلوں میں گھر کرنے کا ہنر جانتا تھا۔ ہم سب کافی دیر تک انگیٹھی کے گرد بیٹھے آگ تاپتے رہے اور راشد کے خاندان کے بارے میں گفتگو کرتے رہے، اس کے بعد سونے کے لیے اپنے اپنے کمروں میں چل دیے۔

مجھے چونکہ سفر کی تھکاوٹ تھی اس لیے بستر پر لیٹتے ہی نیند آ گئی۔ عالم نیند میں نجانے کب میں خوابوں کے سفر پر نکل گیا مجھے خبر ہی نہ ہو سکی۔ وہی سرسبز و شاداب وادی تھی، وہی نظارے، وہی پرندے اور تتلیاں تھیں۔ چشمہ بھی اُسی روانی کے ساتھ بہہ رہا تھا مگر وہ جو منظروں کی جان تھی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں بوکھلائے ہوئے انداز میں چشمے کنارے دوڑتا پھر رہا تھا اور چاروں طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے میری کوئی بہت ہی قیمتی چیز کھو گئی ہو۔ ہاں وہ واقعی دنیا بھر کے خزانوں سے بھی میرے لیے زیادہ قیمتی تھی۔ ایک ایک لمحہ مجھ پر قیامت بن کر گزر رہا تھا، وقت تھا کہ جیسے ٹھہر سا گیا ہو۔ میری نگاہیں اُن پھول دار پودوں پر جمی ہوئی تھیں جن کے عقب سے وہ نمودار ہوا کرتی تھی۔ اُس کا ملول و افسردہ چہرہ میری نظروں میں گھوم رہا تھا۔ اسی عالم میں نجانے کتنا ہی وقت گزر گیا جب وہ مجھے آتی ہوئی دکھائی دی۔ میری نظریں اُس پر جم کر رہ گئیں، آج وہ خلاف معمول تیز تیز چل رہی تھی مگر چال کی نزاکت و ناز آفرینی وہی تھی۔ چشمے کے کنارے پہنچ کر وہ رک گئی۔ اُس نے نگاہیں اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ آج اُس کے چہرے پر رنج و ملال کے آثار نہیں تھے۔ بالکل بے تاثر سا چہرہ تھا۔ ایسے ہی وقت میں نے بولنے کی کوشش کی مگر ہمیشہ کی طرح ناکامی ہوئی۔ اپنی پوری توانائی صرف کرنے کے باوجود میں منہ سے

ایک لفظ بھی نہ نکال سکا۔

وہ چند لمحے وہیں ٹھہر کر اُسی طرح بے تاثر نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی اور پھر بالکل غیر متوقع طور پر چشمے کے پانی میں سے گزرتی ہوئی میرے روبرو پہنچ کر رک گئی۔ میں نے دوبارہ لب کشائی کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا، میری زبان جیسے تالو سے چپک کر رہ گئی تھی۔ مجھ پر بے بسی کی سی کیفیت طاری تھی اور وہ بے تاثر انداز میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اچانک اُس کے بے تاثر چہرے پر حقارت کے تاثرات پوری شدت کے ساتھ نمودار ہوئے، مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے زہر آلود خنجر میرے دل میں گھونپ دیا ہو۔ وہ جسے میں نے محبت کی دیوی کا مقام دے رکھا تھا اُس کے چہرے پر میرے لیے نفرت تھی اور وہ بھی بے پناہ۔ اُس کی غزالی آنکھیں جیسے شعلے اُگل رہی تھیں۔ یہ منظر میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ میں نے نظریں جھکا دیں، ایسے ہی وقت مجھے اُس کے مرمریں شفاف ہاتھ نظر آنے لگے۔ اُس نے ہاتھوں میں ایک کوئی ڈبہ نما چیز اُٹھا رکھی تھی جس کے گرد ایک ریشمی رومال لپٹا ہوا تھا۔ چند لمحے وہ مجھے حقارت سے گھورتی رہی پھر ہاتھ میں پکڑا ہوا ڈبہ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے بلا جھجک ڈبہ لے لیا مگر قوتِ گویائی نہ ہونے کے سبب اُس سے کوئی سوال نہ کر سکا۔ اُس نے بھی ڈبے کے متعلق کچھ نہ بتایا۔ کچھ دیر وہ ٹھہری رہی پھر جیسے آئی تھی ویسے ہی واپس روانہ ہو گئی۔

اُس کے جانے کے بعد میں نے ڈبہ کھول کر چیک کیا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے مجھے سرِ بازار ننگا کر دیا ہو۔ ڈبے میں کانچ کی رنگ برنگی چوڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ احساسِ ذلت ورسوائی سے میں پتھر کا بت بن کر رہ گیا۔ میں اب ”میں“ نہیں رہا تھا بلکہ محض ایک زندہ لاش تھا۔ جسے میں نے خود سے بڑھ کر چاہا تھا وہی میری مردانگی کا مذاق اُڑا رہی تھی۔ یہ ستم نہیں تھا تو اور کیا تھا؟ ایسی بے بسی بھلا کب کسی نے دیکھی ہوگی کہ ستم گر سے شکوہ بھی نہ کیا جا سکے؟ میں اسی غم ویاس کی کیفیت میں تھا جب اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں نائٹ بلب کی نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ مجھ پر بدستور ذلت ورسوائی کا احساس طاری تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ ابھی اُٹھ کر جیپ نکالوں اور پشاور پہنچ کر صمد یار خان کو نشانِ عبرت بنا دوں۔ اُس کے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے چیل کوؤں کو کھلا دوں لیکن وہ کہتے ہیں ناں کہ کرنے اور سوچنے میں بہت فرق ہوتا ہے، سوچ کسی کی گرفت میں نہیں

آتی مگر عمل سب کی نظروں میں ہوتا ہے۔ سوچنے کے لیے ہمت درکار نہیں ہوتی لیکن عمل کرنے کے لیے پارہ صفت دل چاہیے ہوتا ہے۔ دل تو میرے پاس بھی تھا اور ہمت کی کمی بھی نہیں تھی۔ بس مجھے کسی کا خون بہانے سے نفرت تھی۔ میں امن پسند تھا اور امن پسند ہی رہنا چاہتا تھا مگر لگتا تھا کہ اب میں اپنے اس ارادے پر قائم نہیں رہ سکوں گا۔ اچانک ایک خیال برق کے کوندے کی طرح میرے ذہن میں لہرایا اور میں جیسے سُن ہو کر رہ گیا۔ برق کا کوندا بن کر میرے ذہن میں لہرانے والا یہ خیال بلاشبہ اہم بلکہ بڑی حد تک حیرت انگیز تھا۔ ایسا اکثر فلموں اور ڈراموں میں تو ہوتا رہتا ہے مگر عملی زندگی میں ایسا ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ وہ نامعلوم دوشیزہ میں جسے خوابوں میں دیکھتا رہتا تھا، اُسے آخر یہ بات کس طرح معلوم ہو گئی تھی کہ میں نے مرد ہو کر چوڑیاں پہننے کی ذلت جھیلی ہے؟ شاید وہ بھی میری طرح مجھے اپنے خوابوں میں دیکھتی رہتی تھی۔ میں جوں جوں اس معاملے کے متعلق سوچتا گیا میری اُلجھن بڑھتی گئی۔ وہ ایک عرصے سے میرے خوابوں میں آ رہی تھی مگر میں نے اُس کے چہرے پر اپنے لیے حقارت کے تاثرات کبھی نہیں دیکھے تھے۔ معاملہ واقعی پُراسرار شکل اختیار کر چکا تھا۔ مجھے اس معاملے میں کسی صاحبِ بصیرت انسان کی رہنمائی درکار تھی، جو خوابوں کی تعبیر و اسرار کے علم پر دسترس رکھتا ہو اور وہ بھی شرعی لحاظ سے، مگر مسئلہ کسی ایسے شخص کو تلاش کرنا تھا اور اُس سے بھی بڑا مسئلہ اُس راز کا افشا تھا جس کے متعلق میرے علاوہ صرف راشد جانتا تھا یا پھر صمد یار خان اور اُس کے گارڈز۔ ہر شخص کی طرح مجھے بھی اپنی عزتِ نفس عزیز تھی۔ رات کا بقیہ حصہ میں نے انھیں سوچوں سے لڑتے ہوئے گزار دیا۔

صبح سویرے میں نے ناشتا کیا اور پھر ایسے ہی گھومنے پھرنے کے لیے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ دراصل میرا ارادہ راشد سے بات کرنے کا تھا۔ وہی اس سلسلے میں مجھے کوئی مناسب مشورہ دے سکتا تھا۔ ہمارا گاؤں چاروں طرف سے پہاڑوں میں گھرا ہوا تھا۔ یہ پہاڑ غیر آباد اور سنگلاخ تھے۔ ان پر سبزے کا نام ونشان بھی نہیں تھا تاہم گاؤں کے اردگرد ایک وسیع وعریض میدانی علاقہ بھی تھا، جہاں کھیتی باڑی کی جاتی تھی۔ یہ وسیع وعریض کھیت ہماری ملکیت تھے۔ بابا جان چونکہ گاؤں کے سردار تھے اس لیے اُن کے پاس عام لوگوں کی نسبت زیادہ اراضی تھی۔ یہ اراضی بابا جان اور مہر دل خان مل کر کاشت کرتے تھے۔ سال بھر میں اتنی فصل ہو جاتی تھی جو ہماری ضروریات کے لیے کافی تھی، اس لیے بابا جان مجھے کہیں بھی ملازمت کرنے کی

اجازت نہیں دے رہے تھے۔ جب کہ مجھے ملازمت کرنے کا بہت شوق تھا۔ میں نے ایم اے تک تعلیم اسی شوق کی خاطر حاصل کی تھی۔

گاؤں کی گلیوں میں سے ہوتا ہوا میں کھیتوں میں پہنچ گیا جہاں چاروں طرف سرسوں کے زرد پھول کھلے ہوئے تھے۔ کھیتوں سے آگے غربی پہاڑ پر سورج کی ابتدائی کرنیں بہت بھلی معلوم ہو رہی تھیں۔ پہاڑ کی چوٹیاں دھوپ میں نہائی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ اس پہاڑ کے دوسری جانب حق و باطل کا معرکہ اب آخری مراحل میں تھا۔ باطل اپنی ساری قوت میدان جنگ میں جھونکنے کے باوجود اپنے حواریوں کیساتھ اب راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہو چکا تھا۔ افغانستان کے بوریا نشینوں نے ایک بار پھر قرونِ اولیٰ کی یاد تازہ کر دی تھی۔

بقول شاعرِ مشرق۔

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی

یا بندہ صحرائی یا مردِ کوہستانی

چند منٹ تو میں قدرت کے حسین نظاروں سے لطف اندوز ہوتا رہا اور پھر جیب سے موبائل فون نکال کر راشد کو کال کرنے لگا۔ چوتھی بیل کے بعد مجھے راشد کی نیند میں ڈوبی ہوئی ''ہیلو'' سنائی دی۔

''شرم کرو شرم۔'' میں نے ریسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''صبح کے دس بجنے والے ہیں اور تم ابھی تک بستر پہ اینٹھ رہے ہو؟''

''ابے بدبخت پٹھان! میں رات کو دیر سے سویا تھا۔'' اُس نے خمار آلود لہجے میں جواب دیا۔

''کیوں دیر سے سوئے تھے......کیا پیٹ میں درد تھا؟''

''انجلینا جولی کی نئی فلم دیکھی تھی اور.........''

''اور اب انجلینا جولی کے خواب دیکھ رہے ہو.......ہے ناں؟'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے طنزاً پوچھا۔

''میں پٹھان نہیں ہوں بیٹے۔'' اُس نے جوابی چوٹ کی۔ ''جو رسائی سے باہر ہو اُس کے خواب دیکھنے والے اکثر احمق ہوتے ہیں۔''

”مطلب تم ان ڈائریکٹ پٹھانوں کو احمق ثابت کر رہے ہو؟“

”ہاہاہا........ثابت......“ اُس نے قہقہہ لگایا۔”ارے! ثابت تو اُسے کیا جاتا ہے جس میں کوئی شک ہو جب کہ تم لوگوں کی حماقت تو روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔“

میں نے کہا۔”ذرا باباجان کے سامنے تو یہ بات کہہ کر دیکھو۔“

”مجھے کنوارا مرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔“ اُس نے دوبارہ قہقہہ لگایا اور پھر ایک دم سنجیدگی سے پوچھا۔”میری نیند خراب کرنے کی وجہ؟“

”یار! میں نے ایک عجیب وغریب خواب دیکھا ہے۔تم سنو گے تو یقین نہیں کرو گے۔“

”پھر کیا دیکھ لیا تم نے؟“ اُس نے دل چسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

میں نے نہایت ہی تفصیل کے ساتھ اُسے گزشتہ شب دیکھے ہوئے خواب کے متعلق بتا دیا۔

”سچ کہہ رہے ہو؟“ پوری تفصیل سننے کے بعد اُس نے بے یقینی کے عالم میں سوال کیا۔

”مجھے بھلا جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں نے جو کچھ بھی دیکھا تمھیں بتا دیا کہ شاید تم اس سلسلے میں میری کوئی ہیلپ کر سکو۔“

”کیسی ہیلپ؟“ اُس نے قدرے متعجب ہو کر پوچھا۔

”میں کسی ایسے شخص سے ملنا چاہتا ہوں جو خوابوں کی تعبیر کے بارے میں کچھ دسترس رکھتا ہو۔“

”میرے خیال میں تو تمھیں کسی ماہرِ نفسیات سے ملنے کی ضرورت ہے۔“

”میں سنجیدہ ہوں یار۔“

”میں بھی مذاق نہیں کر رہا۔“ اُس نے جواب دیا۔

”میں اُس لڑکی کو ڈھونڈنا چاہتا ہوں۔“

”تو ڈھونڈو......منع کس نے کیا ہے؟“

”مجھے تمہارا ساتھ چاہیے۔“ میں نے ریکوئسٹ کی۔

”میں آوارہ گردی کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔تم کوئی اور ساتھی تلاش کر لو۔“ اُس نے جان چھڑانے

والے انداز میں جواب دیا۔

''راشد! پلیز یار.......مجھے سمجھنے کی کوشش کرو، میں بہت پریشان ہوں۔اس خواب نے میری بھوک اور پیاس اُڑادی ہے۔''

''ابے او.....چھ فٹ کے احمق پٹھان! کچھ عقل سے کام لو، تلاش اُسے کیا جاتا ہے جس کا کوئی اتا پتا معلوم ہو اور وہ تو ویسے بھی ایک لڑکی ہے۔ہم کس سے اُس کے متعلق پوچھیں گے؟اور جس سے پوچھیں گے کیا وہ ہمیں پاگل ڈکلیئر نہیں کرے گا؟''

''کچھ سوچو یار! ورنہ میں خودکشی کرلوں گا۔''میں نے مایوسی کے عالم میں جواب دیا۔

وہ چپ ہوگیا شاید کچھ سوچ رہا تھا یا پھر میرے لیے کوئی نئی گالی ایجاد کر رہا تھا۔سیل فون میرے کان سے لگا ہوا تھا اور میں اُس کے جواب کا منتظر تھا۔

''تم ایسا کرو کہ پشاور آجاؤ مجھے ایک ترکیب سوجھ گئی ہے۔ہوسکتا ہے کہ یہ ترکیب اُس لڑکی کی تلاش میں کارگر ثابت ہو۔''قدرے توقف کے بعد مجھے اُس کی پرجوش آواز سنائی دی۔

''اوکے میں آج ہی پشاور پہنچ جاتا ہوں۔''میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ جواب دیا۔

''اوکے گڈ بائے۔''کہہ کر اُس نے رابطہ منقطع کر دیا اور میں تیزی سے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔



''تم کہیں سچ مچ پاگل تو نہیں ہوگئے ہو؟''باباجان نے مجھے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

''باباجان! وہ کیا ہے کہ راشد کا ایک ضروری کام تھا اس لیے مجھے اُس نے پشاور بلایا ہے۔''میں نے جھوٹ کا سہارا لیا۔

''کیسا ضروری کام.......جو تمہارے علاوہ کوئی دوسرا نہیں کرسکتا؟''باباجان نے پوچھا۔

''یہ تو مجھے اُس نے نہیں بتایا۔''

''کیوں نہیں بتایا.......میری اُس سے بات کراؤ موبائل فون پر۔''باباجان نے حکم دیا۔

میں نے کہا۔''بہت مشکل ہے باباجان! آپ کی اور راشد کی بات نہیں ہوسکتی۔''

"کیوں نہیں ہوسکتی کیا میں گونگا ہوں یا پھر راشد کی زبان پر چھالے پڑ چکے ہیں؟"

"وہ.........دراصل بات یہ ہے بابا جان کہ راشد پشتو زبان نہیں بول سکتا جب کہ آپ کی اُردو راشد کے پلے نہیں پڑے گی.......تو.......تو ایسی صورت حال میں بات کرنے کا کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔" میں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

"تیری اُردو کی ایسی کی تیسی۔" وہ ایک دم بگڑ گئے۔ "تم اُس کا نمبر ملاؤ میں بات کرلوں گا۔"

اب بابا جان کی بات کرانا ضروری تھا ورنہ وہ مجھے کبھی بھی پشاور جانے کی اجازت نہ دیتے۔ سو میں نے جیب سے موبائل فون نکالا اور بذریعہ ایس ایم ایس راشد کو مطلع کردیا کہ بابا جان سے کیا کہنا ہے۔ اس کے بعد میں نے راشد کا نمبر ملایا اور فون بابا جان کو تھما دیا۔

"کیا حال اے بچے؟" رابطہ قائم ہوتے ہی بابا جان نے اُونچی آواز میں پوچھا۔

دوسری جانب سے راشد نے پتا نہیں کیا کہا کہ بابا جان ہنستے ہوئے بولے۔ "ٹھیک اے بچے! اَم اس کوابی بیجتا ہوں، تم پھکر نئیں کرو۔"

راشد نے پھر کچھ کہا تو بابا جان بولے۔ "اَم کو تم پہ اعتبار اے بچے! کہ تم اَم سے جوٹ نئیں بولے گا۔"

اس کے بعد بابا جان چند لمحے راشد سے اُس کے اہلِ خانہ کے متعلق گلابی اُردو میں سوال و جواب کرتے رہے۔ پھر فون میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے فون کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ "فکر نہ کرو سب ٹھیک ہوجائے گا۔ میں آج شام تک پہنچ جاؤں گا۔"

"ایک بار پہنچ تو جا بیٹے پھر تجھے بتاتا ہوں.........ہر بار قربانی کا بکرا بنانے کے لیے کیا تجھے میں ہی ملا ہوں؟" اُس نے غصے کا اظہار کیا۔

"سوری یار! اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔"

"بکواس بند کر۔"

"اوکے بائے۔" میں نے جلدی سے کہا اور رابطہ منقطع کردیا۔

ایک گھنٹے کے بعد میں اپنی جیپ میں سوار پشاور کی طرف روانہ تھا۔ جس وقت میں پشاور شہر میں داخل ہوا

اُس وقت عصر کی اذان ہو رہی تھی۔ کہیں رکنے کی بجائے میں سیدھا راشد کے گھر پہنچ گیا۔ راشد اُس وقت گھر میں موجود نہیں تھا۔ پروفیسر صاحب بھی غیر حاضر تھے۔ آنٹی خدیجہ اور حنا گھر میں موجود تھیں۔ چونکہ اُنھیں میری آمد کے بارے میں معلوم تھا اس لیے حیرت کا اظہار کرنے کی بجائے وہ مجھ سے بابا جان، مورجان اور زرغونہ کی خیریت دریافت کرنے لگیں۔ میں نے اُنھیں سب کی خیریت کے متعلق بتایا تو آنٹی بولی۔ ''تم بیٹھو میں ذرا کچن میں مصروف ہوں ابھی کام نمٹا کر آتی ہوں۔''

''اوکے آنٹی........راشد کا کوئی پتا؟'' میں نے سوال کیا۔

''وہ ذرا مارکیٹ تک گیا ہے بس آتا ہی ہوگا۔ تب تک حنا تمھیں کمپنی دے گی۔'' یہ کہہ کر آنٹی کمرے سے باہر نکل گئی

جب کہ میں حنا کی طرف متوجہ ہو گیا جو مسکراتی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

''اور سناؤ شیر دل صاحب! گاؤں میں تو سب ٹھیک ٹھاک ہے ناں؟'' حنا نے یوں مسکرا کر پوچھا جیسے برسوں سے میری شناسا ہو۔

''ہاں۔'' میں نے نظریں جھکاتے ہوئے مختصر سا جواب دیا۔

''راشد بھائی بتا رہا تھا کہ آپ کو عجیب وغریب خواب آتے رہتے ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟'' حنا کا یہ سوال میرے لیے بالکل غیر متوقع تھا۔ میرا دل بے اختیار دھڑک اُٹھا۔ وہ میرے دوست کی بہن تھی اور میرے لیے بہن جیسی ہی تھی۔ میں اُس کے اس سوال کا جواب دینے کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔ سو چپ رہا مگر شاید اُس نے چپ رہنا نہیں سیکھا تھا۔ جھٹ سے بولی۔ ''آپ تو لڑکیوں کی طرح شرما رہے ہیں۔ کیا میں نے کچھ غلط پوچھ لیا ہے؟''

''حنا!'' میں نے ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ موضوع نامناسب ہے ہم کوئی اور بات کرتے ہیں........چلو تم مجھے اپنے کالج کے بارے میں بتاؤ، تمھاری اسٹڈی کیسی جا رہی ہے؟ کبھی کوئی پوزیشن لی ہے کہ نہیں اور تمھارا فیورٹ سبجیکٹ کون سا ہے، کلر اور جیولری کون سی پسند کرتی ہو؟''

''تم شکل سے اتنے گھامڑ تو نہیں لگتے۔'' وہ ایک دم ''آپ'' سے ''تم'' پر آگئی۔ ''جتنا بننے کی کوشش کر رہے ہو۔''

میرے کانوں میں یک دم خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ اُس کے ارادے کچھ نیک نظر نہیں آتے تھے۔ ویسے بھی وہ جن نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی میں اُن سے ناواقف نہیں تھا۔ وہ نوجوان تھی، بے حد خوب صورت اور دل کش تھی۔ اگر میں پہلے سے کسی کی زلف کا اسیر نہ ہوتا تو شاید اُس کی بے تکلفی کو اپنے لیے اعزاز سمجھتا۔

میں نے کہا۔ ''دیکھو حنا! میں تمہارے بھائی کا دوست ہوں اور اس ناتے میں تمہیں ایک بھائی کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ پلیز تم............''

''مگر میں تمہیں بھائی نہیں سمجھتی......اب کیا کہو گے؟'' اُس نے قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔

''تمہارے سمجھنے یا نہ سمجھنے سے کیا ہوگا جب کہ میں تمہیں دل سے بہن سمجھتا ہوں۔'' پہلی بار میں نے قدرے سخت انداز میں جواب دیا۔

''کیا وہ خوابوں والی مجھ سے زیادہ خوب صورت ہے؟'' اُس نے بُرا مانے بغیر جواب دیا۔

''بات خوب صورتی اور بد صورتی کی نہیں ہے حنا! میں اُسے چاہتا ہوں اس لیے اُس کی تلاش میں بھٹک رہا ہوں۔''

''منزل سے کنی کترا کر نکل جانے والے عمر بھر بھٹکتے ہی رہتے ہیں اور پھر کیا پتا جسے تم ڈھونڈتے پھر رہے ہو وہ حقیقت میں کہیں ہے بھی کہ نہیں؟''

''اُس نے اپنے ہونے کا ثبوت مجھے دے دیا ہے۔''

''خواب میں ناں؟'' اُس کے انداز میں طنز تھا۔

''ہاں خواب میں اور اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ وہ اسی دنیا میں کہیں موجود ہے۔ بس اُسے تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔'' میں نے اُس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے جواب دیا۔

''خوابوں کے پیچھے بھاگنے کی بجائے حقیقت کو قبول کیوں نہیں کرتے.........مجھ میں کیا کمی ہے؟''

''تم کوئی کمی نہیں ہے بلکہ سچ پوچھو تو تم اُس خوابوں والی سے کہیں زیادہ خوب صورت ہو لیکن میں مجبور ہوں مجھے اُس کے علاوہ کچھ بھائی نہیں دیتا ورنہ خدا کی قسم تمہاری رفاقت کو میں اپنی خوش قسمتی سمجھتا۔''

''شیر دل! تم سرابوں کے پیچھے بھاگ رہے ہو۔ یاد رکھنا ایک دن تم پچھتاؤ گے۔''

اتنا کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

☆......☆......☆

میں حیران و پریشان بیٹھا تھا کہ آنٹی چائے کے ساتھ دیگر لوازمات لیے کمرے میں داخل ہوئی۔

''حنا کدھر ہے بھئی!'' وہ سنٹرل ٹیبل پر ٹرے سجاتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

''پتا نہیں آنٹی بغیر بتائے ہی اُٹھ کر چلی گئی۔''

آنٹی بولی۔''تم نے یقیناً اُس کی کسی بات کو جھٹلایا ہوگا ورنہ وہ ایسی نہیں ہے کہ مہمان کو اکیلا چھوڑ کر چل دے؟''

میرے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔آنٹی نے بے خیالی میں کیسا درست اندازہ لگایا تھا۔میں نے اُس کی کسی بات کو نہیں بلکہ اُس کی شخصیت کو جھٹلایا تھا۔عورت اپنی ذات کی نفی اور وہ بھی کسی مرد کے ہاتھوں کبھی بھی برداشت نہیں کرتی۔

''نہیں آنٹی!'' میں قدرے توقف سے بولا۔''ہمارے بیچ ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی، یا پھر شاید انجانے میں میری زبان سے ایسی کوئی بات نکل گئی ہو جو اُس نے مائنڈ کر لی ہو؟''

''تم دونوں کے بیچ کس موضوع پر باتیں ہوئیں ہیں؟'' آنٹی نے سوال کیا۔

''بس ایسے ہی عام سے موضوعات پر.......حالات حاضرہ اور حنا کی اسٹڈی وغیرہ کے متعلق۔'' میں نے نگاہیں چراتے ہوئے جواب دیا۔

آنٹی مسکرائی۔''تمہارا چہرہ تمہارے لفظوں کا ساتھ نہیں دے رہا........سچ بتاؤ تم نے اُس سے کیا کہا ہے؟''

''میں سچ کہہ رہا ہوں آنٹی! پلیز میری بات............''

''تم جھوٹ بول رہے ہو شیر دل۔'' آنٹی نے میری بات کاٹی۔''سچ میں جانتی ہوں مگر تمہاری زبان سے سننا چاہتی تھی۔افسوس کہ تم نے مجھے مایوس کیا۔''

میں نے کہا۔''آنٹی! بچہ اگر ضد کرے تو کیا اُسے کھیلنے کے لیے انگارے دے دینے چاہییں؟''

''بچہ اگر ضد کر کے خوابوں کے پیچھے بھاگ سکتا ہے تو کھیلنے کو انگارے بھی مانگ سکتا ہے.........خیر اس

موضوع پر بعد میں بات کریں گے ابھی تم چائے وغیرہ پی لو۔" آنٹی نے موضوع بدلتے ہوئے کہا اور پھر ایک کپ میں چائے ڈال کر مجھے پیش کر دی۔ سامنے ٹرے میں تین چار پلیٹیں بھی رکھی ہوئی تھیں جن میں بسکٹ، چپس اور نمک پارے وغیرہ سجا کر رکھے گئے تھے۔ میں چائے کے ساتھ ان لوازمات سے بھی انصاف کرنے لگا۔ جب کہ آنٹی تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی گئیں۔

چائے پی کر میں فارغ ہوا تو راشد بھی پہنچ گیا۔ ہم دونوں بغل گیر ہو گئے۔ راشد مجھے بھینچتے ہوئے بولا۔" سوری یار! تمہیں انتظار کی زحمت اُٹھانا پڑی۔ دراصل مجھے مارکیٹ میں اسکول کے زمانے کا ایک دوست مل گیا تھا۔ اُس کے ساتھ باتوں میں وقت کے گزرنے کا پتا بھی نہیں چلا۔"

"کوئی بات نہیں یار دیر سویر تو ہوتی ہی رہتی ہے۔" میں نے دوبارہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔" تمہارا دوست سمجھو میرا بھی دوست ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔" وہ پُر جوش انداز میں بولا۔" وہ بندہ بڑا قابل ہے تمہارے بہت کام آئے گا۔"

"وہ کیسے؟" میں نے متحیر انداز میں سوال کیا۔" کیا وہ خوابوں کی تعبیر بتاتا ہے؟"

"نہیں وہ کمپیوٹر کے ذریعے تصویریں اور گرافکس بنانے میں بہت مہارت رکھتا ہے۔ ہم اُس کے ذریعے خواب والی کی تصویر بنائیں گے اور پھر اپنے اپنے طور پر اُس کو تلاش کریں گے۔"

"ناممکن ہے۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔" وہ کس طرح تصویر بنائے گا؟"

"تم اُسے اس لڑکی کا حلیہ بتاؤ گے باقی کام اُس کا ہے۔ وہ اسکیچ بنائے گا اور پھر اُس میں رنگ بھرے گا۔"

"اوکے اگر یہ بات ہے تو پھر اُس سے مل کر دیکھ لیتے ہیں۔" میں نے رضامندی کا اظہار کیا۔



دوسرے دن میں اور راشد اُس یاسر نامی نوجوان کے ساتھ اُس کے گھر میں موجود تھے۔ یاسر نے گھر میں ایک کمپیوٹر روم بنا رکھا تھا۔ جہاں کمپیوٹر سے متعلق تمام اشیاء موجود تھیں۔ اُس کے پاس بہت ہی دیدہ زیب اور قیمتی پرنٹر تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد یاسر نے ہمارے لیے چائے بنوائی اور پھر مجھ سے خوابوں والی لڑکی کا حلیہ دریافت کرنے لگا۔ اُس کے زیادہ تر سوال آنکھوں، ناک، ہونٹوں، تھوڑی، پلکوں اور بھوؤں سے

متعلق تھے۔ میں اُسے وضاحت کے ساتھ بتاتا رہا اور وہ کاغذ پر نوٹ کرتا گیا۔ چائے سے فراغت کے بعد وہ کمپیوٹر کے سامنے سیٹ سنبھال کر بیٹھ گیا اور میرے بتائے گئے حلیے کے مطابق اسکیچ بنانے لگا۔ لگ بھگ دو گھنٹوں کی محنت کے بعد وہ اسکیچ بنانے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ اسکیچ بڑی حد تک اُس خوابوں والی لڑکی سے مماثل تھا۔ اسکیچ دیکھ کر ہی خواب کے واقعات میرے ذہن میں تازہ ہونے لگے تھے۔

میں نے ستائشی انداز میں کہا۔ ”یاسر صاحب! آپ نے تو کمال کر دیا ہے۔ یہ بالکل ویسی دکھتی ہے جیسے میرے خواب میں آنے والی لڑکی........ کیا بات ہے یار! آپ کی...... مجھے تو تعریف کے لیے لفظ ہی نہیں مل رہے ہیں۔“

وہ فخریہ لہجے میں بولا۔ ”ابھی کہاں کمال ہوا ہے۔ بس آپ دیکھتے جائیں میں کیا کرتا ہوں؟ جب میں اس کا پرنٹ نکالوں گا تو یہ آپ کو بولتی ہوئی محسوس ہوگی۔“

”واؤ......“ راشد بولا۔ ”تم تو واقعی فن کار ہو یار! آج مجھے یقین آگیا ہے ورنہ اس سے قبل تو میں تجھے گھامڑ ہی سمجھتا تھا۔“

”دنیاداری کے معاملے میں، میں اب بھی گھامڑ ہی ہوں۔“ یاسر نے مسکرا کر جواب دیا۔

”پھر تو تمہاری شیر دل کے ساتھ خوب جمے گی۔“ راشد نے قہقہہ لگایا۔ ”یہ بھی تمہاری طرح بس ”لالہ“ ہی ہے۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے لالے دو۔“

”بکواس مت کرو یار!“ میں نے آنکھیں نکالیں۔ ”یاسر کو کام کرنے دو۔“

”او لالے! میں تم دونوں کی دوستی کرا رہا ہوں اور تم بُرا مان رہے ہو؟“

”اب اگر تم نے مجھے لالہ کہا تو میں تمہارے دانت توڑ دوں گا۔“

”میں ثابت کر سکتا ہوں کہ تم لالے ہو۔“ وہ بھی ایک نمبر کا ڈھیٹ تھا۔ ”کیا مہردل تجھے لالہ نہیں کہتا؟“

میں نے کہا۔ ”اُس لالے کا مطلب اور ہوتا ہے۔ اُسے ہمارے ہاں عزت کی علامت سمجھا جاتا ہے اور....“

”اور اِس لالے کو ہمارے ہاں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔“ اُس نے دانت نکالتے ہوئے قطع کلامی کی۔

''اوکے مذاق بہت ہوگیا۔اب مجھے کام کرنے دو۔'' یاسر نے مداخلت کی۔

''تم لگے رہو منا بھائی۔'' راشد نے اُس کی پیٹھ تھپکی۔ ''ہم ذرا بٹیر بازوں کی طرح چونچیں لڑا رہے ہیں........وہ کیا ہے کہ اس طرح پیار بڑھتا ہے۔''

''مگر تم دونوں تو انسان ہو۔'' یاسر نے جواب دیا۔

''تو کیا بٹیر باز انسان نہیں ہوتے؟''

''ہوتے ہیں لیکن چونچیں تو بٹیر لڑاتے ہیں ناں؟''

راشد نے کہا۔ ''تم اپنا کام کرو........بٹیر باز جانیں اور ہم۔''

اسی نوک جھونک کے دوران یاسر نے اسکیچ میں رنگ بھر کر اُسے ایک خوب صورت تصویر کا روپ دے دیا۔میری نگاہیں کمپیوٹر کی اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔یوں لگ رہا تھا جیسے وہ سچ مچ میرے سامنے بیٹھی ہو۔اُس کی خوب صورت سیاہ آنکھوں میں ویسی ہی اُداسی تھی جیسے میں نے یاسر کو بتائی تھی۔بلاشک وشبہ یاسر نے کمال کر دیا تھا۔واقعی وہ اس کام میں ماہر تھا۔مجھے اُس کی تعریف کرنے کے لیے مناسب الفاظ نہیں سوجھ رہے تھے۔پھر بھی میں ممنون انداز میں بولا۔''دوست!آپ کا بہت بہت شکریہ،آپ نے میرا ایک بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا ہے۔میں آج بے حد خوش ہوں۔ایسا لگتا ہے جیسے میں منزل کے بہت قریب پہنچ گیا ہوں۔''

وہ مسکرایا۔''دوست بھی کہتے ہو اور شکریہ بھی ادا کرتے ہو،کیا یہ بات مناسب ہے؟''

''اور تمہیں آپ،جناب جیسے القاب بھی تو دیے جا رہا ہے حالانکہ تم تو ''تم'' کہلانے کے لائق بھی نہیں ہو۔'' راشد نے قہقہہ لگایا۔

یاسر بولا۔''اچھا اب یہ مسخرہ پن چھوڑو،میں تصویر کا پرنٹ نکالنے لگا ہوں۔''

''تو نکالو ناں!میں نے کیا تمہارے ہاتھ باندھ رکھے ہیں۔'' راشد جواب دے کر اپنی تھوڑی کھجانے لگا۔

یاسر نے کمپیوٹر کے ساتھ رکھے ہوئے پرنٹر کو آن کیا اور پھر تصویر کا سائز ایڈجسٹ کر کے اوکے پر کلک کر دیا۔پرنٹر کی مخصوص آواز گونجی اور دوسرے ہی لمحے اُس گم نام حسینہ کی تصویر پرنٹر سے پھسلتی ہوئی باہر آ گئی۔

یاسر نے تصویر اُٹھا کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔''تم اسے چیک کرو میں مختلف سائز میں چند پرنٹ

مزید نکالتا ہوں۔" اس بار اُس نے مجھے بے تکلفی کے ساتھ "تم" کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

میں نے اُس کے ہاتھ سے تصویر لے کر بغور اُس کا جائزہ لیا۔ تصویر واقعی بے حد خوب صورت تھی۔ میرا دل چاہا کہ اُس کے بوسے لینا شروع کر دوں مگر راشد جیسے شریر اور شیطان نما انسان کے سامنے مجھے ایسا قدم اُٹھانے کی ہمت نہ ہو سکی۔

راشد میرے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ "مجھے دکھاؤ........ پپیاں، جھپیاں بعد میں لینا۔"

"بہت خبیث ہو تم۔" میں نے تصویر اُس کی طرف بڑھائی۔

"تم سے تھوڑا سا کم ہوں۔" وہ تصویر لیتے ہوئے بولا اور پھر دیدے پھاڑ کر تصویر کو یوں دیکھنے لگا جیسے ابھی اُسے کھا جائے گا۔

"واہ لالے واہ........ کیا زبردست پیس ہے۔" وہ رال ٹپکانے والے انداز میں بولا۔ "مگر بچاری ہے بہت بدقسمت........ اسے ایک احمق پٹھان کے خوابوں میں نہیں آنا چاہیے تھا۔ پتا نہیں کون ہے بدنصیب؟"

میں نے کہا۔ "نصیب تو اُس بچاری کے پھوٹیں گے جسے تیرے جیسے جوکر کے پلے باندھا جائے گا۔"

"ٹھیک کہتے ہو تم یار۔" یاسر نے بھی میری تائید کی۔ "اس مسخرے کے پلے بندھنے والی بھوکی مر جائے گی۔"

"اوئے گھونچو!" راشد نے آنکھیں نکالیں۔ "تم کس کے ساتھ ہو، اس کے یا میرے؟"

"میں ہمیشہ جیتنے والے کا ساتھ دیتا ہوں۔" یاسر نے مسکرا کر جواب دیا۔

"مطلب تم وطنِ عزیز کے سیاست دانوں کے نقشِ قدم پر چلنا پسند کرتے ہو؟"

"بالکل........ اس میں کیا بُرائی ہے۔" یاسر نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "آدمی کو ہمیشہ اپنا فائدہ سوچنا چاہیے۔"

"لعنت ہے تیری سوچ پر منافقِ اعظم۔"

یاسر مسکرایا۔ "تمہارے پاس گنتی کی نیکیاں ہیں اُنھیں کیوں ضائع کرتے ہو یار؟"

"بکواس بند کرو........ بڑے آئے مولانا منحوس کان پوری کہیں کے۔"

''یہ کون ذات شریف ہے؟'' یاسر نے چڑانے والے انداز میں پوچھا۔

''میرے سامنے بیٹھا ہے وہ گدھا۔''

''یار شرم کرو مہمان ہے تمہارا۔'' یاسر نے میری طرف اشارہ کیا۔ ''یہ کیا سوچے گا ہم لوگ مہمانوں کے ساتھ ایسا سلوک..........''

''سٹوپڈ! میرا اشارہ تمہاری طرف تھا۔'' راشد نے قطع کلامی کی۔ ''شیر دل تو جگر ہے اپنا۔''

اسی ہنسی مذاق کے دوران یاسر نے چند اور تصویریں نکال کر میرے حوالے کر دیں۔ میں نے تصویروں کو چیک کیا اور پھر انھیں ایک لفافے میں ڈال کر ایک طرف رکھ دیا۔ تھوڑا وقت ہم نے مزید یاسر کے پاس گزارا اور پھر اجازت لے کر واپسی کے لیے روانہ ہو گئے۔

☆......☆......☆

''اب کیا ارادہ ہے؟'' راستے میں جیپ ڈرائیو کرتے ہوئے راشد نے سوال کیا۔

''تلاش کرنا ہے اسے۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیسے تلاش کریں گے......ہمارے پاس سوائے ان تصویروں کے اور کیا ہے؟''

''انہی تصویروں کی مدد سے ہم ان شاء اللہ اُسے تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔'' میں نے پُر عزم انداز میں جواب دیا۔

''خوش فہمی ہے تمہاری اتنی بڑی دنیا میں محض ایک تصویر کے سہارے ہم اُسے قیامت تک نہیں ڈھونڈ سکتے۔''

''تو پھر سوچو ہمیں اس سلسلے میں کیا کرنا چاہیے؟'' وہ لمحہ بھر کے لیے سوچوں میں مستغرق ہو گیا۔ جب کہ میں جواب طلب انداز میں اُس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''ہمارے پاس دو راستے ہیں۔'' وہ قدرے توقف سے بولا۔ ''مگر ان دونوں راستوں میں رسک ہے۔''

''کیسے راستے اور کیسا رسک......کچھ پتا تو چلے؟''

''پہلا راستا تو یہ ہے کہ ہم یہ تصویریں انٹرنیٹ پر ڈال دیں، اس طرح ہمیں اُس کا کوئی نہ کوئی کلیو مل جائے گا اور

دوسرا یہ کہ ہم اخبار میں اُس کی گم شدگی کا اشتہار دے دیں مگران دونوں باتوں میں رسک ہے۔انٹرنیٹ پہ اُس کے بدنام ہونے کے سوفی صد چانسز موجود ہیں جب کہ اخبار میں اشتہار دینے کے لیے ہمیں اُس کے نام کی ضرورت پڑے گی۔بغیر نام کے ہم صرف ایک صورت میں اشتہار دے سکتے ہیں۔ہمیں اشتہار میں اُسے پاگل قرار دینا ہوگا۔اس صورت میں ہم اُسے ایک فرضی نام دیں گے اور اشتہار میں یہ لکھوائیں گے کہ وہ پاگل ہونے کی وجہ سے ہمیشہ اپنا نام غلط بتاتی ہے۔" راشد نے تفصیلی جواب دیا۔

"پاگل والا آئیڈیا ٹھیک رہے گا۔" میں نے رائے دی۔

"اس میں بھی کئی رسک ہیں۔اگر وہ کسی بڑے گھر کی نکل آئی تو بلاشبہ ہماری شان دار دھلائی ہوگی۔" میں نے کہا۔"اس کا بھی ایک حل موجود ہے۔ہم اشتہار میں ایڈریس کی بجائے صرف موبائل فون نمبر دیں گے اور وہ بھی اَن رجسٹرڈ نمبر،کوئی ہمیں ٹریس نہیں کر سکے گا۔میرے پاس ایک اَن رجسٹرڈ سم موجود ہے۔اُس پہ کال ریسیو ہوتی ہے مگر کال کی نہیں جاسکتی۔"

بات میں چونکہ وزن تھا۔اس لیے وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا"گڈ پہلی بار میں ایک عقل مند پٹھان دیکھ رہا ہوں۔ہم بالکل ایسا کر سکتے ہیں۔"

"تو چلو پھر آج ہی یہ کام کرتے ہیں۔" میں پُر جوش ہوگیا۔"بیک وقت تین چار اخباروں میں اشتہار دیتے ہیں۔"

وہ بولا"فرض کرو اگر وہ غیر ملکی ہوئی تو اخبار میں اشتہارات لگانے کا ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

"نقصان بھی نہیں ہوگا۔"

"او کے جیسے تمہاری مرضی......تم نے کب کسی کی سنی ہے؟"

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"یار میں تو کہتا ہوں دفع کرو اس خوابوں والی کو اور کسی اچھی سی لڑکی سے شادی کرلو........ویسے بھی یہ کام بہت رسکی ہے تم کسی بہت بڑی مصیبت میں بھی پڑ سکتے ہو۔" اُس نے ناصحانہ انداز میں جواب دیا۔

"جو ہوگا دیکھا جائے گا،تم کسی قسم کی ٹینشن مت لو۔"

"ایک بار پھر سوچ لو میں انکل دلاور کے سامنے کسی قسم کی ذمہ داری قبول نہیں کروں گا۔"

میں نے کہا۔"بے فکر رہو میں تم پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔یہ میرا ذاتی فعل ہے اور اس کی ساری ذمہ داری میں خود قبول کروں گا۔"

"ٹھیک ہے۔"اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔"ہم ابھی یہ کام نمٹا لیتے ہیں۔"

ہم نے باری باری ملک کے تین مشہور اخبارات میں اشتہارات نوٹ کروا دیے جو کل کی اشاعت کے لیے بک ہو گئے۔اس کام سے فارغ ہونے کے بعد جب ہم واپسی کے لیے روانہ ہونے لگے تو راشد بولا۔"کیا خیال ہے لنچ کسی ریسٹورنٹ میں کر لیں؟"

میں نے کہا۔"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے مگر آنٹی ضرور ناراض ہوں گی۔"

"کوئی بات نہیں اُسے میں منا لوں گا۔"

"تو پھر چلو کسی اچھے سے ریسٹورنٹ کا رخ کرو۔میں بھوک سے بے حال ہوا جا رہا ہوں۔"

تھوڑی دیر کے بعد ہم ایک شاندار ریسٹورنٹ میں بیٹھے لنچ کر رہے تھے۔کھانا بے حد لذیذ تھا سو میں نے ڈٹ کر کھایا۔کسر راشد نے بھی نہیں چھوڑی تھی۔کھانے کے بعد ہم نے ایک ایک کپ گرین ٹی کا نوش کیا اور پھر بل ادا کرتے ہوئے ریسٹورنٹ سے باہر آ گئے۔جب ہم جیپ میں سوار ہونے لگے تو راشد کا فون بجنے لگا۔اُس نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

"ہم بس پہنچنے ہی والے ہیں امی۔"ایک لمحے کے بعد وہ دوبارہ بولا۔"سوری امی!آپ لوگ لنچ کر لیں ہمارا انتظار نہ کریں۔"

اس کے بعد وہ چند لمحے آنٹی کی بات سنتا رہا اور پھر معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔"دراصل امی!وہ یاسر بہت اصرار کر رہا تھا تو لنچ ہم نے اُس کے ہاں کر لیا۔"

پھر آنٹی نے کچھ کہا تو وہ بولا۔"ٹھیک ہے امی میں لیتا آؤں گا.......اوکے بائے۔"اُس نے کال ڈس کنکٹ کرتے ہوئے سیل فون جیب میں رکھ لیا۔

☆......☆......☆

دوسرے دن جب راشد کہیں گیا ہوا تھا تو حنا میرے کمرے میں سنجیدہ چہرہ لیے داخل ہوئی۔ اُس نے ہاتھ میں ایک مشہور و معروف اخبار پکڑ رکھا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی میرے کان کھڑے ہو گئے کہ وہ شاید مجھ سے اشتہار کے متعلق کچھ پوچھے گی مگر جب اُس نے ایسی کوئی بات نہ کی تو تب مجھے یاد آیا کہ میں نے تو اشتہار میں سوائے سیل فون نمبر کے کوئی ایڈریس وغیرہ نہیں دیا تھا۔ سو اُسے کیسے خبر ہو سکتی تھی؟ چنانچہ میں مطمئن ہو گیا۔

''آؤ حنا! کیسی ہو؟'' میں نے مسکرا کر پوچھا۔

''میں یہ اخبار دینے آئی ہوں، لو۔'' اُس نے اخبار آگے بڑھایا۔ اُس کے چہرے پر بے رخی کے تاثرات ثبت تھے۔

''شکریہ۔'' میں نے اخبار لیتے ہوئے کہا۔ ''کیا کوئی نئی تازی ہے اس میں؟''

''مجھے کوئی دل چسپی نہیں ہے اخبارات میں۔'' اُس نے منہ پھلا کر جواب دیا۔

''کیوں؟'' میں نے استفسار کیا۔

''بکواس اور جھوٹ کے علاوہ کیا ہوتا ہے اخبار میں؟''

''شوبز، سائنس، کھانے پکانے کی ترکیبیں اور مزے مزے کے دل چسپ آرٹیکلز ہوتے ہیں۔ اخبارات کے مطالعہ سے انسان کے نالج میں اضافہ ہوتا ہے۔ نالج میں اضافہ انسان کی شخصیت کو سحر انگیز بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔''

''جسے مسحور کرنا تھا اُس پر تو کسی اور کا جادو چل چکا ہے۔ اب نالج میں اضافہ کرنے کا کیا فائدہ؟'' اُس نے ہونٹوں پر ایک زخمی سی مسکراہٹ سجاتے ہوئے پوچھا۔

اُسے یوں مایوسی کے عالم میں دیکھ نجانے کیوں میرا دل دکھنے لگا۔ مگر میں مجبور تھا۔ پہلے ہی کسی زلف کا اسیر تھا۔ اُسے جھوٹے خواب دکھانے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ سو معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''حنا! یقین کرو تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو لیکن میں اس کم بخت دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ میں پہلے اُسے تلاش کروں گا جس نے میری راتوں کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں۔ اگر وہ........''

''نہ ملی تو پھر تیری طرف لوٹ آؤں گا۔'' وہ میری بات قطع کرتے ہوئے بولی۔ ''یہی کہنا چاہتے تھے ناں تم؟''

''نہیں تم غلط سوچ رہی ہو، میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا۔''

''کیا کہنا چاہتے تھے؟'' اُس کے انداز میں تحیر تھا۔

''رہنے دو، میں کسی خودغرض سے بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔'' میں نے بے رُخی سے جواب دیا۔

''سوری شیر دل!'' اُس نے ندامت کا اظہار کیا۔ ''محبت ہوتی ہی خودغرض ہیں۔ یہ صرف اپنا نفع دیکھتی ہے۔ دوسروں کا خسارہ اسے کبھی نظر نہیں آتا۔ ہم دونوں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں۔ دراصل جہاں چوٹ لگتی ہے درد وہیں ہوتا ہے۔''

''او کے ابھی جاؤ........ مجھے اخبار پڑھنا ہے۔''

''نو......'' اُس نے انکار میں سر ہلایا۔ ''جب تک تم مجھے معاف نہیں کرو گے میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔''

''ہم میں ایسا کون سا رشتہ ہے کہ بات معافی تلافی تک پہنچ جائے؟'' میں نے ناگواری سے سوال کیا۔

اُس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ دوسرے ہی پل اُس کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔ عورت کے آنسو اور ساون کی بارش وقت کی قید سے دونوں آزاد ہوتے ہیں۔ ان کے برسنے اور رکنے کا کوئی وقت اور موقع طے نہیں ہوتا۔ عورت تو ذات ہی ایسی ہے کہ غم اور خوشی دونوں کا استقبال آنسو بہا کر کرتی ہے۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی اور پھر تیزی سے پلٹ کر باہر نکل گئی۔

اُس کے جانے کے بعد مجھے اپنے الفاظ پر ندامت محسوس ہونے لگی۔ بے شک میں اُس سے پیار نہیں کرتا تھا مگر کسی کا دل توڑنا بھی میں معیوب سمجھتا تھا۔ کافی دیر تک میں پشیمانی کے عالم میں بیٹھا رہا۔ اس کے بعد ہاتھ میں پکڑے اخبار کی طرف متوجہ ہو گیا۔ سب سے پہلے میں نے اپنا دیا ہوا اشتہار چیک کیا۔ اشتہار پورے اہتمام کے ساتھ لگایا گیا تھا۔ تصویر بھی ایک کونے میں لگی ہوئی تھی جو بلاشک وشبہ نہایت ہی صاف وشفاف تھی۔ اشتہار چیک کرنے کے بعد میں دیگر ملکی خبریں پڑھنے لگا۔ حسب معمول خودکش حملوں، ٹارگٹ کلنگ، بم بلاسٹ، اغوا برائے تاوان اور ڈکیتی سے متعلق خبریں تھیں۔ یہ وہ خبریں ہیں جن کے عوام اب عادی ہو چکے ہیں۔ اب ایسی خبروں کے بغیر اخبارات بکتے ہی نہیں ہیں۔ پرنٹ میڈیا کو خود بھی ایسی ہی خبروں کا چسکا پڑ چکا

ہے۔ بصورت دیگر اُن کا دھندا مندا پڑنے لگتا ہے۔

میں اخبار میں کھویا ہوا تھا کہ ایسے وقت میرا سیل فون بج اُٹھا۔ میں نے فون نکال کر اسکرین پر نظر ڈالی تو ایک اجنبی نمبر جھلملا رہا تھا۔ میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے ''ہیلو۔'' کہا تو دوسری طرف سے بابا جان کی پریشان کن آواز سنائی دی۔ ''شیر دل! جہاں بھی ہو، جیسے بھی ہو فوراً گھر پہنچ جاؤ۔''

میرا دل بے اختیار دھڑک اُٹھا۔ ''خیر تو ہے بابا جان! آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں؟''

''ہاں خیر ہے بھی اور نہیں بھی۔'' اُنھوں نے عجیب سے انداز میں جواب دیا۔

''مم.......میں.......سمجھا نہیں بابا جان! آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

''اُلو کے پٹھے!'' وہ چلائے۔ ''میں نے کہا ہے کہ فوراً گھر پہنچ جاؤ، چاہے جس حالت میں بھی ہو۔ یہاں جو کچھ ہوا ہے وہ فون پر نہیں بتایا جا سکتا۔''

''پھر بھی بابا جان! مجھے کچھ اندازہ تو ہو ناں کہ............''

''گدھے! تم کون سی زبان سمجھتے ہو؟'' اُنھوں نے میری بات کاٹی۔ ''جو کچھ میں نے کہا ہے اُس پر عمل کرو۔ میں کسی پڑوسی کے فون سے بات کر رہا ہوں۔ وقت مت ضائع کرو۔''

''جی.......جی.......بابا جان! مم.......میں بس ابھی نکلتا ہوں۔'' میں نے اٹکتے ہوئے لہجے میں جواب دیا تو دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہو گیا۔

میں نے فوراً راشد کو کال کی اور اُسے بابا جان کے فون کے متعلق بتا دیا۔

وہ بولا۔ ''او کے.......میں بس ابھی گھر پہنچتا ہوں.......ویسے انکل نے کچھ بتایا تو ہوگا؟''

''کچھ بھی نہیں بتایا یار.......حالانکہ میں بار بار پوچھتا رہا۔ خدا خیر کرے مجھے تو معاملہ کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا۔ یقیناً کوئی اہم واقعہ ہو چکا ہے ورنہ بابا جان مجھے کبھی اس قدر پریشان دکھائی نہیں دیے۔'' میں نے پریشانی کے عالم میں جواب دیا۔

''اللہ تعالیٰ سے بہتری کی اُمید رکھو یار۔'' وہ تسلی آمیز انداز میں بولا۔ ''انکل دلاور کو تو ویسے بھی بات کا بتنگڑ بنانے کی عادت ہے۔ ہوگا کوئی چھوٹا موٹا عام نوعیت کا مسئلہ تمہیں پریشانی ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

”نہیں یار بابا جان عام باتوں کے خاطر میں نہیں لاتے۔ مجھے تو لگتا ہے مہردل نے پھر کوئی اُلٹا سیدھا کام کردیا ہے۔ وہ بہت جذباتی نوجوان ہے غصہ تو سمجھو ہر وقت اُس کی ناک پر دھرا رہتا ہے۔ کسی کی بھی نہیں سنتا بس اپنی مرضی کرتا ہے۔“

”کہیں تمہاری اُس وڈیو والا معاملہ نہ ہو؟“ اُس نے خیال ظاہر کیا۔ ”صمدیار جیسے کمینے آدمی سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔“

اُس کے منھ سے وڈیو کا سُن کر میری پریشانی مزید بڑھ گئی۔ کیونکہ ایسا ممکن تھا۔ صمدیار خان اُنھیں وہ شرم ناک وڈیو بھیج سکتا تھا۔ تاہم میں اُس سے زیادہ خود کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ”نہیں یار! یہ اُس وڈیو والا معاملہ نہیں ہوسکتا۔ بات کچھ اور ہے۔ اگر وڈیو والا معاملہ ہوتا تو بابا جان مجھے بلانے کی بجائے خود یہاں پہنچ جاتے۔“

”او کے اللہ بہتر کرے گا۔ میں ابھی پہنچتا ہوں۔“

”میں منتظر ہوں......او کے اللہ حافظ۔“ اتنا کہہ کر میں نے رابطہ منقطع کردیا۔



راشد میری توقع سے بھی پہلے پہنچ گیا۔ اس کے پہنچتے ہی میں نے واپسی کی تیاری شروع کردی۔ جب آنٹی اور حنا کو میری واپسی کی خبر ہوئی تو وہ بھی پریشان ہوگئیں۔

آنٹی بولی۔ ”ابھی تجھے یہاں آئے ہوئے دو تین دن ہی تو گزرے ہیں اور اتنی جلدی واپس بھی جارہے ہو، آخر بات کیا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”آنٹی! مجھے خود بھی اتنی جلدی واپس جانے کا افسوس ہے مگر کیا کروں مجبوری ہے۔ میں بابا کا حکم نہیں ٹال سکتا۔“

”شاید اس کا دل نہیں لگتا یہاں......اسی لیے واپس جارہا ہے۔“ حنا نے ذومعنی انداز میں مداخلت کی۔

میں نے کہا۔ ”حنا صاحبہ! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ دراصل گھر میں کوئی مسئلہ ہوگیا ہے ورنہ میں اتنی جلدی کبھی بھی واپس نہ جاتا۔“

”کیسا مسئلہ......خیر تو ہے؟“ آنٹی نے متعجب انداز میں پوچھا۔

”تھوڑی دیر قبل بابا کا فون آیا تھا۔ اُنھوں نے مجھے فوراً واپس پہنچنے کا حکم دیا ہے۔“

”کیوں......کس لیے؟“

”یہ تو اُنھوں نے نہیں بتایا۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

آنٹی راشد کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ”مجھے فون دو میں خود بھائی صاحب سے بات کرتی ہوں۔“

”آنٹی! ہمارے گھر میں میرے بعد صرف مہردل کے پاس سیل فون ہے۔ آپ بابا جان سے بات نہیں کرسکتیں تاہم مہردل سے بات کرنا چاہیں تو میں کرا دیتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ آنٹی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”تم مہردل سے رابطہ کرو میں اُس سے بات کرتی ہوں۔ پتا تو چلے کہ آخر مسئلہ کیا ہے؟“

میں نے جیب سے سیل فون نکال کر مہردل کا نمبر ملایا مگر رابطہ نہ ہو سکا مہردل نے سیل فون آف کر رکھا تھا۔

”سوری آنٹی! مہردل کا فون آف ہے۔“ میں نے آنٹی کو بتایا۔

”تو پھر کیا تم چلے جاؤ گے؟“ آنٹی نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ”آنٹی! جانا تو پڑے گا ورنہ بابا جان خود مجھے لینے کے لیے یہاں پہنچ جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے تو پھر میں بھی تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔“ راشد نے مداخلت کی۔

”نہیں یار! تم رہنے دو......میں چلا جاؤں گا۔“

آنٹی بولی۔ ”راشد ٹھیک کہتا ہے۔ تم اسے ساتھ لے جاؤ، کیا پتا تمھیں وہاں اس کی ضرورت پڑ جائے۔“

”امی! میں بھی چلوں گی۔“ حنا نے خواہش ظاہر کی۔

”تمھارا دماغ تو ٹھیک ہے؟“ راشد نے اُسے گھورا۔ ”ہم کوئی پکنک منانے جا رہے ہیں؟“

”مجھے گاؤں دیکھنے اور زرغونہ سے ملنے کا بہت شوق ہے۔“ وہ مچلی۔ ”پلیز.........مجھے بھی ساتھ لے جاؤ......امی! آپ کہیں ناں بھائی سے؟“

”نہیں۔“ آنٹی نے انکار میں سر ہلایا۔ ”اس وقت تمھارا جانا مناسب نہیں ہے۔ جب میں اور تمھارے پاپا جائیں تو پھر تمھیں بھی ساتھ لے جائیں گے۔“

”پلیز........پلیز امی! ابھی جانے دیں ناں؟“ حنا نے التجا کی۔
آنٹی نے اُسے خشمگیں نظروں سے گھورا۔ ”کتنی بار سمجھایا ہے کہ بچوں کی طرح ضدمت کیا کرو ورنہ بہت بُری طرح پیش آؤں گی۔“
”ہر کوئی مجھ پر رعب جھاڑتا ہے۔“ حنا پاؤں پٹختے ہوئے باہر نکل گئی۔ جب کہ آنٹی راشد کی طرف متوجہ ہوگئی۔
”تم فوراً تیاری کرو بیٹے! نجانے بھائی صاحب کو کیا مسئلہ پیش آ گیا ہے۔“
اس کے بعد چند لمحوں کے اندر راشد نے تیاری کی اور ہم آنٹی کو خدا حافظ کہتے ہوئے روانہ ہوگئے۔ حنا خفا ہونے کی وجہ سے ہمیں رخصت کرنے کے لیے نہیں آئی تھی۔ وہ واقعی بے حد ضدی لڑکی تھی۔ بس اپنی منوانا جانتی تھی دوسروں کے احساسات وجذبات کی اُسے ذرا بھر بھی پرواہ نہیں تھی۔



شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا جب ہماری جیپ حویلی میں داخل ہوئی۔ گیٹ میرے ایک رشتادار نے کھولا تھا۔ اُس نے مجھ سے اور راشد سے مصافحہ کیا اور پھر پشتو میں بولا۔ ”آپ لوگ ادھر حجرے میں آجائیں۔ سردار صاحب بھی وہیں موجود ہیں۔“
”ہمیش گل! معاملہ کیا ہے؟“ میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔
”چھوٹے سردار کی لڑائی ہوئی ہے صمد یار خان کے آدمیوں کے ساتھ۔“ اُس نے مختصر سا جواب دیا۔
”مہردل کی؟“
”ہاں مہردل کی۔“ اُس نے دوبارہ اختصار سے کام لیا۔
”کب اور کہاں ہوئی ہے......مہردل ٹھیک تو ہے ناں؟“ میں نے بے صبری سے سوال کیا۔
”وہ شیر ہے اور شیر کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“ ہمیش گل نے فخریہ انداز میں جواب دیا۔
”تھینکس گاڈ..........اس کا مطلب ہے کہ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا؟“ میں نے مطمئن انداز میں پوچھا۔
”چھوٹے سردار کو تو کچھ بھی نہیں ہوا البتہ صمد یار خان کے دو بندے موقع پر ہی دم توڑ گئے۔ وہ چھے تھے

جب کہ چھوٹا سردار اکیلا تھا۔ اگر آپ بھی اُس کا ساتھ دیتے تو آج صمد یار خان کا ایک بندہ بھی بچ کر نہ جاتا۔"

ہمیش گل کی بات سن کر میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی اور سر گھومنے لگا۔ جس دشمنی کو ختم کرنے کے لیے میں نے اپنی مردانگی کو بھی داؤ پر لگا دیا تھا اور عورتوں کی طرح اپنی کلائی میں چوڑیاں پہن لی تھیں۔ وہ دشمنی ختم ہونے کی بجائے چنگاری سے شعلہ بن چکی تھی۔ اب میری اُس شرم ناک وڈیو کو منظر عام پر آنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ صمد یار خان اپنے دو بندوں کی ہلاکت کسی طرح بھی نہیں بھول سکتا تھا۔ وہ ایک زہریلا ناگ تھا اور مہر دل انجانے میں اُس کی دُم پر پاؤں رکھ چکا تھا۔ اب مہر دل کا بچنا محال تھا۔ اُسے آج یا کل صمد یار خان کے انتقام کی بھینٹ چڑھ جانا تھا۔

"مہر دل اس وقت کہاں ہے؟" اچانک کسی خیال کے تحت میں نے سوال کیا۔

"وہ بھی حجرے میں ہے۔" ہمیش گل نے جواب دیا۔

"احمق ہو تم سب لوگ۔" میں چلایا اور پھر راشد سے اُردو میں مخاطب ہو کر کہا۔ "تم جیپ اسٹارٹ رکھو، میں ابھی مہر دل کو لے کر آتا ہوں۔"

میں حجرے کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ مجھے ہر حال میں اپنے بھائی کو بچانا تھا۔

ہمیش گل مجھے عقب سے آوازیں دیتا رہا مگر مجھ پر تو اُس وقت جنون سوار ہو چکا تھا۔ مجھے ہر قیمت پر اپنے بھائی کو صمد یار خان کے انتقام سے بچانا تھا۔ بابا جان بھلے گاؤں کے سردار تھے، اُنھیں گاؤں کے لوگوں کی حمایت بھی حاصل تھی لیکن بابا جان سمیت گاؤں کے یہ سادہ دل اور اَن پڑھ لوگ صمد یار خان کی طاقت اور اثر و رسوخ سے آگاہ نہیں تھے۔ اُنھیں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ حالانکہ صمد یار خان نہ صرف صوبائی اسمبلی کا رکن تھا بلکہ بہت جلد اُسے ایک اہم وزارت بھی ملنے والی تھی۔ غنڈوں کی فوج اُس نے پہلے ہی پال رکھی تھی۔ جن میں سے اکثریت قاتلوں اور مفروروں کی تھی۔ یہ لوگ پولیس اور قانون کو مطلوب تھے مگر صمد یار خان کی وجہ سے کوئی اُن پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ قانون کے رکھوالوں کو اپنی ملازمت عزیز تھی۔ سو قاتل کھلے عام دندناتے پھرتے تھے۔

میں حواس باختگی کے عالم میں حجرے میں داخل ہو گیا۔ وہاں بابا جان کے ساتھ لگ بھگ بیس پچیس اشخاص

فرشی نشست پر براجمان تھے۔ اُن میں کچھ ہمارے رشتادار اور کچھ گاؤں کے وہ لوگ تھے جن کے لیے بابا جان ایک سردار ہونے کے ناتے قابلِ احترام تھے۔ ایک طرف مہردل بھی مطمئن انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کا چہرہ دیکھ کر لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ دو انسانوں کو قتل کر چکا ہے۔ مجھے یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر بابا جان خوشی سے کھل اُٹھے اور پھر حاضرین سے بولے۔ ''دیکھو! یہ ہے میرا شیردل بیٹا، اب یہ آ گیا ہے تو مہردل اکیلا نہیں رہا۔ صمد یار خان اگر وزیر ہے تو کیا ہوا ہم بھی اُس سے کم نہیں ہیں۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دیں گے۔ پہل اُس نے کی ہے تو اب نتیجہ بھی بھگتے گا۔''

''بابا جان! مہردل کا یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ میں اسے لینے آیا ہوں۔'' میں نے پُرتشویش انداز میں کہا۔ ''یہاں اس کی جان کو خطرہ ہے۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو؟'' اُنھوں نے غصے سے کہا۔ ''تم کیا چاہتے ہو کہ مہردل بزدلوں کی طرح کہیں چھپ جائے؟''

''جان بچانے کے لیے اسے چھپنا پڑے گا۔ صمد یار خان خاموش نہیں بیٹھے گا۔ اس سے پہلے کہ یہاں پولیٹیکل ایجنٹ اپنے کارندے لے کر پہنچ جائے، اسے یہاں سے فرار ہونے پڑے گا۔'' میں نے ممکنہ اندیشے کا اظہار کیا۔

بابا جان نے حقارت سے کہا۔ ''تم بزدل ہو اور بزدل ہی رہو گے۔ دفع ہو جاؤ میری نظروں سے ورنہ میں تجھے اپنے ہاتھوں سے گولی مار دوں گا۔''

''نہیں.......میں نہیں جاؤں گا۔'' زندگی میں پہلی بار میں نے بابا جان کے سامنے سر اُٹھا کر بات کی۔ ''میں مہردل کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔ میں اسے مرنے کے لیے یہاں نہیں چھوڑ سکتا۔''

''مہردل کو تمہاری ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے۔'' بابا جان جارحانہ انداز میں اُٹھ کر میری طرف بڑھے۔ ''تم بس فوراً نکلو یہاں سے، ورنہ دھکے مار کر نکالوں گا۔ پٹھان ہو کر دشمنوں سے چھپتے پھرنا مہردل کو نہیں تیرے جیسے بزدلوں کو زیب دیتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''بابا جان! ایک چھوٹی سی بات کو انا کا مسئلہ بنا کر کیا خون کی ندیاں بہانا بہادری کہلاتا ہے؟

”ہاں“ وہ گرج کر بولے۔ ”یہی ہماری روایت ہے۔ تم اسے بدل سکتے ہو تو بدل کر دکھاؤ۔“

”آپ جیسے لوگوں نے.......صرف آپ جیسے لوگوں نے باباجان! آج پوری پٹھان قوم کو دنیا کی نگاہوں میں وحشی و درندہ صفت ثابت کر رکھا ہے۔ مصلحت سے کام لینا تو سیکھا ہی نہیں ہے آپ جیسے سرداروں اور..........“

”خاموش۔“ وہ حلق کے بل چلائے اور پھر اندھا دھند میرے چہرے پر تھپڑ برسانے لگے۔ ”بزدل انسان! تمہیں اپنے باپ کے خلاف زبان کھولنے کی ہمت کیسے ہوئی؟ ابھی اور اسی وقت میرے گھر سے نکل جاؤ.......میں تمہاری شکل دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔ آج سے تم میرے لیے مر چکے ہو۔ نہ میں تمہارا باپ اور نہ تم میرے بیٹے ہو۔“

مجھے باباجان کی طرف سے اس قدر شدید ردِعمل کی توقع نہیں تھی۔ چند لمحے تو میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے کبھی باباجان تو کبھی مہردل کی طرف دیکھتا رہا، پھر نجانے کب میری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں مجھے خبر ہی نہ ہوئی۔ محفل میں سناٹا طاری تھا۔ ایسے ہی وقت مجھے عقب سے اپنے کندھوں پر بوجھ کا احساس ہوا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو سامنے راشد موجود تھا۔ میرے لب بولنے کے انداز میں تھرتھرائے مگر الفاظ گولہ بن کر حلق میں اٹک گئے۔ کوشش کے باوجود میں کچھ بھی نہ بول پایا تو تب راشد نے مجھے کھینچ کر گلے سے لگا لیا۔ ”چل شیر دل! تیری دنیا الگ ہے ان لوگوں سے۔ یہاں تجھے نفرتوں کے علاوہ کچھ نہیں ملے گا۔“ وہ میری پشت سہلاتے ہوئے بولا۔ ”تیرا قصور یہ ہے کہ تم پہلو میں پتھر کی بجائے دل لے کر دنیا میں آئے ہو۔“

میں نے پلٹ کر باباجان اور مہردل کی طرف دیکھا مگر اُن کے سپاٹ چہرے اپنائیت کے جذبات سے عاری تھے، وہاں صرف میرے لیے نفرت ثبت تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے دل میں خنجر گھونپ دیا ہو۔ اچانک میری آنکھوں کے سامنے تاریکی کے پردے تن گئے اور میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوتا چلا گیا۔

☆......☆......☆

میں جب دوبارہ ہوش آیا تو میں نے خود کو گاؤں کی ڈسپنسری میں پایا۔ میرے بیڈ کے قریب رکھی کرسی پر راشد اُداسی کے عالم میں بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے آنکھیں کھولتے دیکھ کر اُس نے میری پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے

کہا۔ ”شکر ہے کہ تمہیں جلد ہی ہوش آ گیا۔ ڈسپنسر بہت ہی اچھا انسان ہے۔ اُس نے بتایا ہے کہ تم محض صدمے کی وجہ سے بے ہوش ہو گئے تھے، کوئی خطرے والی بات نہیں ہے۔“

”کیا بابا جان اور مہر دل تمہارے ساتھ نہیں آئے؟“ میں نے ایک اُمید کے سہارے سوال کیا۔

”نہیں۔“ اُس نے منفی انداز میں سر ہلایا۔ ”وہ لوگ تم پر بہت غصہ ہیں۔ خاص کر انکل دلاور تو تمہاری شکل دیکھنے کے بھی روادار نہیں ہیں۔“

”یار! مجھے بابا جان کے غصے کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔“ میں ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”بس میں کسی طرح اپنے بھائی کو یہاں سے دُور لے جانا چاہتا ہوں۔ میں اُسے صدیار خان جیسے زہریلے ناگ سے بچانا چاہتا ہوں۔“

”وہ کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں ہے کہ ہم اُسے اُٹھا کر لے جائیں........ اُسے اگر سر پر منڈلانے والے خطرہ کا احساس نہیں ہے تو پھر ہم اُس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔“

”مگر........“

”کوئی اگر مگر نہیں چلے گا۔“ اُس نے میری بات کاٹی۔ ”اُٹھو ہم اسی وقت واپس پشاور جا رہے ہیں۔“

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟“ میں نے غصے کے عالم میں پوچھا۔ ”میں اپنے بھائی کو........“

ایسے ہی وقت ڈسپنسر ولی خان کمرے میں داخل ہوا اور میری بات ادھوری رہ گئی۔ ولی خان کا تبادلہ ایک برس قبل ہی ہمارے گاؤں کی ڈسپنسری میں ہوا تھا۔ چونکہ اُس کا گاؤں بہت دُور تھا اس لیے وہ ڈسپنسری کے کوارٹر میں رہائش پذیر تھا۔ کوارٹر ڈسپنسری کے احاطے میں ہی واقع تھا۔ سو ولی خان شب و روز با آسانی گاؤں کے مریضوں کو دستیاب تھا۔ میرے ساتھ اُس کی اچھی خاصی گپ شپ تھی۔ ایک سردار کا بیٹا ہونے کی وجہ سے ولی خان میری بہت زیادہ عزت کرتا تھا۔ مجھے بیڈ پہ بیٹھے دیکھ کر وہ مسکرا کر بولا۔ ”شیر دل خان! پریشانی والی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ فکر نہ کریں........ میں نے بی پی وغیرہ بھی چیک کر لیا تھا سب اوکے ہے۔“

میں نے کہا۔ ”شکریہ یار میں تمہارا ممنون ہوں۔“

”اس میں شکریے کی کون سی بات ہے؟ یہ تو میرا فرض تھا۔“

”پھر بھی رات کے وقت ہم نے تمہیں تکلیف تو دی ہے ناں........ جب کہ تمہاری ڈیوٹی دن کے دو اڑھائی

بجے تک ہوتی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"بے شک ڈیوٹی ختم ہو جاتی ہے مگر میں کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔"

"اعلیٰ ظرفی ہے تمہاری........ ورنہ یہاں تو ہر فیلڈ میں حرام خوروں کا راج ہے۔"

وہ ہنسا۔ "نہیں اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہر فیلڈ میں کچھ اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں، البتہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ بُروں کی تعداد زیادہ ہے۔"

"میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں، یہ الگ بات ہے کہ پشتو نہیں بول سکتا۔" راشد نے مداخلت کی۔

"سوری یار۔" میں نے نادم ہو کر کہا۔ "میں ولی خان سے اُردو میں بات نہیں کر سکتا۔ دراصل یہ اُردو نہیں بول سکتا........ ویسے بھی دو پٹھان بھلا اُردو میں بات کیسے کر سکتے ہیں؟"

"تو پھر مجھے ہی پشتو بولنا سکھا دو۔" راشد نے جواب دیا۔

"موقع ملا تو ضرور سکھاؤں گا۔ فی الحال تو مجھے مہردل کی پڑی ہوئی ہے۔ ہمیں کسی نہ کسی طرح اُسے یہاں سے نکالنا ہوگا ورنہ وہ مارا جائے گا۔"

"میں سمجھتا ہوں مگر یہ ناممکن ہے۔" اُس نے مایوسی کے عالم میں سر ہلایا۔ "وہ ہمارے ساتھ نہیں جائے گا۔"

"کوئی طریقہ تو ہوگا......... تم سوچو تو سہی، دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔"

وہ بولا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو میں مانتا ہوں کہ دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ اگر کچھ ناممکن ہے تو وہ ہے کسی پٹھان کو سمجھانا۔"

"تم بات کو مذاق میں ٹال رہے ہو جب کہ میری جان پر بنی ہوئی ہے۔"

"سوری میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔" اُس نے حتمی انداز میں جواب دیا۔

"لعنت ہے تمہاری دوستی پر۔" مجھے غصہ آگیا۔ "اس سے تو بہتر تھا کہ میں تجھے ساتھ لے کر ہی نہ آتا۔"

"یار! تم سمجھتے کیوں نہیں ہو؟ وہ زچ ہو کر بولا۔ "اب کیا اُسے اغوا کر کے لے جائیں؟"

اغوا کا لفظ سُن کر میرے دماغ میں جیسے برق کا کوندا سا لپک گیا۔ اگرچہ یہ بات اُس نے طنزاً کہی تھی مگر اس کے متعلق سوچا جا سکتا تھا۔ ہم دونوں مل کر مہردل کو اغوا کر سکتے تھے۔ اُسے بے ہوش کر کے پشاور لے جانا ناممکن

نہیں تھا۔

"تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔" میں نے پُر جوش انداز میں کہا۔ "ہم مہردل کو اغوا کر کے تمہارے گھر لے جائیں گے۔ وہاں وہ محفوظ رہے گا۔"

"ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔" وہ غیر متوقع طور پر رضا مند ہو گیا۔ "لیکن اُسے اغوا کیسے کریں گے........وہ کوئی بچہ تو ہے نہیں کہ ہم اُسے دو تین تھپڑ لگائیں گے اور وہ ہمارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔"

میں نے کہا۔ "یہ مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں ہے۔ ہم اُسے کسی طرح بے ہوش کرنے کے بعد باندھ کر جیپ میں ڈال دیں گے۔"

"مجھے جیمز بانڈ بننے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ اُسے تم خود اغوا کرو گے۔" وہ دوبارہ پٹڑی سے اُتر گیا۔

"دیکھو راشد!" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "یہ اکیلے آدمی کا کام نہیں ہے۔ تمہیں میرا ساتھ دینا پڑے گا........پلیز میری دوستی کی خاطر۔"

"تمہاری دوستی میری جان لے کر چھوڑے گی۔" اُس نے ایک آہ خارج کی۔ "اوکے میں تیار ہوں۔ بولو کیا کرنا ہے؟"

میں ولی خان کی طرف متوجہ ہو کر پشتو میں بولا۔ "ولی خان! تمہیں میرا ایک کام کرنا پڑے گا۔"

"کیسا کام؟" اُس نے متعجب انداز میں پوچھا۔

میں نے کہا۔ "میں تجھے اپنے چھوٹے بھائی مہردل کا نمبر دیتا ہوں تم کسی بہانے اُسے یہاں بلالو........ بس اتنا سا کام ہے۔"

وہ بولا۔ "یہ کام تو آپ خود بھی کر سکتے ہیں۔"

"کر سکتا تو تم سے کیوں کہتا؟........دراصل وہ اور باباجان مجھ سے سخت ناراض ہیں۔ اس قدر خفا ہیں کہ اُنھیں میری شکل دیکھنا بھی گوارا نہیں ہے۔ مہردل کو یہاں بلا کر میں اُس کی ناراضی دُور کرنا چاہتا ہوں۔ وہاں گھر میں باباجان کی موجودگی میں یہ کام نہیں ہو سکتا۔"

"میں اُس سے بہانہ کیا بناؤں گا؟" اُس نے قائل ہو کر استفسار کیا۔ "کیا کہوں گا اُس سے؟"

نہیں تھا۔

"تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔" میں نے پُر جوش انداز میں کہا۔ "ہم مہردل کو اغوا کر کے تمہارے گھر لے جائیں گے۔ وہاں وہ محفوظ رہے گا۔"

"ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔" وہ غیر متوقع طور پر رضامند ہو گیا۔ "لیکن اُسے اغوا کیسے کریں گے......... وہ کوئی بچہ تو ہے نہیں کہ ہم اُسے دو تین تھپڑ لگائیں گے اور وہ ہمارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔"

میں نے کہا۔ "یہ مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں ہے۔ ہم اُسے کسی طرح بے ہوش کرنے کے بعد باندھ کر جیپ میں ڈال دیں گے۔"

"مجھے جیمز بانڈ بننے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ اُسے تم خود اغوا کرو گے۔" وہ دوبارہ پٹڑی سے اُتر گیا۔

"دیکھو راشدا!" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "یہ اکیلے آدمی کا کام نہیں ہے۔ تمہیں میرا ساتھ دینا پڑے گا........ پلیز میری دوستی کی خاطر۔"

"تمہاری دوستی میری جان لے کر چھوڑے گی۔" اُس نے ایک آہ خارج کی۔ "او کے میں تیار ہوں۔ بولو کیا کرنا ہے؟"

میں ولی خان کی طرف متوجہ ہو کر پشتو میں بولا۔ "ولی خان! تمہیں میرا ایک کام کرنا پڑے گا۔"

"کیسا کام؟" اُس نے متعجب انداز میں پوچھا۔

میں نے کہا۔ "میں تجھے اپنے چھوٹے بھائی مہردل کا نمبر دیتا ہوں تم کسی بہانے اُسے یہاں بلالو......... بس اتنا سا کام ہے۔"

وہ بولا۔ "یہ کام تو آپ خود بھی کرسکتے ہیں۔"

"کرسکتا تو تم سے کیوں کہتا؟......... دراصل وہ اور بابا جان مجھ سے سخت ناراض ہیں۔ اس قدر خفا ہیں کہ اُنھیں میری شکل دیکھنا بھی گوارا نہیں ہے۔ مہردل کو یہاں بلا کر میں اُس کی ناراضی دُور کرنا چاہتا ہوں۔ وہاں گھر میں بابا جان کی موجودگی میں یہ کام نہیں ہوسکتا۔"

"میں اُس سے بہانہ کیا بناؤں گا؟" اُس نے قائل ہو کر استفسار کیا۔ "کیا کہوں گا اُس سے؟"

"یہ کون سا مشکل ہے؟" میں نے کہا۔ "تم اُس سے کہنا کہ میری طبیعت بہت زیادہ خراب ہے اور مجھے علاج کے لیے شہر لے جانا پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے مجھے اُس کا نمبر بتاؤ؟" وہ فوراً رضامند ہو گیا۔

میں نے اُسے نمبر بتایا اور پھر کہا۔ "اُس سے بات کرتے ہوئے فون کا اسپیکر آن رکھنا۔"

"اوکے۔" اُس نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر مہردل کا نمبر ملانے لگا۔

"ہیلو........کون؟" رابطہ ہوتے ہی فون سے مہردل کی آواز اُبھری۔

"چھوٹے خان جی! میں ولی خان بول رہا ہوں۔" ولی خان نے جواب دیا۔

"کون ولی خان؟" مہردل نے تعجب کا اظہار کیا۔ "میں کسی ولی خان کو نہیں جانتا۔"

وہ بولا۔ "میں ڈسپنسر ولی خان بات کر رہا ہوں........آپ شیردل خان کو تو یقیناً جانتے ہوں گے۔"

"کک......کیا ہوا ہے شیردل کو؟" اُس کے انداز سے پریشانی جھلکنے لگی۔ "وہ ٹھیک تو ہے ناں؟"

"ٹھیک ہوتا تو آپ کو فون کیوں کرتا؟ اُس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ اُسے شہر کے اسپتال میں لے جانے کی ضرورت ہے۔" ولی خان نے جواب دیا۔

"کیا وہ ہوش میں نہیں آیا؟" اُس نے بے چینی کے عالم میں پوچھا۔

"نن........نہیں........ابھی تک بے ہوش ہی ہے اور اُس کا ساتھی بھی اُسے چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔ اس وقت شیردل کو آپ کی سخت ضرورت ہے۔ آپ جلدی سے آجائیں......پلیز جلدی کریں ورنہ مریض کی حالت لحہ بہ لحہ خراب ہوتی جائے گی۔"

"ٹھیک ہے میں بابا جان سے بات............"

"بڑے خان جی سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اُنھیں بعد میں بتا دیں گے۔" ولی خان نے قطع کلامی کی۔ "بس آپ جلدی سے پہنچنے کی کوشش کریں۔"

"ٹھیک ہے میں کچھ کرتا ہوں۔" مہردل نے جواب دیا۔

"اوکے......خدا حافظ۔" کہہ کر ولی خان نے رابطہ منقطع کر دیا۔

''بہت خوب تم نے تو کمال کر دیا ہے یار۔'' میں نے ستائشی انداز میں کہا۔''اچھی اداکاری کی ہے۔''

وہ بولا۔''جھوٹ بولنا اگر اداکاری کہلاتا ہے تو پھر میں واقعی اداکار ہوں۔''

میں نے کہا۔''سچ پوچھیں تو اداکاری کا مطلب ہی جھوٹ ہوتا ہے۔''

''کیا کہا ہے مہردل نے؟'' راشد نے مداخلت کرتے ہوئے پوچھا۔

میں نے کہا۔''ولی خان نے اُسے شیشے میں اُتار لیا ہے۔وہ ضرور آئے گا،بس ہم نے کسی طرح اُس پر قابو پا کر اُسے بے ہوش کرنا ہے۔''

''ویسے کام بہت مشکل ہے۔'' اُس نے ممکنہ خدشے کا اظہار کیا۔''ایسا نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑ جائیں؟''

''جو ہوگا دیکھا جائے گا یار۔'' میں نے بے پرواہ انداز میں جواب دیا اور وہ سر ہلا کر رہ گیا۔



پلان کے مطابق ولی خان ڈسپنسری کے مین گیٹ پر مہردل کا منتظر تھا جب کہ میں اور راشد کمرے کے اندر بیٹھے شدت کے ساتھ مہردل کی آمد کے منتظر تھے۔ہمیں وقت کا کوئی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کب اور کس وقت پہنچے گا؟ بہرحال اتنا یقین تھا کہ وہ لازمی آئے گا،سو ہم اُسے چھاپنے کے لیے تیار تھے۔لگ بھگ نصف گھنٹے کے بعد مجھے ولی خان اور مہردل کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی تو میرا دل بے اختیار دھڑک اُٹھا۔میں نے دھیمی آواز میں راشد سے کہا۔''وہ آگیا ہے،اب بس ہمیں اُس پر کسی طرح قابو پانا ہے۔بہتر ہوگا کہ ہم دروازے کے عقب میں چھپ کر کھڑے ہو جائیں۔''

وہ بولا۔''بے وقوف! ہم دونوں خالی ہاتھ ہیں۔پہلے ہتھیار کے طور پر کوئی چیز تو ڈھونڈ لو،ہم اُسے خالی ہاتھ کس طرح بے ہوش کریں گے؟''

میں نے کمرے میں اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں تو مجھے کمرے کے ایک کونے میں فرش صاف کرنے والا برش نظر آگیا۔یہ لکڑی کے دستے والا ایک مضبوط برش تھا۔اس کے وار سے کسی بھی شخص کو بے ہوش کیا جا سکتا تھا۔میں نے آگے بڑھ کر برش اُٹھالیا اور پھر راشد کو پیش کرتے ہوئے بولا۔''یہ لو اس سے مہردل کے سر پر وار کرنا لیکن ہاتھ ذرا ہولا رکھنا،وہ بھائی ہے میرا۔''

''نو۔'' اُس نے انکار میں سر ہلایا۔'' مجھے کسی پاگل کتے نے تو نہیں کاٹا کہ میں ایک پٹھان سے پنگا مول لوں؟ یہ کام تجھے اپنے دست مبارک سے سرانجام دینا پڑے گا، مجھے ہیرو بننے کا کوئی شوق نہیں ہے۔''

''وہ بھائی ہے میرا، میں اُس پر کیسے وار کر سکتا ہوں؟ میں نے جواز پیش کیا۔

''جیسے دل چاہے ویسے کرنا مگر پلیز مجھے معاف رکھو۔''

''بزدلی کی باتیں مت کرو یار......تم ملک ہو کچھ اپنی برادری ہی کا بھرم رکھ لو۔''

''کیوں......ملک کوئی ٹارزن ہوتے ہیں؟ مجھے بانس پر مت چڑھاؤ، میں یہیں زمین پر ٹھیک ہوں۔'' اُس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

اسی دوران ولی خان اور مہردل کی آوازیں قریب پہنچ گئیں۔ اب راشد سے بحث کرنا فضول تھا۔ سو میں نے خود ہی یہ رسک مول لینے کا ارادہ کر لیا۔ میں نے برش کو مضبوطی سے دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔ میرے اعصاب اُس وقت تنے ہوئے تھے اور میں حملہ کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ وہ دونوں پشتو میں باتیں کرتے ہوئے لحہ بہ لحہ کمرے کے قریب آنے لگے۔ ڈسپنسر ولی خان چونکہ ہمارے ارادے سے لاعلم تھا اس لیے وہ مہردل کو باآسانی قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

''کوئی پریشانی والی بات تو نہیں ہے ناں؟'' کمرے کے عین سامنے پہنچ کر مہردل نے ولی خان سے سوال کیا۔

ولی خان بولا۔'' خان جی! آپ مطمئن رہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کیا پتا آپ کی موجودگی میں وہ یہیں پہ ٹھیک ہو جائے۔''

''میری موجودگی میں وہ کیا خاک ٹھیک ہوگا؟'' مہردل کی طنزیہ آواز سنائی دی۔'' ہم دونوں بس صرف نام کے بھائی ہیں۔ شیردل میں پٹھانوں والی کوئی ایک خوبی بھی نہیں ہے۔ وہ انتہائی بزدل اور احمق انسان ہے۔ پٹھان ہو کر بھی اُس نے آج تک چڑیا کا بچہ تک نہیں مارا۔''

وہ دونوں شاید کمرے کے سامنے رُک گئے تھے۔ اپنے متعلق مہردل کے خیالات جان کر مجھے بے حد افسوس ہوا، میں اُس کا بڑا بھائی تھا مگر اُس کے دل میں میرے لیے کوئی احترام اور عزت کے جذبات نہیں تھے۔ وہ قطعی اَن پڑھ تھا، سو رشتوں کی اہمیت سے ناواقف تھا۔ لیکن میں رشتوں کی اہمیت سے نہ صرف واقف تھا بلکہ دل سے

رشتوں کا احترام کرتا تھا۔ مجھے بابا جان، مور جان، زرغونہ اور مہردل اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھے۔

ولی خان بولا۔ ''کوئی بات نہیں خان جی....... دراصل شیردل خان دل کا ذرا نرم واقع ہوا ہے۔ وہ پڑھا لکھا ہے ناں! اس لیے لڑائی جھگڑوں سے دُور رہتا ہے۔''

''اچھا چھوڑو اس بات کو وہ کہاں ہے؟'' مہردل نے سوال کیا۔

''اسی کمرے میں ہے۔ آپ آئیں۔'' ولی خان نے جواب دیا۔

میرے اعصاب یک دم تن گئے اور میں نے برش کو سر سے اُونچا کرلیا۔ میں کسی طرح بھی مہردل کو سنبھلنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ دونوں ایک ساتھ کمرے کے اندر داخل ہوئے اور پھر اس سے قبل کہ وہ ہماری عدم موجودگی پر کسی تعجب کا اظہار کرتے میں نے مہردل کے سر پر برش سے ایک زوردار وار کردیا۔ اُس نے چلا کر دونوں ہاتھ اپنے سر کی طرف بڑھائے لیکن اس دوران میں نے دوسرا وار کردیا اور وہ لہراتا ہوا زمین بوس ہو گیا۔ اُس وقت میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ یہ سب کچھ جیسے خودکار انداز میں ہوا تھا۔ مجھے کچھ پتا ہی نہیں چلا تھا۔

''شیردل! کیا تم پاگل ہو چکے ہو؟'' معاً میری سماعتوں سے مہردل کی آواز ٹکرائی اور میں جیسے ہوش آ گیا۔'' احمق انسان! تم نے بلاوجہ ولی خان کو گھائل کردیا ہے۔'' وہ یوں بدتمیزی سے بات کررہا تھا جیسے بڑے بھائی سے نہیں گھر کے کسی نوکر سے مخاطب ہو۔

چند لمحے تو میں پریشانی کے عالم میں مہردل کو اس طرح دیکھتا رہا جیسے میرے سامنے کوئی عجوبہ کھڑا ہو۔ میں دل ہی دل میں خود کو کوس رہا تھا۔ میری جلد بازی نے سارا کھیل بگاڑ دیا تھا۔

''ویل ڈن مسٹر شیردل ویل ڈن۔'' راشد نے باقاعدہ تالی بجاتے ہوئے مداخلت کی۔ ''کمال کردیا ہے تم نے یار....... انکل دلاور بلاوجہ تجھے ڈانٹتے رہتے ہیں۔ مجھے تو آج پتا چلا کہ تم اتنے بہادر ہو۔''

''بکواس مت کرو....... یہ سب تمہارا قصور ہے۔'' میں نے سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''تم اگر میرا ساتھ دیتے تو آج ہمارا پلان یوں ناکام نہ ہوتا۔''

وہ بولا۔ ''اپنی حماقت دوسروں کے سر تھوپنا شاید تمہاری پُرانی عادت ہے....... شرم کرو یار! اس میں

بھلا میرا کیا قصور ہے؟''

''یہ.........یہ کیا چکر ہے؟'' مہردل چونکہ اُردو سے نابلد تھا اس لیے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اُس نے مجھ سے سوال کیا۔

''میں نے کہا۔''پہلے ولی خان کو ہوش میں لانا ضروری ہے۔اس کے بعد میں تجھے سب کچھ بتادوں گا۔''

مہردل سر ہلا کر خاموش ہوگیا جب کہ میں اور راشد ولی خان کی طرف متوجہ ہوگئے جو کمرے کے فرش پر پڑا ناکردہ گناہ کی سزا بھگت رہا تھا۔ہم نے دورانِ تعلیم فرسٹ ایڈ کے متعلق نہ صرف پڑھا تھا بلکہ عملی طور پر بھی یہ کام سرانجام دیا تھا۔چنانچہ ولی خان کو بیڈ پر لٹا کر اُسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگے۔سب سے پہلے ہم نے ولی خان کی نبض دیکھی جو نارمل تھی اس کے بعد اُس کا سر چیک کیا۔سر پر کوئی زخم وغیرہ نہیں تھا تاہم ایک اچھا خاصا گومڑ نمودار ہو چکا۔ولی خان کو چیک کرنے کے بعد ہم مطمئن ہوگئے۔خطرے والی کوئی بھی بات نہیں تھی۔چند لمحوں کے بعد اُس نے ویسے ہی ہوش میں آجانا تھا۔چنانچہ ہم نے اُس کے ہاتھ پیر سہلانے اور چہرے پر پانی کے چھینٹے مارنے پر اکتفا کیا۔

تقریباً پندرہ بیس منٹ کے بعد ولی خان کو ہوش آگیا۔وہ چند لمحے تو کھوئی کھوئی نگاہوں سے ہمیں دیکھتا رہا پھر سر کے گومڑ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اُٹھ بیٹھا۔

''شکر ہے کہ تمہیں ہوش آگیا'' میں نے مسکرا کر کہا۔''ورنہ ہم تو ڈر گئے تھے کہ پتا نہیں کیا ہوگا؟''

''مجھ پر وار کس نے کیا تھا؟'' اُس نے استفسار کیا۔

''دراصل یہ سب کچھ غلط فہمی کی وجہ سے ہوا ہے ورنہ میرا ارادہ تو کچھ اور تھا۔''میں نے جواب دیا۔

''شاید مجھے جان سے مارنے کا تھا؟''

''تم غلط سوچ رہے ہو۔'' اتنا کہہ کر میں نے اُسے اپنے پلان سے آگاہ کردیا۔

''اوہ.........'' وہ مسکرایا۔''اس کا مطلب ہے کہ مجھے مہردل کے حصے کی سزا بھگتنا پڑ گئی تھی؟''

''بالکل یہی بات ہے۔''میں نے اثبات میں سر ہلایا۔''ورنہ تم سے میری کوئی دشمنی تو نہیں ہے؟''

''بھائی جان!'' ساری کہانی سننے کے بعد مہردل نے مداخلت کی۔''میں آپ کے جذبات کو قدر کی نگاہ سے

دیکھتا ہوں مگر مجھے آپ سے اتفاق نہیں ہے۔ میں نے دشمنوں سے بھاگنا نہیں سیکھا بلکہ مردوں کی طرح دشمن کا مقابلہ کرنا سیکھا ہے۔ آپ اگر میرے بڑے بھائی نہ ہوتے تو اب تک نہ جانے میں کیا کر چکا ہوتا؟“

”مہردل! میرے بھائی تم سمجھتے کیوں نہیں...... یہاں تمہاری زندگی کو سخت خطرہ ہے۔ پلیز میری بات مان لو میں تجھے............“

”بس......“ اُس نے ہاتھ اُٹھا کر میری بات کاٹ دی۔ ”زندگی اور موت کا مالک اُوپر بیٹھا ہے اور اُس سے کوئی بھی نہیں چھپ سکتا۔ وہ پشاور تو کیا پاتال سے بھی آدمی کو ڈھونڈ نکالتا ہے۔ جو رات قبر میں آنی ہے وہ ہر قیمت پر اپنے مقررہ وقت پر ہی آئے گی۔ آپ اور میں کچھ بھی نہیں کر سکتے۔“

”تم کبھی نہیں سمجھو گے۔“ میں نے ایک آہ خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”میں پتھر سے سر پھوڑ رہا ہوں شاید۔“

”شاید نہیں یقیناً کہو۔“ اُس نے مسکرا کر کہا۔ ”میں آپ کی طرح ڈر ڈر کر نہیں جی سکتا......... جب ایک دن مرنا ہی ہے تو پھر ڈرنا کیسا؟“

اُس رات میں دیر گئے تک مہردل کو قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر اُس نے میری ایک بھی نہ سنی۔ سو تھک ہار کر میں راشد کے ساتھ پشاور کی طرف روانہ ہو گیا۔



پشاور آئے مجھے دو دن گزر چکے تھے۔ اس دوران میں مہردل سے بات کرتا رہا تھا مگر وہ پشاور آنے کے لیے قطعی تیار نہیں تھا بلکہ اُلٹا مجھے واپس آنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ اب تو مجھے مہردل اور بابا جان کی ہٹ دھرمی پر غصہ آنے لگا تھا مگر میں اُن سے اپنی بات کسی طرح بھی نہیں منوا سکتا تھا۔ سو میں نے اُنھیں اُن کے حال پر چھوڑ دیا کہ اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ راشد نے بھی مجھے یہی مشورہ دیا تھا کہ میں اُنھیں کچھ نہ کہوں، وہ جیسا چاہتے ہیں اُنھیں ویسا ہی کرنے دوں کیونکہ قسمت کے لکھے کو کوئی بھی نہیں ٹال سکتا جو ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ چنانچہ میں نے راشد کی مان کر وقتی طور پر گھر والوں سے رابطہ منقطع کر لیا تھا۔

تیسرے دن بالکل غیر متوقع طور پر مجھے ایک اجنبی نمبر سے بیل آنے لگی۔ یہ بیل میرے اُسی اَن رجسٹرڈ نمبر پر آ رہی تھی جو میں نے اشتہار میں درج کروایا تھا۔ میرے پاس ڈوئل سم موبائل فون تھا۔ چنانچہ میں نے جس

دن اشتہار دیا تھا اُسی دن وہ سم بھی سیل فون میں ڈال دی تھی۔ دن کے تقریباً دس بجے کا وقت تھا اور میں تھوڑی قبل ہی ناشتے سے فارغ ہوا تھا۔ چوتھی بیل پر میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے سیل فون کان سے لگا دیا۔ ''ہیلو......کون صاحب بات کر رہے ہیں؟'' میری سماعتوں سے ایک اجنبی مردانہ آواز ٹکرائی۔

''میں ندیم بات کر رہا ہوں......آپ کون؟'' میں نے ایک فرضی نام بتاتے ہوئے سوال کیا۔

''ندیم صاحب! میں اُس لڑکی کو جانتا ہوں جس کے بارے میں آپ نے اخبار میں اشتہار دیا تھا۔ کیا آپ اُس سے ملنا چاہیں گے؟''

دل میرے پہلو میں یوں اُچھلنے لگا جیسے سینے کا پنجرہ توڑ کر باہر آنے لگا ہو۔ وہ جسے دیکھنے کے لیے میں کب سے ترس رہا تھا۔ یوں اچانک مل جائے گی، یہ میرے تصور سے باہر تھا۔ تاہم میں نے اپنی خوشی چھپاتے ہوئے کہا۔ ''ضرور ملنا چاہوں گا......اشتہار اسی لیے تو دیا تھا۔''

''تو پھر کب مل رہے ہو؟'' اُس نے استفسار کیا۔

''آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟'' میں نے جواب دینے کی بجائے اُلٹا سوال کر دیا۔

''جہاں سے دوسرے لوگ بولتے ہیں، میں بھی وہیں سے بول رہا ہوں۔''

''کیا مطلب......میں سمجھا نہیں؟'' میں نے گڑبڑا کر پوچھا۔

وہ بولا۔ ''ندیم صاحب! مذاق تو نہ کریں ناں......کیا آپ نہیں جانتے کہ سب لوگ مونہہ سے بولتے ہیں؟''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا بھئی!'' نہ چاہتے ہوئے بھی میری ہنسی چھوٹ گئی۔ ''دراصل میں یہ پوچھ رہا تھا کہ آپ کس جگہ، کس مقام سے بات کر رہے ہیں؟''

''اوہ......آئی ایم سوری ندیم صاحب!'' اُس کے لہجے سے ندامت جھلکنے لگی۔ ''پلیز بُرا مت منانا......دراصل میں سمجھا کہ آپ مذاق کر رہے ہیں......تو اس لیے میں نے ایسا بول دیا ورنہ میں کبھی کسی سے مذاق نہیں کرتا۔''

''اٹس اوکے......اب براہِ کرم یہ بتا دیں کہ آپ کس جگہ سے بات کر رہے ہیں؟''

”راولپنڈی سے۔“ اُس نے مختصر سا جواب دیا۔

”ٹھیک ہے تو پھر میں کب آجاؤں راولپنڈی؟“ میں نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

”صبر کریں ندیم صاحب صبر......... جلد بازی آپ کا کام بگاڑ دے گی۔ دراصل وہ لڑکی کچھ خراب قسم کے لوگوں کے ہاتھ لگ چکی ہے۔ میں کسی نہ کسی طرح اُس تک آپ کا پیغام پہنچا دوں گا۔ اس کے بعد ملنے کا وقت اور مقام طے کرلیں گے۔“

میں نے کہا۔ ”شاید آپ نے اشتہار غور سے نہیں پڑھا......... اُس لڑکی کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ہے، وہ تو مجھے پہچاننے سے بھی انکار کردے گی۔ آپ سے کہے گی کہ میں کسی ندیم صاحب کو نہیں جانتی۔ ایسی صورت میں آپ اُسے ملاقات کے لیے کیسے راضی کریں گے؟“

وہ بولا۔ ”یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں، میں اُسے کسی نہ کسی طرح باہر نکال لاؤں گا...... اس کے بعد آپ جانیں اور وہ لڑکی...... ویسے وہ اپنا نام سلمٰی بتاتی ہے جب کہ آپ نے اشتہار میں اُس کا نام لبنیٰ بتایا تھا۔“

”ہاں...... مگر اس کی وجہ میں نے اشتہار میں بتادی تھی کہ وہ اپنا نام غلط کیوں بتاتی ہے؟“ میں نے جواب دیا۔

”ایک سوال کروں آپ بُرا تو نہیں منائیں گے؟“

”نہیں بُرا کیوں مناؤں گا......... پوچھیں کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟“

”آپ اُس لڑکی کے کون لگتے ہیں...... بھائی، کزن یا پھر منگیتر وغیرہ؟“

”وہ......... وہ میری زندگی ہے یار۔“ میں نے جذب کے عالم میں جواب دیا۔ ”پلیز اُس کا خیال رکھنا...... اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔“

”میرا نام راجا طارق ہے ندیم صاحب! آپ بے فکر رہیں میرے ہوتے ہوئے لبنیٰ بی بی کا کوئی بال بھی بیکا نہیں کرسکتا۔“

”یہ آپ کا مجھ پر احسان ہوگا۔“ میں نے ممنون انداز میں جواب دیا۔

”تو...... احسان کیسا ندیم صاحب! یہ تو سودا ہے۔ میں اس کام کا آپ سے معاوضہ لوں گا......... دراصل خلقِ خدا کے کام آنا میرا کاروبار ہے اور یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ کوئی کاروبار بغیر پیسوں کے نہیں ہوتا۔“

”چلو ٹھیک ہے مجھے منظور ہے۔“ میں نے رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”مگر وہ لڑکی اگر لبنیٰ نہ نکلی تو ایسی صورت میں آپ کو ایک روپیا بھی نہیں ملے گا۔“

”مجھے حرام کھانے کی عادت نہیں ہے ندیم صاحب! وہ لڑکی اگر لبنیٰ نہ نکلی تو میں خود بھی آپ سے کچھ لینا پسند نہیں کروں گا۔“

”اوکے میں آپ کی کال کا انتظار کروں گا۔“

”ٹھیک ہے میں بہت جلد آپ سے دوبارہ رابطہ کروں گا“ اُس نے جواب دے کر رابطہ منقطع کر دیا۔

☆......☆......☆

اُس دن جب لنچ پر میری راشد کے ساتھ ملاقات ہوئی تو میں نے اُسے راجا طارق کے فون کے متعلق بتا دیا۔ ساری بات غور سے سُننے کے بعد وہ بولا۔ ”مجھے تو یہ شخص فراڈ لگتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تمہیں کسی مصیبت میں پھنسا دے۔“

”نہیں یار۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ بھلا مجھ سے کیا فراڈ کرے گا؟“

”تم رہتے کس دنیا میں ہو جناب؟.......... آج کل فراڈ لوگوں نے سادہ دل لوگوں کو لوٹنے کے لیے ایسے ایسے طریقے ایجاد کر لیے ہیں کہ لٹنے والے کو آخر تک خبر نہیں ہوتی کہ اُسے اُلو بنایا جا رہا ہے اور تم تو ویسے بھی پٹھان ہو جو آدھا اُلو پہلے سے ہوتا ہے۔“

”بکواس مت کرو یار۔“ میں نے بگڑ کر کہا۔ ”پٹھانوں جیسی ذہین قوم تمہیں روئے زمین پر کہیں نہیں ملی گی۔“

”بجا فرمایا ہے جناب نے۔“ وہ مسکرایا۔ ”تمہاری ذہانت ہی کی وجہ سے تو تمہیں خوابوں نے اُلو بنا رکھا ہے۔“

”اُڑا لو جتنا مذاق اُڑا سکتے ہو اُڑا لو مگر مجھے یقین ہے کہ ایک دن میرا خواب ضرور سچ ثابت ہو گا۔“

”اوکے میں دعا کروں گا کہ اللہ تعالیٰ جلد تمہارا خواب سچا ثابت کر دے۔“

”آمین۔“ میں نے صدقِ دل سے کہا اور پھر لنچ کرنے لگا۔

ہم ابھی لنچ سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ حنا برتن سمیٹنے کے لیے پہنچ گئی۔ وہ نہایت ہی سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے ناراض ہے مگر میں اُسے جھوٹے خواب دکھا کر خوش فہمی میں مبتلا رکھنا نہیں چاہتا

تھا۔ سو اُس سے لاتعلق سا ہو کر بیٹھا رہا۔ تاہم راشد نے اُسے برتن سمیٹتے دیکھ کر پوچھا۔ ”امی کہاں ہیں کہ تم برتن سمیٹنے آ گئی ہو؟“

”پڑوسیوں کے ہاں گئی ہیں۔“ اُس نے مختصر سا جواب دیا۔

”کب تک لوٹیں گی؟“ راشد نے پوچھا۔

”یہ تو مجھے معلوم نہیں ہے۔ ہاں اگر کوئی کام ہے تو آپ مجھے بتا سکتے ہیں۔“

”نہیں تم جاؤ......اگر کوئی کام ہو گا تو بتا دوں گا۔“

وہ برتن اُٹھا کر دروازے کی طرف بڑھی اور پھر مجھ پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر باہر نکل گئی۔

”شیر دل!“ حنا کے باہر نکلتے ہی راشد نہایت ہی سنجیدگی کے عالم میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”حنا میری اکلوتی اور بہت ہی لاڈلی بہن ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ وہ تمہیں دل و جان سے چاہتی ہے۔ مجھے امی نے سب کچھ بتا دیا ہے کہ حنا شیر دل کو پسند کرتی ہے۔ ابو کو بھی اس بات کا علم ہے۔ امی اور ابو دونوں نے مجھے زور دے کر کہا ہے کہ میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کروں کہ تم حنا کو اپنا جیون ساتھی بنا لو مگر میں ایک دوست پر اپنی مرضی مسلط کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ تاہم تم سے اتنی گزارش ضرور کروں گا کہ اگر تم اُس گم نام محبوبہ کو تلاش کرنے میں ناکام ہو جاؤ تم پھر لوٹ آنا، حنا سے اچھا اور مخلص جیون ساتھی تمہیں کہیں بھی نہیں ملے گا۔“

”میں سمجھتا ہوں میرے دوست!“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری بہن لاکھوں میں نہیں بلکہ کروڑوں میں ایک ہے۔ میں تمہاری وسیع القلبی کی بھی داد دیتا ہوں کہ تم نے بہن کے کردار پر اُنگلی اُٹھانے کی بجائے اُس کا ساتھ دینا پسند کیا ہے۔ ایک پڑھے لکھے اور باشعور انسان سے یہی توقع کی جا سکتی ہے لیکن میرے حالات بھی تمہارے سامنے ہیں میں زندگی کے آخری سانس تک اُس خواب والی کو تلاش کرنا چاہتا ہوں۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ کہیں نہ کہیں ضرور موجود ہے اور اُسے میری ضرورت ہے۔ میں اُس کی تلاش میں دنیا کے آخری کونے تک جانا چاہتا ہوں۔“

وہ بولا۔ ”میں نے یہ تو نہیں کہا کہ تم اُس کی تلاش ترک کر دو.....میں تو صرف اتنا چاہتا ہوں کہ اگر زندگی کے کسی موڑ پر تم اُس کی تلاش سے اکتا جاؤ تو پھر میری بہن کو مت بھلانا۔ اس گھر کے دروازے تمہارے لیے

ہمیشہ کھلے رہیں گے۔"

میں نے کہا۔ "راشد! تمہیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ناکامی کی صورت میں تمہارا گھر میرا آخری ٹھکانا ہوگا۔ تاہم ایک دوست ہونے کے ناتے میں تم سے یہ درخواست ضرور کروں گا کہ میری کامیابی کے لیے ہمیشہ دعا کرتے رہنا۔ میں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کی اُن دعاؤں کو ضرور قبول کرتا ہے جو وہ دوسرے انسانوں کے حق میں کرتا ہے۔"

"یہ دعا تو حنا بھی تمہارے حق میں کرتی رہتی ہے۔" اُس نے جواب دیا۔

"کیا......کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟" میں نے تحیر کے عالم میں پوچھا۔

"سو فی صد سچ کہہ رہا ہوں۔ اگر یقین نہیں آتا تو امی سے پوچھ لینا۔"

"کاش اے کاش کہ میرا اپنے دل پر بس چلتا۔" میں نے ندامت سے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ "حنا واقعی عظیم ہے۔ میں ہی اُس کے لائق نہیں ہوں شاید۔"

"کوئی بات نہیں یار! میں تمہاری پرابلم سمجھتا ہوں۔ ڈونٹ وری جو اللہ کرے گا وہی بہتر ہوگا۔" وہ تسلی آمیز انداز میں بولا۔ "تم خود کو دوش مت دو کہ انسان تقدیر کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے۔"

"راشد! میں شرمندہ ہوں یار! دراصل مجھے علم ہی نہیں تھا کہ حنا........"

"نہیں......" اُس نے میری بات کاٹی۔ "تمہیں شرمندہ ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی تم سے ناراض نہیں ہے......چلو اب ان باتوں کو چھوڑو، تھوڑی دیر آرام کرتے ہیں اس کے بعد گھومنے چلیں گے۔"

ہم دونوں اُٹھ کر راشد کے بیڈروم کی طرف چل دیے جو ڈائننگ روم کے ساتھ ہی واقع تھا۔

☆......☆......☆

دو دن مزید گزر گئے۔ میں شدت کے ساتھ راجا طارق کی کال کا منتظر تھا کہ تیسرے روز عین ناشتے کے ٹائم مجھے راجا طارق کی کال موصول ہوئی۔ "کیسے ہو ندیم صاحب؟ رابطہ قائم ہوتے ہی اُس نے خوش اخلاقی سے سوال کیا۔

"اللہ کا کرم ہے۔آپ سنائیں؟" میں نے جواب دیا۔

وہ پُرجوش انداز میں بولا۔"آپ کا کام ہوگیا ہے جناب، وہ آپ سے ملنے کے لیے تیار ہے۔"

"کب اور کہاں؟" میں نے خوشی کے عالم میں پوچھا۔

"آپ راولپنڈی آسکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں آسکتا......آپ جگہ اور وقت بتائیں۔" میں نے بے تابی سے جواب دیا۔

"اوکے......مگر پہلے چند ہدایات سن لیں، پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ اکیلے آئیں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ میرا معاوضہ کیش کی صورت میں ساتھ لائیں گے جو کہ مبلغ ایک لاکھ روپیا ہوگا اور تیسری........."

"معاوضہ کچھ زیادہ نہیں ہے؟" میں نے قطع کلامی کی۔

"اوکے......آپ کی مرضی، معاوضہ اگر زیادہ ہے تو پھر خود ڈھونڈ لیں اُسے۔ میرا وقت کیوں ضائع کرتے ہیں؟" وہ ایک دم بگڑ گیا۔

"میں مذاق کررہا تھا یار۔" میں نے بات سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔" آپ تو عورتوں کی طرح فوراً ناراض ہوگئے۔"

"مسٹر ندیم! میں اُسے جان پر کھیل کر لایا ہوں۔ ظاہر ہے آپ جب ایسی بات کریں گے تو مجھے غصہ تو آئے گا ناں؟"

"اوکے میں ایک لاکھ روپیا کیش کی صورت میں لاؤں گا۔آپ مقام اور وقت بتا دیں؟" میں نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔

وہ ایک مشہور و معروف پارک کا نام بتاتے ہوئے بولا۔" آپ وہاں آج دوپہر کے دو بجے تک پہنچ جانا، میں آپ کو لیتی بی بی کے ساتھ وہیں ملوں گا۔"

"میں آپ کو پہچانوں گا کس طرح؟" میں نے سوال کیا۔

"کیا آپ لیتی بی بی کو نہیں پہچانتے؟" اُس نے چونک کر پوچھا۔

"اُسے تو اچھی طرح پہچانتا ہوں لیکن آپ کو تو نہیں پہچانتا ناں! اس لیے کوئی مخصوص نشانی وغیرہ بتا دیں؟"

وہ بولا۔ ''میں سفید شرٹ کے ساتھ نیلی جینز میں ملوں گا اور میرے گلے میں سُرخ رومال بندھا ہوگا جب کہ لبنیٰ بی بی سیاہ رنگ کی چادر میں سرتاپا لپٹی ہوگی اور اُس کی صرف آنکھیں نظر آرہی ہوں گی۔''

''ٹھیک ہے میں پہنچ جاؤں گا۔'' میں نے جواب دیا تو اُس نے خداحافظ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔''

راشد صبح سویرے ہی ناشتا کر کے نکل جاتا تھا۔ میرے لیے یہ اچھا موقع تھا۔ میں اُس کی عدم موجودگی میں باآسانی یہاں سے نکل کر راولپنڈی جاسکتا تھا۔ میرے پاس نہ صرف جیپ موجود تھی بلکہ اے ٹی ایم کارڈ بھی تھا۔ میرے اکاؤنٹ میں اچھی خاصی رقم موجود تھی جب کہ راجا طارق نے تو صرف ایک لاکھ روپے کی ڈیمانڈ کی تھی۔ ایک لاکھ روپے کی رقم میرے لیے کوئی اتنی بڑی رقم نہیں تھی۔ چنانچہ میں اُٹھ کر عجلت میں راولپنڈی جانے کی تیاری کرنے لگا۔ ذرا دیر کے بعد میری جیپ تیزی سے راولپنڈی کی طرف رواں تھی اور میں جاگتے ہوئے اپنی گم نام محبوبہ کے سپنوں میں کھو گیا۔

میں ابھی شہر سے نکل کر کھلی شاہراہ پر پہنچا ہی تھا کہ ایسے ہی وقت میرا سیل فون بجنے لگا۔ میں نے جیب سے سیل فون نکال کر اسکرین پر نظر ڈالی تو راشد کا نام جھلملا رہا تھا۔ ایک بار تو میں نے سوچا کہ یہ کال نظرانداز کر دوں مگر پھر یہ سوچ کر کال ریسیو کرلی کہ کہیں راشد خفا نہ ہو جائے۔ وہ میرا بے حد مخلص دوست تھا اور میں اُسے کسی صورت میں بھی ناراض نہیں کرسکتا تھا۔ ''بولو راشد! کیا بات ہے؟'' میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے پوچھا۔

''تم کہاں ہو؟'' اُس نے مشکوک انداز میں پوچھا۔ ''امی کہہ رہی تھی کہ تم اکیلے ہی گھر سے گاڑی لے کر نکلے ہو؟''

''میں یہیں شہر ہی میں ہوں......... کیوں کیا بات ہے؟'' میں نے تحیر کے عالم میں سوال کیا۔

''کس جگہ پہ ہو؟''

''بتایا تو ہے کہ یہیں شہر ہی میں ہوں، آخر..........''

''شہر میں کس جگہ پر ہو؟'' اُس نے میری بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

میں تھوڑی دیر کے لیے کش مکش کا شکار ہوگیا۔ نہ میں اُسے سچ بتا سکتا تھا اور نہ ہی اُس سے جھوٹ بول سکتا تھا۔ اگر راجا طارق نے اکیلے آنے کی شرط نہ رکھی ہوتی تو میں راشد کو ضرور ساتھ لے کر جاتا۔ میں راجا طارق کی

شرط کی وجہ سے مجبور تھا۔ وہ میرے ساتھ راشد کو دیکھ کر کہیں بھی غائب ہو سکتا تھا جب کہ مجھے یہ بات کسی صورت میں بھی منظور نہیں تھی۔ اُس خواب والی محبوبہ کو دیکھنے کے لیے میں پاگل ہوا جا رہا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ ابھی اُڑ کر اُس کے پاس پہنچ جاؤں مگر چونکہ یہ ممکن نہیں تھا سو میں حتی الامکان گاڑی کو اُڑائے لیے جا رہا تھا کہ بیچ میں راشد کود پڑا تھا۔

''بتاتے کیوں نہیں ہو؟'' جب خاموشی کا وقفہ طویل ہو گیا تو راشد نے قدرے جھنجھلا کر سوال کیا۔

اب اُسے سچ بتانے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے لمحہ بھر کے لیے سوچا اور پھر کہا۔'' میں راولپنڈی جا رہا ہوں راجا طارق سے ملنے۔''

''مجھے بتائے بغیر؟'' اُس نے شکوہ کیا۔'' کیا میری یہی اوقات ہے تمہاری نظروں میں؟ پٹھان تو احسان فراموش نہیں ہوتے پھر تم نے ایسا کیوں کیا؟''

''میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔ دراصل یہ شرط راجا طارق کی طرف سے لگائی گئی ہے۔ اُس نے مجھے کسی کو ساتھ لانے سے منع کیا ہے۔ ایسی صورت حال میں، میں کیا کر سکتا تھا۔ میری مجبوری کو سمجھو یار ورنہ میں اپنی کوئی بات تم سے چھپا سکتا ہوں؟''

''اوکے........جاؤ۔'' اُس نے ناراض انداز میں جواب دیتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

مجھے اُس کی ناراضی کا لمحہ بھر کے لیے دکھ ہوا مگر میں نے سر جھٹکتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔ میں واپسی پر اُسے منا سکتا تھا۔ وہ بھائیوں سے بڑھ کر میرا دوست تھا۔ آج تک اُس نے میری کوئی بات نہیں ٹالی تھی تو اب کیسے ٹال سکتا تھا۔ پشاور سے راولپنڈی تک عموماً چار پانچ گھنٹے لگ جاتے ہیں مگر میں نے گاڑی چونکہ روٹین سے تیز چلائی تھی اس لیے پونے چار گھنٹوں کے اندر ہی راولپنڈی پہنچ گیا۔ راجا طارق نے مجھے جس پارک میں بلایا تھا وہ میرا دیکھا ہوا تھا۔ چنانچہ بغیر وقت ضائع کیے میں اُس پارک کی جانب روانہ ہو گیا۔ پارک کے مین گیٹ کے عین سامنے پہنچ کر میں نے گاڑی روک دی۔ یونہی لمحہ بھر کے لیے میں نے پارک کا جائزہ لیا اور پھر گاڑی کو گیٹ کے سامنے سے ہٹاتے ہوئے ایک سائیڈ میں پارک کر دیا وہاں پہلے سے بھی چند گاڑیاں پارک تھیں۔ میں نے گاڑی کو لاک کیا اور پھر مین گیٹ کو کراس کرتے ہوئے پارک کے اندر داخل ہو گیا۔

پارک میں بہت کم لوگ موجود تھے۔ میں دائیں بائیں لوگوں پہ نظر ڈالتا آگے بڑھتا چلا گیا مجھے کسی ایسے شخص کی تلاش تھی جس نے سفید شرٹ کے ساتھ نیلی جینز پہن رکھی ہو اور گلے میں سرخ رومال بھی باندھ رکھا ہو۔ نشانی چونکہ مخصوص تھی اس لیے مجھے اُس شخص کو تلاش کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ وہ پارک میں موجود ایک کیفے ٹیریا کے سامنے تشریف فرما تھا اور غالباً کافی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میں نے اُس کے سامنے پہنچ کر سلام کیا تو وہ مستعد ہو گیا اور اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ وہ عام سی شکل وصورت کا ایک عام سا شخص تھا۔ عمر میرے اندازے کے مطابق پینتیس اور چالیس کے درمیان تھی اُس نے غور سے میری طرف دیکھا اور پھر مسکرا کر پوچھا۔ ''آپ ندیم صاحب ہیں ناں؟''

''ہاں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''میں ندیم ہی ہوں اور وعدے کے مطابق اس وقت آپ کے سامنے موجود ہوں مگر آپ تو اکیلے ہیں؟''

وہ بولا۔ ''فکر کیوں کرتے ہو، آپ کا مہمان بھی یہیں موجود ہے بس حفظِ ماتقدم کے طور پر فی الحال آپ کی نگاہوں سے اوجھل ہے۔ دراصل اُس گینگ کی طرف سے مجھے خطرہ ہے کہ وہ اُسے دوبارہ اغوا نہ کرلیں۔''

''طارق صاحب! پلیز مجھے اُس سے ملوایئے ناں؟'' میں نے بے صبری کا مظاہرہ کیا۔

''جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے میاں! پہلے کچھ پیٹ پوجا تو کر لیجیے بعد میں اُس سے بھی ملوا دوں گا۔ ابھی بھی کیا جلدی ہے؟'' اُس نے بے نیازی کے عالم میں جواب دیا۔

میں نے کہا۔ ''میں جب تک اُسے نہیں دیکھ لیتا میرے حلق سے پانی کا ایک گھونٹ بھی نہیں اُترے گا۔''

بہت بے صبرے ہو یار۔'' وہ مسکرایا اور پھر بل چکانے کے لیے کاؤنٹر کی طرف چل دیا۔

کاؤنٹر پر اُس نے بل ادا کیا اور پھر میرے پاس آکر بولا۔ ''آپ اپنی گاڑی لے کر آئے ہیں ناں؟''

''ہاں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''میرے پاس اپنی گاڑی ہے۔''

''اچھی بات ہے آؤ چلتے ہیں۔'' اُس نے مجھے اُٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''مگر آپ نے تو کہا تھا کہ وہ آپ کے ساتھ ہوگی؟'' میں نے کشمکش کے عالم میں سوال کیا۔

''میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا، وہ پارک کے باہر ایک گاڑی میں موجود ہے۔'' وہ قدرے ناراضی کے عالم

میں جواب دیتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

میرے پاس اُس کی پیروی کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔سو میں بھی اُس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔پارک سے باہر نکلتے ہی وہ بائیں ہاتھ موجود ایک ڈارک شیشوں والی گرین کلر کی بند وین کی طرف بڑھ گیا۔قریب پہنچ کر اُس نے ہینڈل کھینچا تو وین کی کھڑکی ایک طرف سرکتی چلی گئی۔

☆......☆......☆

''جلدی سے اندر آ جاؤ۔''اُس نے مجھے ہاتھ سے اشارہ کیا۔''ہم گاڑی میں بیٹھ کر بات کریں گے۔''

میں جوش اور خوشی کی ملی جلی کیفیت میں آگے بڑھا اور بغیر کچھ دیکھے بھالے وین کے اندر داخل ہو گیا۔وین کے اندر کا منظر میری توقع کے بالکل خلاف تھا۔وہاں تین اسلحہ بردار نوجوان موجود تھے جنہوں نے مجھے طنزیہ انداز میں گھورا اور پھر اُن میں سے ایک بولا۔''ہم دل کی گہرائیوں سے سردارزادہ شیر دل خان کا سواگت کرتے ہیں۔''

''تت......تت......تم لوگ کون ہو؟''میں نے اچانک لگنے والے جھٹکے سے سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہم تمہارے دوست ہیں۔''مجھے راجا طارق کی آواز سنائی دی جو اس دوران اندر آ کر وین کی کھڑکی بند کر چکا تھا۔''تم چاہو تو میں تجھے اب بھی آپ جناب کہہ کر مخاطب کر سکتا ہوں مگر دوستوں میں یہ آپ، جناب جیسے الفاظ کچھ اجنبی سے لگتے ہیں۔''

''راجا طارق!تم نے مجھے دھوکا دے کر اچھا نہیں کیا۔تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔''میں نے دھمکی آمیز انداز میں جواب دیا۔

''آرام سے بیٹھے رہو۔''وہ غرایا۔''میں جانتا ہوں کہ تم کتنے بہادر ہو؟''

''راجا طارق!میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔بہتر ہو گا کہ مجھے چھوڑ دو ورنہ ایک دن پچھتاؤ گے۔''

''تم ......تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟''وہ ایک دم بھڑک اُٹھا۔''بزدل باپ کی بزدل اولاد!میں تجھے............''

اُس کا پُرنخوت لہجہ اور گالی سن کر زندگی میں پہلی بار میرے ٹھنڈے خون میں آگ کی چنگاری سی سلگ اُٹھی۔ وہ اگر باباجان کو بزدل نہ کہتا تو شاید میں یہ انتہائی قدم اُٹھانے سے قبل کئی بار سوچتا لیکن باباجان کو بزدل کہہ کر اُس نے میری امن پسندی کا خون کر دیا تھا۔ ایسی گالی میں نے زندگی میں پہلی بار سنی تھی، اس سے قبل کبھی کسی نے مجھے باپ کی گالی نہیں دی تھی۔ شاید میری سوئی ہوئی غیرت کو جاگنے کے لیے کسی ایسے ہی لمحے کی تلاش تھی جو راجا طارق نے مجھے مہیا کر دیا تھا۔ ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں، میں نے مارڈالو یا مرجاؤ کا فیصلہ کیا اور راجا طارق کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی اُس پر جھپٹ پڑا۔

میرا وزنی ہاتھ گھونسے کی صورت اُس کے چہرے پر پڑا اور پھر دونوں ہاتھ کسی شکنجے کی طرح اُس کی موٹی گردن پر جم کر رہ گئے۔ وہ جسمانی طور پر مجھ سے بہت کمزور تھا۔ چنانچہ خود کو چھڑانے کے لیے زور لگانے لگا مگر مجھ پر تو اُس وقت جنون سوار ہو چکا تھا۔ لگتا تھا کوئی نادیدہ قوت میرے جسم میں سرایت کر گئی ہے۔ اُس کے تینوں مسلح ساتھی میری پشت پر گھونسے، مکے اور رائفلوں کے دستے آزما رہے تھے لیکن مجھے پٹنے کا احساس ہی نہیں ہو رہا تھا۔ میں بدستور راجا طارق کا گلا دبائے جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اُس کی آنکھیں حلقوں سے باہر اُبلنے لگیں اور اُس نے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیے۔ شاید وہ مر چکا تھا یا پھر وقتی طور پر بے ہوش ہو گیا تھا۔ اُس کے ساتھی بدستور میری پشت پر قوت آزمائی کرنے میں مصروف تھے۔ ایسے ہی وقت اُن میں سے کسی نے پوری طاقت کے ساتھ میرے سر پر وار کیا اور میری آنکھوں کے سامنے رنگ برنگے ستارے سے ناچنے لگے۔ راجا طارق کی گردن پر میرے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر دوسرے وار نے مجھے دنیا و مافیہا سے غافل کر دیا اور میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔



میں نجانے کتنی دیر تک بے ہوش رہا تھا۔ تاہم جب میں ہوش میں آیا تو میں نے خود کو ایک ایسے کمرے کے ٹھنڈے فرش پر پایا جو بالکل قید خانے کی طرح تھا۔ ہوش میں آتے ہی میرے ہاتھ بے اختیار سر کی جانب اُٹھے۔ وہاں بینڈیج موجود تھی۔ جو یقیناً اغوا کاروں نے کی تھی۔ میں چند لمحے کمرے کے ٹھنڈے فرش پر بیٹھا رہا، پھر اُٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ کمرے کا دروازہ سلاخوں والا تھا۔ کمرے کی بناوٹ سے صاف عیاں ہو رہا تھا کہ وہ

قید خانہ ہے۔ میں اغوا کاروں کے عزائم سے کلی طور پر ناواقف تھا۔ مجھے کچھ بھی معلوم نہیں تھا کہ اُنہوں نے مجھے کیوں اور کس مقصد کے لیے اغوا کیا ہے؟

موسم چونکہ سرما کا تھا اس لیے جلد ہی شام کے سائے ڈھلنے لگے۔ میں دروازے کی سلاخیں پکڑ کر باہر جھانکنے لگا۔ کمرے کے سامنے ہی کاریڈور تھا جو اُس وقت خالی پڑا ہوا تھا۔ کاریڈور سے آگے کشادہ لان تھا جس میں ایک ٹیبل کے گرد چند کرسیاں رکھی ہوئی تھیں مگر وہ کرسیاں بھی اُس وقت خالی پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے اِدھر اُدھر بھی دیکھنے کی کوشش کی، جہاں تک میری نظر کام کرتی تھی میں نے وہاں تک دیکھا لیکن میری نظر ناکام و نامراد ہو کر ہی لوٹی تھی۔ مجھے وہاں کوئی شخص بھی نظر نہیں آیا تھا۔ اچانک کسی خیال کے تحت میں نے اپنی جیبیں ٹٹولیں مگر سب جیبیں بھکاری کے کاسے کی مانند خالی تھیں۔ اُنھوں نے میری جیب سے والٹ، سیل فون، گاڑی کی چابی اور نقد رقم کے علاوہ چند ایک وزٹنگ کارڈ بھی نکال لیے تھے ان کارڈز میں اے ٹی ایم کارڈ بھی شامل تھا۔ میرے اکاؤنٹ میں لگ بھگ سات لاکھ روپے کی رقم موجود تھی چونکہ پن کوڈ معلوم کیے بغیر وہ یہ رقم نہیں نکلوا سکتے تھے، سو میں قدرے مطمئن ہو گیا۔

اسی اثناء میں شام کا اندھیرا چھانے لگا۔ تب میں نے پریشان ہو کر پہلی بار آواز لگائی۔ ”کوئی ہے تو پلیز سامنے آئے مجھے پیاس لگی ہے۔“ مگر کوئی جواب نہ ملا تب میں نے اُنہیں زور زور سے پکارنا شروع کر دیا۔ لیکن ردِعمل میں خاموشی ہی چھائی رہی، کوئی بھی شخص میرے سامنے نہیں آیا تھا۔ یا تو اُس عمارت میں کوئی انسان موجود نہیں تھا یا اگر موجود بھی تھا تو وہ انسانیت سے گرا ہوا تھا یا پھر گونگا اور بہرا تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا مجھ پر جھنجلاہٹ طاری ہونے لگی۔ ساتھ ساتھ مجھے اغوا کاروں پر بے تحاشا غصہ بھی آنے لگا تھا۔ حرام زادے مجھے قید میں ڈال کر بھول گئے تھے کہ زندہ انسان کو کھانے پینے کے علاوہ اور بھی بہت کچھ چاہیے ہوتا ہے۔ پکارتے پکارتے جب میں تھک گیا تو تب غصے میں آ کر اُنہیں گالیاں دینے لگا۔

ایسے ہی وقت جب میں انہیں گالیاں دے رہا تھا بالکل غیر متوقع طور پر نہ صرف کاریڈور بلکہ میرے قید خانے کی لائیٹ بھی جل اُٹھی۔ پھر مجھے برآمدے میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی۔ چند لمحوں کے بعد دو مسلح شخص میرے سامنے تھے۔ اُنہیں دیکھتے ہی میں پہچان گیا۔ یہ دونوں وہی تھے جو مجھے اغوا کرتے وقت

راجا طارق کے ساتھ تھے۔ لمحہ بھر کے لیے وہ مجھے کینہ توز نگاہوں سے گھورتے رہے اس کے بعد اُن میں سے ایک بولا۔ ''کیوں چلا رہے ہو.........کیا تکلیف ہے تمہیں؟''

''تکلیف کے بچے! مجھے کھانا چاہیے، میں انسان ہوں کوئی روبوٹ نہیں ہوں۔'' میں نے غصے کے عالم میں جواب دیا۔

''کھانے میں تو ہم تجھے گولیاں کھلائیں گے بس باس کو آ لینے دیجیے.........تم انسان نہیں درندے ہو۔'' وہ غرایا۔ ''تم نے جس طرح ہمارے ساتھی کی خالی ہاتھوں جان لی ہے ایسا کوئی درندہ ہی کر سکتا ہے۔''

''کک......کیا راجا طارق مر گیا ہے؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں مر گیا ہے اور اب تمہاری باری ہے۔ سلیم باس کا رائیٹ ہینڈ تھا۔ باس تجھے کبھی بھی معاف نہیں کرے گا۔''

''اوہ.........تو اُس کتے کا نام سلیم تھا۔'' زندگی میں پہلی بار کسی کو قتل کرنے کے بعد میں خوشی محسوس کر رہا تھا۔ ''اُس کا یہی انجام ہونا تھا۔ اُس نے خود ہی اپنی موت کو دعوت دینے کی غلطی کی تھی۔ اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں ہے۔''

''مگر ہم نے تو سنا تھا کہ تم ایک بز.........''

''یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟'' اس کے ساتھی نے مداخلت کرتے ہوئے قطع کلامی کی۔ ''تمہیں شاید باس کی ہدایات بھول گئی ہیں؟''

''تمہارا باس کون ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہمیں یہ بتانے کی اجازت نہیں ہے۔'' اس نے ناگوار انداز میں جواب دیا۔

میں نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تم دونوں بھاڑے کے ٹٹو ہو، اپنی مرضی سے باتھ روم تک نہیں جا سکتے مگر مجھے کھلانے پلانے کا حکم تم لوگوں کو ضرور ملا ہوگا؟ چلو اب اچھے بچوں کی طرح میرے لیے کھانا لے کر آؤ۔'' اُن دونوں نے مجھے چونک کر دیکھا، میں خود بھی اپنی اس طرح کایا پلٹنے پر حیران تھا۔ میں نے تصور میں بھی نہیں سوچا تھا کہ کبھی اس قدر ہمت کا مظاہرہ کروں گا۔ اُس لمحے بابا جان مجھے شدت کے ساتھ یاد آئے۔

''کاش ہم لوگ باس کے ہاتھوں مجبور نہ ہوتے تو تجھے ابھی شوٹ کر دیتے۔'' اُس نے تاسف کے

انداز میں جواب دیا۔

"بھاڑے کے ٹٹو بے اختیار ہوتے ہیں۔ کڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ زندگی نے وفا کی تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم لوگوں کو اپنے ساتھی کا انتقام لینے کا ایک موقع ضرور دوں گا بلکہ تم دونوں کو اکٹھے دعوتِ مبازرت دوں گا۔"

"ہم تجھے تڑپا تڑپا کر ماریں گے اور تیرے..........."

"لیکن میں تم دونوں کو تڑپنے کی مہلت نہیں دوں گا۔" میں نے قطع کلامی کی۔ "یہ میرا وعدہ ہے تم دونوں سے۔"

وہ دونوں مجھے گالیاں اور دھمکیاں دیتے ہوئے واپس چلے گئے، جب کہ میں پہلی بار اُس قید خانے کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں اٹیچڈ ٹوائلٹ اور باتھ روم موجود تھا۔ ایک کونے میں چوبی اسٹول پر واٹر کولر بھی رکھا ہوا تھا۔ جس پر اسٹین لیس اسٹیل کا بنا ہوا ایک گلاس اوندھا پڑا تھا۔ تاہم وہاں بستر جیسی کوئی سہولت میسر نہیں تھی۔ سب سے پہلے میں نے ٹوائلٹ روم کا رخ کیا۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد چند گھونٹ پانی کے پیے اور پھر قید خانے کی سلاخیں تھام کر اُن دونوں کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ اب کی بار وہ کھانا لے کر ہی آئیں گے۔ چند لمحوں کے بعد عین میری توقع کے مطابق وہ کھانا لے کر پہنچ گئے۔ کھانے کے ساتھ وہ ایک اونی کمبل بھی لائے تھے۔

"مجھے مکمل بستر چاہیے۔" میں نے یوں اپنی خواہش کا اظہار کیا جیسے وہ میرے میزبان ہوں۔ "میں خالی کمبل میں رات نہیں گزار سکتا۔"

"شکر کرو کہ یہ کمبل مل گیا ہے ورنہ جو حرکت تم نے کی ہے اُس کے بعد تو تمہارے جسم سے کپڑے بھی اُتار لینے کو دل کرتا ہے۔" اُن میں سے ایک نے جواب دیا جب کہ دوسرے نے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے اُس کی تائید کی۔ اُس کے دانت ٹیڑھے اور بھدے تھے۔ ایسے غلیظ دانت میں زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "اگر تم لوگوں نے مجھے مکمل بستر مہیا نہ کیا تو میں تمہارے باس سے شکایت کروں گا۔"

"شوق سے کرنا۔" غلیظ دانتوں والا مسکرایا۔ "باس تو تجھے کمبل دینے کے حق میں بھی نہیں تھا۔ یہ تو ہم لوگوں نے اُس کی منت کی ہے کہ تجھ حرامی کو کمبل ملنا چاہیے ورنہ وہ تو تجھے صبح مرا ہوا دیکھنے کا خواہش مند تھا۔"

"تمہارے دانت بہت غلیظ ہیں یار! پلیز میرے سامنے مسکرایا نہ کرو، مجھے متلی ہونے لگتی ہے۔" میں نے چڑانے والے انداز میں جواب دیا۔

وہ بولا "انہی دانتوں سے ایک دن تمہیں ایسی جگہ کاٹوں گا کہ تم ڈاکٹر کو بھی نہیں دکھا سکو گے۔"

"اوہ......... مطلب تم شی میل ہو؟" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

"بکواس مت کرو۔" وہ غرایا۔ "ورنہ دانت توڑ ڈالوں گا۔"

"میں نے بکواس نہیں کی بلکہ سچ بولا ہے۔ یقین نہیں آتا تو اپنے ساتھی سے پوچھ لو، کیوں کیا خیال ہے بھئی! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں؟" میں نے اُس کے ساتھی کی طرف متوجہ ہو کر سوال کیا۔

"میرے منہ مت لگو، تم بہت بڑے حرامی ہو، باس نے تمہارے متعلق غلط اندازہ لگایا ہے۔" اُس نے گالی دیتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے کہا۔ "مجھے تو تمہارا باس اور تم لوگ حرامی لگتے ہو۔ تمہارے باس میں غیرت ہوتی تو اب تک میرے سامنے ضرور آ گیا ہوتا۔ کہیں وہ بھی تم دونوں کی طرح کھسرا تو نہیں ہے؟" وہ دونوں کلین شیو تھے۔ چنانچہ میری بات اُنہیں گولی کے مانند لگی تھی۔

"باس کو آ لینے دو، ہم سب سے پہلے تجھے بھی کھسرا بنانے والا کام کریں گے۔" غلیظ دانتوں والے نے جواب دیا۔

"کھسرے کبھی کسی مرد کو کھسرا نہیں بنا سکتے اور نہ ہی خود مرد بن سکتے ہیں۔"

"کل صبح تجھے سبق سکھائیں گے۔" غلیظ دانتوں والے نے کہا اور پھر اپنے ساتھی سے بولا۔ "آؤ چلتے ہیں، کل جب باس آئے گا تو اس سے نمٹ لیں گے۔"

"ابھی کیوں نہیں نمٹتے زنخو!" میں نے اُنہیں تاؤ دلانے کی کوشش کی مگر وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

☆......☆......☆

وہ رات میں نے اُس کمبل میں ٹھٹھرتے ہوئے گزار دی تھی۔ کبھی جاگنے لگتا تھا تو کبھی اُونگھ آ جاتی

تھی۔ کمرے کا فرش بے حد ٹھنڈا تھا۔ جونہی میری آنکھ لگتی تو سردی مجھے دوبارہ جاگنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ آخر کار میں نے آدھا کمبل نیچے بچھایا اور آدھا اُوپر لے کر سکڑ سمٹ کر سو گیا۔ گو کہ اس طرح سونے سے میرے گھٹنے دکھنے لگے تھے مگر سردی کا احساس قدرے کم ہو گیا تھا۔ سو جیسے تیسے کر کر کے میں نے رات کاٹ لی تھی۔ جاگنے کے بعد میں نے جسم کو گرم کرنے کے لیے تھوڑی بہت ایکسر سائز کی تو کافی حد تک سردی کا اثر زائل ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے ٹوائلٹ میں جا کر حوائج ضروریہ سے فراغت حاصل کی، واش بیس کے نل پر منہ ہاتھ دھویا اور باہر آ گیا۔ اب مجھے ناشتے کا انتظار تھا۔ گزشتہ رات کی سردی نے سب کھایا پیا ہضم کر ڈالا تھا۔

لگ بھگ دس پندرہ منٹوں کے بعد غلیظ دانتوں والا ناشتا لے کر پہنچ گیا۔ اُس نے ایک ہاتھ میں ناشتے کی ٹرے پکڑ رکھی تھی جب کہ دوسرے ہاتھ میں رشین کلاشنکوف تھامی ہوئی تھی۔ مجھ پر ایک قہر آلود نگاہ ڈالتے ہوئے وہ بولا۔ ”ناشتا کر لو مسٹر شیر دل! اس کے بعد تمہیں باس کے سامنے پیش کیا جائے گا۔“

”نو ٹینشن۔“ میں نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔ ”تمہارے باس کو بھی دیکھ لوں گا، ویسے میرا نام شیر دل نہیں ندیم ہے۔“

”کیا ہمیں احمق سمجھ رکھا ہے؟“ اُس نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

میں نے کہا۔ ”احمق نہ ہوتے تو ایک پٹھان سے پنگا کیوں لیتے؟“

”یہ بات تم باس سے پوچھ لینا، ابھی بک بک کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

اتنا کہہ کر اُس نے ناشتے والی ٹرے عین دروازے کے سامنے رکھ دی اور خود چند قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے سلاخوں میں سے ہاتھ گزار کر چائے کا کپ بھرا، ٹرے میں رکھے ہوئے دو عدد بڑے سائز کے توش اُٹھائے اور مطمئن انداز میں ناشتا کرنے لگا۔ گزشتہ رات میں نے کھانا بھی اسی طریقے سے کھایا تھا۔ شاید اُنہیں قید خانے کا دروازہ کھولنے کی اجازت نہیں تھی یا پھر وہ لوگ مجھ سے خوف زدہ تھے۔ بہر کیف جو کچھ بھی تھا مجھے اُس سے کوئی غرض نہیں تھی۔

”توش بڑے لذیذ تھے یار۔“ ناشتا کرنے کے بعد میں نے توصیفی انداز میں کہا۔ ”کیا تمہارے باس نے بنائے ہیں؟“

''تمہارے باپ نے بنائے ہیں۔'' اُس نے جل کر کہا۔ ''ہر وقت بکواس کرتے رہتے ہو۔''

''او غلیظ دانتوں والے بھائی! میں کوئی گونگا نہیں ہوں۔ منہ میں زبان رکھتا ہوں۔ تم مجھے بولنے سے منع نہیں کر سکتے۔''

''باس کو آلینے دو پھر تمہاری بولتی بند ہو جائے گی۔'' اُس نے دھمکی کے انداز میں جواب دیا۔

''کیا باس کی شکل بہت ڈراؤنی ہے؟'' میں نے معصومیت سے سوال کیا۔

''بہت بکواس کرتے ہو تم.......کاش باس نے تیرا خیال رکھنے کا حکم نہ دیا ہوتا تو میں تجھے ابھی شوٹ کر دیتا۔'' اُس نے غصے کے عالم میں جواب دیا اور ناشتے والے برتن اُٹھا کر واپس روانہ ہو گیا۔

''اگلی بار دانت صاف کر کے آنا۔'' میں نے عقب سے طنزیہ انداز میں کہا لیکن وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے چلا گیا۔

تقریباً نصف گھنٹے کے بعد جب وہ واپس لوٹا تو اکیلا نہیں تھا۔ کل والا ساتھی اُس کے ساتھ تھا۔ وہ دونوں مسلح تھے اور دونوں کے پاس رشین کلاشنکوف تھیں۔

''کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش مت کرنا۔'' دروازے کا تالا کھولنے سے پہلے اُس کے ساتھی نے مجھے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔ ''ورنہ بھون کے رکھ دیں گے۔''

ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش

میں بندہء مومن ہوں نہیں دانہء اسپند

میں نے شاعرِ مشرق کا ایک مشہور شعر دہرایا مگر وہ دونوں خاموش رہے شاید اُن کی موٹی عقل میں کچھ نہیں آیا تھا۔ تب میں نے کہا۔ ''ابے گدھو! تھوڑی بہت تو داد دے دو، یہ اقبال کا شعر ہے۔''

''کون اقبال؟'' غلیظ دانتوں والے نے استفسار کیا۔

اس دوران اُس کا ساتھی تالا کھول چکا تھا۔ میں نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ ''احمق انسان! تم اقبال کو بھی نہیں جانتے؟ لعنت ہو تم پر اُسے تو پوری دنیا جانتی ہے۔''

''میں جانتا ہوں اقبال کو۔'' اُس کے ساتھی نے فخریہ انداز میں جواب دیا۔

''اچھا بتاؤ وہ کون تھا؟'' میں نے کسی اسکول ماسٹر کی طرح سوال کیا۔

''تھا'' کا کیا مطلب وہ تو اب بھی زندہ ہے۔'' وہ تحیر کے عالم میں میری طرف دیکھنے لگا۔ ''دانتوں کا ڈاکٹر ہے وہ چاندنی چوک کے قریب ہی اُس کا کلینک ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میں پہلی بار ایک ساتھ دو گدھے انسانی شکل میں دیکھ رہا ہوں۔''

''دیکھو! تم زیادہ ماسٹر بننے کی کوشش مت کرو، تمہیں جو کچھ بھی پوچھنا ہے باس سے پوچھ لینا۔ ہمارا دماغ مت چاٹو۔'' اُس نے بُرا مناتے ہوئے جواب دیا۔

''میں جانتا ہوں تمہارا باس بھی تم دونوں کی طرح اُلو ہی ہوگا۔''

وہ بولا۔ ''اُسے دیکھ کر تمہاری پتلون گیلی ہو جائے گی بچے۔''

میں نے ہنس کر کہا۔ ''پتلونیں تو تم دونوں نے پہن رکھی ہیں۔ میرے جسم پر تو شلوار قمیص ہے۔''

''پتلون کا لفظ میں نے محاورے کے طور پر بولا ہے۔''

''محاورے میں شلوار بھی تو فٹ ہو سکتی تھی۔ مجھے تو تم دونوں ڈفر لگتے ہو۔ پتا نہیں تم لوگوں کا باس کیا چیز ہوگا؟''

''زیادہ بک بک کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' غلیظ دانتوں والے نے مداخلت کی۔ ''چلو دونوں ہاتھ سر سے اُوپر اُٹھالو۔''

''کیوں؟'' میں نے تعجب کا اظہار کیا۔ ''اس کی بھلا کیا ضرورت ہے، میں نے کون سی غلط حرکت کی ہے؟''

''کی ہے یا نہیں کی، یہ باس کا حکم ہے اور تجھے اس پر عمل کرنا پڑے گا۔''

''بہت واہیات حکم ہے۔ میں نہیں مانوں گا۔'' میں نے انکار میں سر ہلایا۔

''تمہارا تو باپ بھی مانے گا۔'' وہ بپھر گیا۔ ''چلو ہاتھ اُٹھاؤ........ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔'' اُس نے ایک دم مجھ پر کلاشنکوف تان لی۔ اب میرے پاس ہاتھ اُٹھانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ چنانچہ میں دونوں ہاتھ سر سے بلند کرتے ہوئے اُن کے آگے آگے چل دیا۔

☆......☆......☆

مختلف راہداریوں اور کمروں کے سامنے سے گزرتے ہوئے آخر کا ہم ایک ایسے کمرے میں داخل ہو گئے جو کسی ڈرائنگ کی طرح سجا ہوا تھا۔ کمرے کے عین وسط میں قیمتی اور دیدہ زیب ایرانی قالین بچھا ہوا تھا۔ جس پر انتہائی نفیس صوفا سیٹ لگے ہوئے تھے۔ درمیان میں ماربل کی ایک بڑے سائز کی ٹیبل بھی رکھی ہوئی تھی۔ ٹیبل پر دوعدد ایش ٹرے اور ایک وائرلیس ٹیلی فون سیٹ موجود تھا۔ کمرے کی ایک ایک چیز سے امارت اور نفاست ٹپک رہی تھی۔ میں ابھی کمرے کی خوب صورتی میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک ڈرائنگ روم کے دوسرے دروازے سے ایک بلند قامت شخص اندر داخل ہوا، اُس نے تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا اور شکل وصورت سے یورپین لگتا تھا۔ اُس کے چہرے پر نفیس اور سنہری فریم کا چشمہ موجود تھا جو غالباً بینائی کا تھا۔ عمر سے وہ لگ بھگ چالیس برس کا نظر آرہا تھا۔

میرے عین سامنے پہنچ کر وہ دوستانہ انداز میں مسکرایا اور پھر نہایت ہی نفیس پشتو میں بولا۔ ”شیر دل خان! میں معذرت خواہ ہوں کہ مجھے آپ کو اس طرح بلانا پڑا۔ پلیز اسے میری مجبوری سمجھتے ہوئے نظرانداز کر دیں۔“

”آپ کی تعریف؟“ میں نے اُس کے انداز سے متاثر ہوئے بغیر سوال کیا۔

”آپ کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا پہلے آپ تشریف تو رکھیں۔“ اُس نے دوستانہ لہجے میں جواب دیا۔

”آپ مجھے غیر ملکی لگتے ہیں۔ پھر یہ پشتو......میں کچھ سمجھا......“

”آپ بیٹھیں تو سہی۔“ اُس نے مسکرا کر قطع کلامی کی۔ ”آپ کے ہر سوال کا جواب مل جائے گا۔“

میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا اور جواب طلب نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ میرے مقابل دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”سلیم میرا بہت اہم آدمی تھا مگر مجھے اُس کی موت کا کوئی افسوس نہیں ہوا۔ میں نے اُسے سمجھایا بھی تھا کہ کبھی کسی پٹھان کو گالی مت دینا لیکن اُس نے میری نصیحت پر کوئی عمل نہ کیا اور آپ کے ہاتھوں سے ضائع ہو گیا۔ خیر اُس کا یہی انجام ہونا تھا۔ آپ سنائیں آپ کو میرے آدمیوں نے کوئی تکلیف تو نہیں پہنچائی؟“

میں نے کہا۔ ”گذشتہ رات میں نے ٹھنڈے فرش پر سو کر گذاری ہے۔ کیا یہ تکلیف کم ہے؟“

”میں معذرت خواہ ہوں کہ میری عدم موجودگی میں میرے آدمیوں نے آپ سے ایسا ناروا سلوک کیا۔ بہرحال

اب آپ کو یہاں ہر سہولت ملے گی اگر آپ نے تعاون فرمایا تو آپ مجھے اپنا بہترین دوست پائیں گے۔"

"لیکن آپ نے ابھی تک اپنا تعارف تو کرایا ہی نہیں؟" میں نے اُلجھن محسوس کرتے ہوئے سوال کیا۔

وہ مسکرایا۔"بھئی! پہلے آپ کی کوئی سیوا وغیرہ تو کرلیں، میرا تعارف کہیں بھاگا تو نہیں جا رہا؟"

ایسے ہی وقت ایک ملازم نما شخص ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹرے سنٹرل ٹیبل پر رکھ کر مؤدب انداز میں کھڑا ہوگیا۔ ٹرے میں گرما گرم قہوے کا ایک کپ اور ڈرائی فروٹ کی پلیٹ رکھی ہوئی تھی۔

"مہمان کو قہوہ پیش کرو۔" اُس نے ملازم کو حکم دیا۔

ملازم نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے قہوے کا کپ مجھے پکڑا دیا اور ڈرائی فروٹ والی پلیٹ میرے نزدیک کھسکا دی۔ میں نے ڈرائی فروٹ کے ساتھ قہوے کی چسکیاں لینا شروع کر دیں۔ قہوہ نہایت ہی لذیذ تھا۔ حالانکہ میں پٹھان ہوتے ہوئے بھی قہوے کو سخت ناپسند کرتا تھا اور کبھی کبھار مجبوری کے عالم میں ہی پیا کرتا تھا مگر یہ قہوہ کچھ عجیب قسم کا تھا۔ اس کی خوشبو اور لذت میرے لیے بالکل اجنبی تھی۔ چنانچہ میں چسکی پر چسکی لیتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ نصف کپ خالی ہوگیا۔ ایسے ہی وقت مجھے ایک اونگھ سی محسوس ہوئی۔ میں نے سر جھٹکتے ہوئے خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر غنودگی مجھ پر حاوی ہوتی چلی گئی۔ مکمل بے ہوش ہونے سے قبل میں نے اپنے دائیں بازو میں ایک سُوئی سی چبھتی ہوئی محسوس کی تھی۔ اس کے بعد میں ہوش و خرد سے بیگانہ ہوتا چلا گیا۔

میں جب دوبارہ ہوش میں آیا تو میں نے خود کو اُسی صوفے پر پایا۔ ڈرائی فروٹ کی پلیٹ اور قہوے کا نصف کپ بدستور میرے عین سامنے سنٹرل ٹیبل پر رکھے ہوئے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر میں اُلجھن کا شکار ہوگیا۔ مجھے لگا جیسے میں بے ہوش ہوا ہی نہیں ہوں۔ مگر مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ قہوے کا نصف کپ پینے کے بعد میں بے ہوش ہوا تھا۔ بے ہوشی کا یہ وقفہ کتنا طویل تھا؟ اس بارے میں مجھے کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ میں نے ایسے ہی وال کلاک پر نظر ڈالی تو ٹھیک دس بجنے والے تھے۔ میری اُلجھن مزید بڑھ گئی کیونکہ یہ وہی وقت تھا جب بے ہوش ہونے سے قبل میں قہوہ پی رہا تھا۔ دونوں مسلح شخص بھی وہیں موجود تھے۔ جب کہ وہ غیر ملکی نظر آنے والا شخص اُسی طرح صوفے پر عین میرے سامنے تشریف فرما تھا۔ مجھے اُلجھن میں اور پریشان دیکھ کر پہلے تو وہ مسکرایا، پھر بولا۔"کیا بات ہے شیر دل! آپ مجھے بہت پریشان نظر آ رہے ہیں۔ کوئی اُلجھن ہے تو پلیز مجھے بتائیں؟"

میں نے کہا۔ ”ہاں اُلجھن تو ہے مگر میں جانتا ہوں کہ آپ مجھے سچ نہیں بتائیں گے۔“

وہ بولا۔ ”بھئی! پہلے سوال تو کرو، جواب نہ ملے تو تب یہ شکوہ کرنا۔“

”کیا میں قہوہ پینے کے دوران بے ہوش ہوا تھا؟“ میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

اُس کے لبوں پر ایک پُراسراری ہنسی رینگ گئی۔ ”نہیں۔“ اُس نے انکار میں سرہلایا۔ ”آپ بالکل بے ہوش نہیں ہوئے تھے۔ یقین نہیں آتا تو اپنے سامنے رکھی قہوے کی پیالی چیک کرلو۔ مجھے یقین ہے کہ قہوہ ابھی تک گرم ہوگا۔

میں نے پیالی کو چھوا تو وہ واقعی گرم تھی لیکن میرا شک پھر بھی دُور نہ ہوا، میں نے کہا۔ ”پیالی میں گرم قہوہ بھی تو ڈالا جاسکتا ہے؟“

”ہاں ایسا ہوسکتا ہے اگر آپ یہاں سے ہٹے ہوتے تو تب ورنہ آپ کی موجودگی میں یہ کیسے ممکن ہے؟“

”تو پھر مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ میں بے ہوش ہوا تھا؟“

وہ ہنس کر بولا۔ ”یہ اس قہوے کا کمال ہے کہ آپ کو ایسا لگتا ہے۔ ورنہ حقیقت میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔“

”مطلب قہوے میں کچھ ملا گیا تھا؟“ میں نے مشکوک انداز میں پوچھا۔

”نہیں۔“ اُس نے انکار میں سرہلایا۔ ”یہ محض آپ کا وہم ہے قہوے میں کچھ بھی نہیں ملا گیا تھا۔ یہ اس قہوے کی تاثیر ہے کہ پہلی بار پینے والے کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ بے ہوش ہوگیا ہے مگر حقیقت میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا بلکہ پینے والا پوری طرح ہوش میں رہتا ہے تاہم وقتی طور اُس کے دل ودماغ میں ہلچل ضرور مچ جاتی ہے۔ اگر آپ کو یقین نہیں آتا تو اب کی بار پی کر دیکھ لیں، اس بار آپ کو ایسا کچھ بھی محسوس نہیں ہوگا۔“

میں نے قہوے کی پیالی اُٹھا کر ایک بار پھر لبوں سے لگالی اور گھونٹ گھونٹ کر سارا قہوہ پی گیا مگر اس بار مجھے کچھ بھی محسوس نہ ہوا حالانکہ قہوے کا ذائقہ اور خوشبو بھی وہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے یا پھر قہوہ بدل دیا گیا تھا؟ بہر کیف جو بھی تھا مجھے اُس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے موضوع بدل کر سوال کیا۔ ”اوکے قہوے والی بات کو رہنے دو اور یہ بتاؤ کہ مجھے کس مقصد کی خاطر اغوا کیا گیا ہے، آپ کون ہیں اور مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟

وہ بولا۔ ''میرا نام داؤد خان ہے اور میں آپ کا ہمدرد ہوں۔''

''اس ہمدردی کا سبب جان سکتا ہوں؟'' میں نے طنزیہ انداز میں سوال کیا۔

''آپ آم کھائیں پیڑ مت گنیں۔'' وہ لبوں پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔ آپ کی تسلی کے لیے کیا یہ کافی نہیں ہے کہ میں آپ کا دوست ہوں، دشمن نہیں۔''

''یہ بھی خوب کہی........دوست بھی بھلا کبھی یوں اغوا کرتے ہیں؟''

اُس نے چشمہ اُتارا دونوں شیشوں پر باری باری پھونک ماری اور پھر چشمہ دوبارہ چہرے پہ سجاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''میں صدیار خان کا دشمن ہوں، وہی صدیار خان جس نے آپ کی توہین آمیز وڈیو فلمائی تھی۔''

میں نے کہا۔ ''آپ جب تک اپنے بارے میں مجھے سچ نہیں بتائیں گے میں آپ کی کسی بات پر یقین نہیں کروں گا۔ آپ صدیار خان کے دوست بھی تو ہو سکتے ہیں؟''

''ٹھیک ہے۔'' اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''میرا نام تو آپ کو معلوم ہو ہی چکا ہے یعنی داؤد خان، آپ کی طرح میں بھی........''

''داؤد خان یا ڈیوڈ؟'' میں نے قطع کلامی کی۔

''ویسے مما مجھے ڈیوڈ ہی کہا کرتی تھی۔'' وہ مسکرایا۔ ''تاہم بابا جان چونکہ نسلاً پٹھان تھے اس لیے مما کی اس بات کا ہمیشہ بُرا منایا کرتے تھے۔ کبھی کبھار وہ مما کو ڈانٹ بھی دیا کرتے تھے، تب اُن دونوں کی بیچ بحث چھڑ جایا کرتی تھی۔ مما بابا جان سے کہتی کہ داؤد اور ڈیوڈ دونوں ایک ہی نام ہیں بس زبان اور لہجے کے فرق کی وجہ سے مختلف لگتے ہیں مگر بابا جان جو کہ معمولی سے پڑھے لکھے تھے، ہمیشہ مما کی ہر دلیل کو رد کر دیا کرتے تھے۔ مما کا تعلق انگلینڈ سے تھا جب کہ بابا جان ایک قبائلی پٹھان تھے۔ دونوں نے محبت کی شادی کی تھی مگر یہ محبت اُن دونوں کو راس نہ آسکی حالانکہ مما نے شادی سے قبل اسلام بھی قبول کر لیا تھا۔'' اتنا بتا کر وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔

مجھے اُس کی کہانی دل چسپ لگی مگر اب وہ کھویا کھویا سا نظر آ رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر اذیت کے تاثرات تھے۔ یوں جیسے وہ بہت تکلیف میں ہو۔ شاید ماضی کی کرب انگیز یادوں نے اُسے گھیر لیا تھا۔ ایسی صورت حال میں اُس سے کچھ پوچھنا میں نے نامناسب خیال کیا۔ چند لمحوں کے لیے بالکل خاموشی چھا گئی۔ تب میں نے

پہلی بار اپنے دل میں اُس کے لیے ہمدردی کے جذبات محسوس کیے۔ اُس نے ایک بار پھر چشمہ اُتار کر اپنی نم آلود پلکیں صاف کیں اور پھر مسلح گارڈز سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تم دونوں باہر جا کر بیٹھ جاؤ، جب تک میں نہ بلاؤں کمرے میں مت آنا۔''

غلیظ دانتوں والے نے منہ کھولا۔ ''آپ رسک لے رہے ہیں جناب! یہ شخص بہت خطرناک اور عیار ہے۔ ہماری عدم موجودگی میں یہ آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر سکتا ہے۔ اس نے سلیم کو جس بے رحمی کے ساتھ قتل کیا ہے اُس کے بعد اس پر اعتبار کرنا..........''

''دفع ہو جاؤ۔'' داؤد خان نے چلا کر قطع کلامی کی۔ ''میں نے جو حکم دیا ہے اُس پر عمل کرو۔''

اُسے غصے میں دیکھ کر دونوں گارڈ تیزی سے باہر نکل گئے۔ گارڈز کے جانے کے بعد اُس نے میری طرف دیکھا اور پھر چہرے پر ایک زخمی سی مسکراہٹ طاری کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ آپ میری داستان سننے کے لیے بہت بے تاب ہوں گے۔''

''ہاں بے تاب تو ہوں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اگر آپ مناسب سمجھتے ہیں تو پھر میں آپ کی داستانِ حیات ضرور سننا چاہوں گا۔''

وہ بولا۔ ''بہت دُکھ بھری داستان ہے۔ آپ خواہ مخواہ افسردہ ہو جائیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''میری افسردگی کو چھوڑو، آپ کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔''

''ہاں یہ بات تو ہے۔'' اُس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ دُکھ میں کسی دوسرے کو شریک کرنے سے دُکھ کا احساس آدھا رہ جاتا ہے۔''

''تو پھر سنایئے میں ہمہ تن گوش ہوں۔''

وہ بولا۔ ''ٹھیک ہے مگر میری ایک شرط ہے؟''

''کیسی شرط؟'' میں نے قدرے حیرت کا اظہار کیا۔

وہ بولا۔ ''اب جب کہ ہم دونوں میں دوستی کا آغاز ہو چکا ہے تو کیا ہم اسی طرح ایک دوسرے کو آپ جناب کہہ کر مخاطب کرتے رہیں گے؟''

''ہاں واقعی ہمیں ان تکلفات میں نہیں پڑنا چاہیے اب ہم اجنبی نہیں رہے۔'' میں نے اُس کی تائید کرتے ہوئے جواب دیا۔

''گڈ یہ ہوئی ناں بات۔'' اُس نے خوشی کا اظہار کیا۔''اب میں تمہیں اپنی داستانِ حیات ضرور سناؤں گا۔''



''یہ آج سے تقریباً چالیس برس قبل کا ذکر ہے۔'' وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔''میں اُس وقت ابھی دنیا میں نہیں آیا تھا۔ ملک کے حالات اس قدر بُرے نہیں تھے جیسے آج کل ہیں۔ اُس دور میں انگلینڈ جانے کا بہت چاہ تھا۔ خاص کر پٹھان لوگ تو اپنا گھربار بیچ کر بھی ملک سے باہر جانے کے لیے تیار رہتے تھے۔ میرے بابا جان ایک ٹرک ڈرائیور تھے اور پشاور کراچی روٹ پر چلا کرتے تھے۔ وہ پشاور سے مال لے کر کراچی جاتے اور کراچی کا مال پشاور لایا کرتے تھے۔ کبھی کبھار تو وہ پشاور سے آگے افغانستان کے شہر جلال آباد تک بھی چلے جایا کرتے تھے۔ بابا جان کا نام احمد یار خان تھا جب کہ اُس سے ایک چھوٹا بھائی بھی تھا جس کا نام صمد یار خان تھا۔ احمد یار خان اپنے چھوٹے بھائی سے بے تحاشا پیار کرتے تھے اور اُسے پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنانا چاہتے تھے۔ دونوں کا باپ اُن کے بچپن میں ہی گزر گیا تھا۔ بس ایک بوڑھی ماں تھی اور وہ دو بھائی تھے۔ اُن کے دن نہایت ہی اچھے گزر رہے تھے۔ گھر میں اللہ کا دیا سبھی کچھ تھا۔ احمد یار خان کی تنخواہ اُن کی ضرورت سے زیادہ تھی۔ ویسے بھی وہ دور بہت سستا تھا۔ اس قدر ارزانی نہیں تھی جیسے آج کل ہے۔

اُن دونوں صمد یار خان میٹرک میں تھا جب احمد یار خان کے سر پر ملک سے باہر جانے کا بھوت سوار ہو گیا۔ سرما کے دن تھے، رات کے کھانے کے بعد جب وہ تینوں انگیٹھی کے گرد بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو احمد یار خان بولا۔''مور جان (امی جان) میں ملک سے باہر جانا چاہتا ہوں۔ یہاں میری محنت کا صلہ بہت کم ملتا ہے۔''

ماں نے کہا۔''یاری خان! صلہ کم نہیں ملتا بلکہ تم ناشکرے ہو گئے ہو۔'' (ماں اُسے پیار سے یاری خان کہا کرتی تھی)

اُس نے کہا۔'' مور جان! تم جانتی ہو کہ میں صمد خان کو بڑا آدمی بنانا چاہتا ہوں۔ میرا یہ سپنا صرف اسی

صورت میں پورا ہو سکتا ہے جب میں ملک سے باہر کہیں ملازمت کروں گا۔ یہاں رہ کر میں اپنے بھائی کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکوں گا۔ کیا تم نہیں چاہتی ہو کہ تمہارا صمد ایک دن بہت بڑا آدمی بن جائے؟“

وہ بولی۔”صمد خان پڑھ تو رہا ہے اور تمہیں کیا چاہیے؟“

”دسویں پاس کرنے کے بعد جب وہ کالج میں جائے گا تو تب بہت خرچہ ہوگا۔ اُس وقت میری تنخواہ سے یہ خرچہ پورا نہیں ہوگا۔“ اُس نے دلیل پیش کی۔

”نہیں یاری خان!“ ماں نے انکار میں سر ہلایا۔”میں تمہیں پردیس جانے کی اجازت نہیں دے سکتی وہاں جو بھی جاتا ہے کبھی واپس نہیں آتا۔ میں تمہیں ہمیشہ کے لیے کھونا نہیں چاہتی۔“

وہ بولا۔”مور جان! میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہر سال چھٹی آیا کروں گا۔“

”وہاں جانے والوں کو وعدے یاد نہیں رہتے، تم بھی ہمیں بھول جاؤ گے۔“

”یاری خان اپنی ماں اور بھائی کو بھول جائے یہ ناممکن ہے۔ میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو پردیس کی رنگینیوں میں کھو کر خونی رشتوں کو بھول جاتے ہیں۔ کیا تمہیں اپنے یاری خان پر اعتماد نہیں ہے؟“ اُس نے جوش کے عالم میں سوال کیا۔

”تم پر تو اعتماد ہے لیکن..........“ وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

”لیکن کیا مور جان؟“ اُس نے بے چینی کے عالم میں پوچھا۔

”وہاں کی عورتیں بہت چالاک ہوتی ہیں۔ ماؤں سے بیٹے اور بہنوں سے اُن کے بھائی چھین لیتی ہیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ تمہیں بھی کوئی ایسی ہی عورت ہم سے چھین لے گی اور پھر میں اور صمد اکیلے رہ جائیں گے۔“ ماں نے دل میں چھپے خدشے کا اظہار کیا۔

”یہ تمہارا وہم ہے مور جان۔“ اُس نے قہقہہ لگایا۔”میں یاری خان ہوں دنیا کی کوئی عورت مجھے تم لوگوں سے جدا نہیں کر سکتی، چاہے وہ انگریز ہی کیوں نہ ہو۔“

”جانے سے پہلے سب اپنی ماؤں سے ایسی ہی باتیں کرتے ہیں مگر وہاں جا کر انہیں یہ باتیں بھول جاتی ہیں۔“

”مور جان! اگر تم نے مجھے جانے کی اجازت نہ دی تو میں گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔“ اُس نے حتمی فیصلہ سنایا۔

''ہاں مور جان! لالہ ٹھیک کہتا ہے۔'' چھوٹے بھائی نے بھی اُس کی تائید کی۔ ''انگلینڈ میں ایک ڈرائیور کو بہت اچھی تنخواہ ملتی ہے۔ ہمارے دن پھر جائیں گے، ہم کب تک گاؤں کے اس کچے اور ٹوٹے پھوٹے مکان میں رہیں گے؟''

دونوں بھائیوں کو متفق دیکھ کر ماں مجبور ہوگئی۔ ویسے بھی وہ ایک اَن پڑھ اور سادہ مزاج عورت تھی۔ بیٹے کو دلیل سے قائل نہیں کر سکتی تھی۔ شوہر زندہ ہوتا تو شاید اُس کا ساتھ ضرور دیتا، تب وہ یاری خان کو باہر جانے سے زبردستی بھی روک سکتی تھی۔ تاہم وہ کچھ سوچ کر بولی۔

''میں یاری خان کی بات مان لوں گی مگر میری ایک شرط ہے؟''

''کیسی شرط مور جان؟'' یاری خان نے بے صبری کے عالم میں پوچھا۔

وہ بولی۔ ''بیرونِ ملک جانے سے قبل تمہیں شادی کرنا پڑے گی۔''

''اس کی بھلا کیا ضرورت ہے؟'' یاری خان ٹپٹا گیا۔ اُسے ماں سے کسی ایسے سوال کی توقع ہی نہیں تھی۔

ماں نے کہا۔ ''تمہارے پیروں میں زنجیر ہوگی تو بھٹکنے سے باز رہو گے۔''

''مگر میرا تو ابھی رشتا بھی طے نہیں ہوا، کون مجھے بیٹی دے گا؟'' اُس نے جواز گھڑا۔

''تم ہاں تو کرو رشتا تلاش کرنا میرا کام ہے۔'' ماں نے پُرعزم لہجے میں جواب دیا۔

وہ سوچوں میں مستغرق ہوگیا۔ دل و دماغ میں جنگ چھڑ گئی۔ دماغ نے کہا ماں کا کہنا مان کر شادی کرلو، دل بولا اگر وہاں کوئی میم صاحب پسند آگئی تو کیا ہوگا؟ دماغ نے طنزیہ قہقہہ لگا کر کہا ایک مڈل پاس ڈرائیور کو بھلا کوئی میم کیوں پسند کرے گی؟ دل بولا عورت عشق میں اندھی ہوجاتی ہے وہ تعلیم، مرتبہ، خاندان بلکہ مذہب تک نہیں دیکھتی بس اپنے دل کی سنتی ہے۔ دماغ نے کہا بجا مگر شادی کیے بنا یہ باہر نہیں جا پائے گا؟ دماغ کی اس ٹھوس دلیل نے دل کو لاجواب کردیا، وہ دھڑک رہا تھا مگر اُس کے پاس ایسی کوئی دلیل نہیں تھی جسے جواز بنا کر وہ دماغ کی بولتی بند کردیتا، سو بچارا دھڑکنے کے سوا کچھ بھی نہ کر پایا۔

دماغ نے فخریہ انداز میں طنز کیا۔ ''اب بولو ناں! چپ کیوں ہو، جواب دو میرے سوال کا؟''

دل بولا۔ ''تمہیں جیت مبارک ہو مگر اتنا یاد رکھنا کہ یہ وقتی جیت ہے۔ بہت جلد میں تمہارے ہوش اُڑا دوں گا۔''

دماغ نے کہا۔ ''تم بے وقوف ہو اتنا بھی نہیں جانتے کہ جو میری مانتا ہے وہ ہمیشہ سرخرو ہوتا ہے دنیا والے اُسے جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔''

دل نے جواب دیا۔ ''اور جو میری مانتا ہے وہ مر کر بھی امر ہو جاتا ہے۔''

دل و دماغ کی یہ مدلل جنگ جاری تھی کہ معاً اُس کی سماعتوں سے ماں کی آواز ٹکرائی۔ ''یاری خان! چپ کیوں ہو جواب دوناں؟''

''ٹھیک ہے مور جان۔'' اُس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''مجھے آپ کی شرط منظور ہے۔ آپ جہاں چاہیں میری شادی کر سکتی ہیں، میں کوئی اعتراض نہیں کروں گا۔''

ماں اُسے ڈھیروں دعائیں دیتی ہوئی سونے کے لیے چل دی۔ جب کہ وہ دونوں بھائی دیر گئے تک دہکتی انگیٹھی کے گرد بیٹھے مستقبل کے لیے لائحہ عمل ترتیب دیتے رہے۔

☆......☆......☆

دوسرے روز ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر یاری خان کی ماں اپنی بہن کے گھر جا پہنچی۔ دونوں بہنوں کے تعلقات آپس میں بہت ہی اچھے تھے۔ سو بہن اُسے دیکھتے ہی خوشی سے کھل اُٹھی۔

''آپا خانم! خیر تو ہے آج صبح سویرے میری یاد کیسے آ گئی؟'' چھوٹی بہن نے مسکرا کر سوال کیا۔

وہ بولی۔ ''زرینہ! آج میں تیرے گھر میں سوالی بن کر آئی ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ تم اپنی آپا کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاؤ گی۔''

زرینہ نے کہا۔ ''آپا! آپ حکم کریں، آپ کے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے۔''

خانم نے بغیر کسی لگی لپٹی کے کہا۔ ''میں تم سے جان مانگنے کے لیے نہیں آئی ہوں بلکہ گل رُخ کا ہاتھ مانگنے کے لیے آئی ہوں۔ مجھے اپنے یاری خان کے لیے گل رُخ کا رشتا چاہیے؟''

زرینہ لمحہ بھر کے لیے تو متحیر رہ گئی۔ اُسے آپا خانم سے اس سوال کی شاید توقع ہی نہیں تھی۔ وہ تو سمجھ رہی تھی کہ شاید بڑی بہن کو روپے پیسے کی ضرورت ہوگی مگر وہ تو گل رُخ کا ہاتھ مانگ رہی تھی۔ چنانچہ زرینہ سوچوں میں مستغرق ہو گئی جب کہ خانم جواب طلب نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔ جب خاموشی کا ایک طویل وقفہ

گزر گیا تو خانم بولی۔ ''کن سوچوں میں گم ہو، میں بڑی اُمید لے کر تیرے پاس آئی ہوں۔ کیا تم بڑی بہن کو نامراد لوٹا دو گی؟''

''نہیں۔'' زرینہ نے انکار میں گردن ہلائی۔ ''میں آپ کو ہاں کر سکتی ہوں اور نہ ہی ناں کر سکتی ہوں۔ اس لیے کہ گل رُخ کا مالک اُس کا باپ ہے۔ آپ میرے بجائے گل رُخ کے باپ سے رشتا مانگیں۔''

وہ بولی۔ ''مجھے بھائی جی سے بات کرنا ہوتی تو تمہارے سامنے دامن کیوں پھیلاتی؟ اُن سے تم خود بات کرو گی اور آج ہی کرو گی۔''

''آپا! یہ کیسی بات کرتی ہو........اتنی جلدی بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟''

خانم نے کہا۔ ''یاری خان ملک سے باہر جانا چاہتا ہے کمانے کے لیے، بس اسی وجہ سے میں اُس کی جلد سے جلد شادی کرنا چاہتی ہوں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ آپ اُس کے پیروں میں زنجیر ڈالنا چاہتی ہیں؟''

''ہاں ایسی ہی کچھ بات ہے۔'' خانم نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''مجھے اندیشہ ہے کہ غیر ملک جا کر کہیں میرا بیٹا بھٹک نہ جائے۔''

زرینہ نے کہا۔ ''آپا! اگر ایسی بات ہے تو گل رُخ کا باپ کبھی بھی نہیں مانے گا۔ وہ صاف انکار کر دے گا۔''

''تم اُسے یہ بات مت بتانا کہ یاری خان ملک سے باہر جا رہا ہے۔'' خانم نے مشورہ دیا۔

''میں اپنے خاوند سے جھوٹ نہیں بول سکتی۔'' اُس نے انکار میں سر ہلایا۔ ''آپ تو جانتی ہی ہیں کہ وہ غصے کے بہت تیز ہیں۔ اُنہیں اگر کسی طرح یہ بات معلوم ہو گئی تو وہ مجھے زندہ جلا ڈالیں گے۔''

''اس بات کا صرف مجھے اور تجھے پتہ ہے۔ جب ہم دونوں زبان بند رکھیں گی تو اُسے کیسے پتہ چلے گا؟''

''آپا! آپ مجھے آگ میں کودنے کا مشورہ دے رہی ہیں۔ جھوٹ جھوٹ ہی ہوتا ہے جلد یا بدیر ظاہر ہو جاتا ہے۔''

''اگر ایسا کچھ ہوا تو سارا الزام میں اپنے سر لے لوں گی۔ تجھ پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔''

''ٹھیک ہے آپا! میں کوشش کروں گی مگر آپ کو چند دن صبر کرنا پڑے گا۔ میں کوئی مناسب سا موقع دیکھ کر اُن سے بات کروں گی۔'' آخر کار وہ رضا مند ہوگئی۔

خانم خوشی خوشی گھر لوٹ آئی اور دونوں بیٹوں کو سامنے بٹھا کر ساری بات بتا دی۔ یاری خان کو یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ گل رُخ اُس کی بیوی بننے والی ہے مگر صمد یار خان یہ خبر سُن کر کچھ بجھ سا گیا۔ پتہ نہیں اُس کے دل میں کیا تھا؟

''اوئے لالے کی جان! تم نے کیوں منہ لٹکا رکھا ہے، کیا تمہیں اس بات کی کوئی خوشی نہیں ہوئی ہے؟'' یاری خان نے اُس کی اُتری ہوئی صورت دیکھ کر سوال کیا۔

وہ بوکھلا کر بولا۔ ''نن.........نہیں لالہ! ایسی کوئی بھی بات نہیں ہے۔''

''اگر ایسی بات نہیں ہے تو پھر تمہاری شکل لنگور جیسی کیوں ہوگئی ہے؟'' یاری خان نے شوخی سے پوچھا۔

''وہ دراصل لالہ! میرے امتحان ہونے والے ہیں ناں! تو بس اسی وجہ سے تھوڑا سا پریشان ہوں۔'' اُس نے بہانہ گھڑا۔

یاری خان نے کہا۔ ''اگر کوئی ایسی ویسی بات ہے تو ابھی بتا دو، تیرے لالہ کی جان بھی تیرے لیے حاضر ہے؟''

''کمال کرتے ہو لالہ!'' اُس نے ایک کھوکھلا سا قہقہہ لگایا۔ ''اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو میں آپ سے کیوں چھپاتا؟''

وہ بھائی کی پیٹھ تھپکتے ہوئے بولا۔ ''صمد خان! میں صرف تمہارا بھائی ہی نہیں ہوں، بلکہ باپ بن کر تیری پرورش کر رہا ہوں۔ ایک بات یاد رکھنا مجھ سے زندگی میں کبھی جھوٹ مت بولنا ورنہ مجھے بہت تکلیف ہوگی۔''

''نہیں لالہ! میں بھلا آپ سے کیوں جھوٹ بولنے لگا؟'' اُس نے دلِ مضطر کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

ماں اُن دونوں کو چھوڑ کر گھر کے کاموں میں لگ گئی جب کہ یاری خان کافی دیر تک چھوٹے بھائی کو کریدتا رہا مگر اُس نے اپنے دلی جذبات کو کچھ اس انداز میں چھپایا کہ یاری خان بالکل مطمئن ہوگیا۔



گل رُخ جابر خان اور زرینہ کی اکلوتی اولاد تھی۔ وہ جابر خان کو اپنی جان سے بھی پیاری تھی۔ رات کو کھانے کے بعد جب گل رُخ اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلی گئی تو زرینہ نے ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے شوہر کے سامنے خانم کا پیغام دہرادیا۔ جابر خان نے پہلے تو زرینہ کو آنکھیں دکھائیں اور پھر ناگوار انداز میں بولا۔ ''کیا خانم پاگل ہے اُسے گل رُخ اور یاری خان کی عمر میں کوئی فرق نظر نہیں آتا؟''

وہ بولی۔ ''اُن کی عمروں میں کوئی اتنا بڑا فرق تو نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ دس بارہ سال کا فرق ہوگا۔''

''خانم کی طرح شاید تمہارا بھی دماغ خراب ہوگیا ہے۔ دس بارہ سال سے بھی زیادہ کا فرق ہوگا اور یہ بہت بڑا فرق ہے۔'' وہ ایک دم غصہ ہوگیا۔

''آپ خواہ مخواہ غصہ کر رہے ہیں۔ ذرا ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کریں عمر کا یہ فرق لڑکی کے لیے اچھا ہوتا ہے۔'' زرینہ نے دلیل دی۔

وہ بولا۔ ''تجھے دانش ور بننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ گل رُخ کا رشتا میں خود طے کروں گا۔ تم بس اپنے کام سے کام رکھا کرو۔''

''کیوں...... میں کیا گل رُخ کی کچھ نہیں لگتی؟'' زرینہ کو بھی غصہ آگیا۔ ''دس ماہ اُسے پیٹ میں لے کر پھرتی رہی ہوں۔ اڑھائی برس اُسے دودھ پلایا ہے۔ میں ماں ہوں اُس کی، آپ سے زیادہ اُس پر میرا حق ہے۔''

''حق کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اُسے آگ میں جھونک دیا جائے۔ شادی گڈے گڑیا کا کھیل نہیں ہوتی عمر بھر کا ساتھ ہوتا ہے۔ انسان کو سوچ سمجھ کر رشتا طے کرنا چاہیے۔ ویسے بھی عجلت کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔'' اُس نے بھڑک کر جواب دیا۔

''میرا بھانجا لاکھوں میں ایک ہے۔ کیا کمی ہے اُن کے گھر میں، خدا کا دیا سب کچھ ہے اُن کے پاس، دو ہی تو بھائی ہیں۔ گل رُخ وہاں راج کرے گی۔''

''میں جو بھی فیصلہ کروں گا سوچ سمجھ کر کروں گا مگر فی الحال میں اس کام کے لیے سنجیدہ نہیں ہوں۔ اگر خانم کو جلدی ہے تو تم اُسے انکار کر دو۔ گل رُخ ابھی بچی ہے، شادی کے لیے بڑی عمر پڑی ہے۔ ابھی تو اُس کے کھیلنے

کودنے کے دن ہیں۔"

وہ بولی۔"گل رُخ پورے اٹھارہ برس کی ہو چکی ہے اور یہ شادی کے لیے مناسب عمر ہے۔ میں جانتی ہوں کہ آپ اُس سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں۔ مگر یہ بھی تو سوچیں کہ وہ بیٹی ہے آپ اُسے ساری عمر اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے۔"

"میں نے کہا ہے ناں! کہ میں سوچ سمجھ کر فیصلہ کروں گا، پھر تم کیوں اس بات کے پیچھے پڑ گئی ہو.......... کیا گل رُخ کسی کے ساتھ بھاگی جا رہی ہے؟" وہ زچ ہو گیا۔

"اللہ نہ کرے کیسی بات کرتے ہیں؟ میں تو بس یہ چاہتی تھی کہ وہ جتنی جلدی گھر کی ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔"

"یہ دیکھ۔" اُس نے بیوی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔"اللہ کی بندی! مجھے چند دن سوچنے کے لیے تو دے؟"

"ٹھیک ہے۔" وہ خوشی سے کھل اُٹھی۔"جتنے دن دل چاہے آپ سوچیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بس سوچتے وقت اتنا خیال رکھنا کہ یاری خان میرا بھانجا اور گل رُخ کا خالہ زاد ہے۔ وہ گل رُخ کے لیے اچھا شریکِ حیات ثابت ہوگا۔"

"اچھا اب زیادہ بک بک نہ کر اور میرے لیے قہوہ بنا دے۔" اُس نے ٹالنے والے انداز میں جواب دیا اور زرینہ اُٹھ کر کچن کی طرف چل دی۔

ایسے ہی وقت بیرونی گیٹ پر دستک ہوئی تو وہ اُٹھ کر گیٹ کی طرف چل دیا۔ اُس نے گیٹ کھولا تو سامنے صمد خان کھڑا ہوا تھا۔ جابر خان اُسے دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے تو حیران رہ گیا، پھر پوچھا۔" کیا بات ہے صمد خان.......کیسے آنا ہوا؟"

"آپ........آپ سے ایک ضروری کام ہے خالو" اُس نے جھجک کر جواب دیا۔

"ٹھیک ہے اندر آ جاؤ" اُس نے ہاتھ سے اشارہ کیا تو صمد خان تیزی سے اندر آ گیا۔

جابر خان نے گیٹ کو دوبارہ بند کیا اور صمد خان کو ساتھ لیے اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔"بیٹھو" اُس نے

ایک چارپائی کی طرف اشارہ کیا تو صمد خان جھجکتے ہوئے بیٹھ گیا۔

''ہاں اب بولو کیا کام ہے؟'' جابر خان نے اُس کے سامنے دوسری چارپائی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

گو کہ صمد خان اکثر اُن کے گھر آیا کرتا تھا مگر جابر خان سے اُس کا سامنا کم ہی ہوا کرتا تھا۔ زیادہ تر وہ اُس کی غیر موجودگی میں خالہ کے ہاں جایا کرتا تھا۔ اُسے جابر خان کی غصیلی طبیعت کے متعلق اچھی طرح معلوم تھا۔ چنانچہ جابر خان نے جس طرح اُس سے سوال کیا اس سے وہ قدرے نروس ہو کر کش مکش کا شکار ہو گیا۔ اُسے سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ بات شروع کرے تو کس طرح کرے؟ جابر خان بدستور جواب طلب نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سردیوں کا موسم ہونے کے باوجود صمد خان کو اپنا گلا خشک سا ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ اب وہ اُس وقت کو کوس رہا تھا جب اُس نے اِدھر آنے کا ارادہ کیا تھا۔

''تم چپ کیوں ہو......؟ کیا منہ میں زبان نہیں ہے؟'' اس بار جابر خان نے قدرے سختی کے ساتھ پوچھا۔

صمد خان کا سر جھکا ہوا تھا۔ تاہم وہ ہمت مجتمع کرتے ہوئے بولا'' وہ......وہ......خالو......دراصل......مم ......میں کہنا چاہتا تھا......کہ آپ......آپ اس رشتے سے انکار کر دیں۔''

''کس رشتے کی بات کر رہے ہو؟'' جابر خان نے آنکھیں نکالیں۔

''یا......یاری خان......اور گل......گل رُخ کے رشتے کی۔'' اُس نے بدقت تمام جواب دیا۔

''کیوں تمہیں کیا تکلیف ہے اس سے؟'' جابر خان نے مشکوک انداز میں پوچھا۔

''یاری خان ٹھیک آدمی نہیں ہے خالو......وہ......وہ گل رُخ کو خوش نہیں رکھ سکے گا۔'' اُس نے سہمے ہوئے انداز میں بتایا۔

''اوہ ......تو تم گل رُخ کے ہمدرد بن کر آئے ہو؟'' جابر خان نے طنزیہ انداز اختیار کر لیا۔ ''لیکن کیوں......تمہیں اپنے سگے بھائی سے زیادہ گل رُخ سے ہمدردی کیوں ہے؟ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ضرور ہو گی؟ مفت میں کون اتنی تکلیف اُٹھاتا ہے؟......اصل بات کیا ہے بولو؟''

''نن......نہیں خالو! ایسی تو......کک ......کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ ایک دم بوکھلا اُٹھا۔ ''مم......مجھے......دراصل آپ سے ہمدردی ہے......گل......رُخ سے تو......مم......میں نے کبھی

.......بب.......بات بھی نہیں کی.......آ.......آپ بلاوجہ.......مجھ پر شک کر رہے ہیں.......مم.......میں ایسا ویسا آدمی نہیں ہوں۔“

”سچی بات بتا دو، ورنہ گلا گھونٹ کر مار ڈالوں گا۔“ وہ جارحانہ انداز میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”بولو گل رُخ سے تمہارا کیا تعلق ہے؟ اور خبردار! اب کی بار اگر تم نے جھوٹ بولا تو میں تمہاری کھال ادھیڑ ڈالوں گا۔“

”مم.......میں.......قسم.......کھاتا.......ہوں خالو! کہ.......ایسی.......کک.......کوئی.......بات.......نن.......نہیں.......گگ.......گل.......“

وہ ابھی ہکلا ہی رہا تھا کہ جابر خان نے آگے بڑھ کر اُسے دو تھپڑ جڑ دیے۔

”حرام زادے! تمہاری یہ ہمت کہ تم جابر خان کی بیٹی کا نام لو۔“ جابر خان نے اُسے گریبان سے پکڑ لیا۔ ”میں تجھے زندہ زمین میں گاڑ دوں گا۔ بولو تمہارا گل رُخ سے کیا تعلق ہے؟ بولو ورنہ مار ڈالوں گا۔“

ایسے ہی وقت زرینہ قہوہ لے کر کمرے میں داخل ہوئی تو اندر کا منظر دیکھ کر وہ چلائی۔ ”جابر خان! اسے کیوں مار رہے ہو؟ کیا کیا ہے اس نے.......خدا کے لیے اسے چھوڑ دو.......میں خانم کو کیا منہ دکھاؤں گی؟“

جابر خان نے اُسے گریبان سے پکڑ کر چارپائی سے نیچے پٹخ دیا اور پھر اُس کے پہلو میں ایک زوردار ٹھوکر رسید کرتے ہوئے گرجا۔ ”پوچھ اپنے اس حرامی بھانجے سے کہ یہ میرے گھر میں کون سا مقصد لے کر آیا ہے اور گل رُخ سے اس کا کیا تعلق ہے؟“

”مجھے لگتا ہے کہ آپ کو کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔“ زرینہ قہوے کا کپ میز پر رکھتے ہوئے آگے بڑھی اور بپھرے ہوئے خاوند سے لپٹ گئی۔ ”خدا کے لیے مجھے بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے اور یہ یہاں اس وقت کیسے آ گیا؟“

”مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی ہے۔“ جابر خان خود کو چھڑاتے ہوئے بولا۔ ”بلکہ تم اندھی ہو چکی ہو اپنے بھانجے کی محبت میں۔ پوچھو ذرا اس سے کہ یہ یہاں کس نیت سے آیا ہے؟ اور گل رُخ کو بھی بلاؤ، مجھے لگتا ہے کہ یہ اُسی کی شہ پا کر یہاں آیا ہے۔ وہ یقیناً اس کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔“

”خدا کا خوف کرو جابر خان! اپنی معصوم بیٹی پر اس قدر گھناؤنا الزام مت لگاؤ۔“ وہ تڑپ کر بولی۔ ”صمد خان

کے ساتھ اُس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"خالہ جی! تمہیں اللہ کا واسطہ مجھے خالو سے بچاؤ۔" معاً صمد خان اُٹھ کر زرینہ کے قدموں سے لپٹ گیا۔" خدا کی قسم! میں تو خالو سے یاری خان کے رشتے کی بات کرنے کے لیے آیا تھا مگر خالو نے میری بات سننے کی بجائے مجھے مارنا شروع کر دیا، گھر آئے مہمان کے ساتھ بھی بھلا کوئی ایسا سلوک کرتا ہے؟"

صمد خان کو یوں گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے دیکھ کر جابر خان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ چلایا۔" حرام زادے! مجھ پر الزام لگاتے ہو، ابھی تھوڑی دیر قبل تو تم مجھ سے کہہ رہے تھے کہ یاری خان اچھا آدمی نہیں ہے اور میں گل رخ کا رشتا اُس نہ کروں۔"

"خالو! خدا کا خوف کریں میں نے ایسا کب کہا ہے؟" صمد خان نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔

"تیری تو........." وہ ایک گالی دیتے ہوئے طیش کے عالم میں اُس کی طرف بڑھا۔" آج میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"نہیں آپ اسے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔" زرینہ نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا اور پھر ڈٹ کر اُس کے سامنے کھڑی ہوگئی۔" مجھے یقین ہے کہ میرا بھانجا سچ کہہ رہا ہے۔ البتہ آپ کے دل میں اس قدر میل ہوگا یہ بات میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچی تھی۔"

"تیرے بھانجے کی ایسی کی تیسی۔" جابر خان تیزی سے دیوار پر ٹنگی ہوئی رائفل کی طرف بڑھا اور رائفل اُتارتے ہوئے بولا۔" آج میں اس کمینے بدذات کا قصہ ہی پاک کر دیتا ہوں۔"

رائفل اُتار کر وہ جونہی پلٹا عین اُسی وقت گل رُخ کمرے میں داخل ہوئی اور باپ اور صمد خان کے درمیان دیوار بن کر کھڑی ہوگئی۔" نہیں ابا جی! میں آپ کو ایسا نہیں کرنے دوں گی۔ آپ اس کے خون سے ہاتھ نہ ہی رنگیں تو اچھا ہوگا۔"

"ہٹ جاؤ گل۔" جابر خان جنونی انداز میں چلایا۔" آج اسے میرے ہاتھ سے کوئی بھی نہیں بچا سکتا۔ میں اسے چھلنی کر کے ہی رہوں گا۔"

"اگر یہ بات ہے ابا جی تو پہلے گولی آپ کو مجھ پر چلانا پڑے گی۔" گل رُخ نے فیصلہ کن انداز میں

کہا۔ ”مجھے مار کر ہی آپ اس تک پہنچ سکتے ہیں۔“

”گل! میں کہتا ہوں کہ میرے راستے سے ہٹ جاؤ ورنہ بے موت ماری جاؤ گی۔“ جابر خان نے رائفل سیدھی کرتے ہوئے اُسے وارننگ دی۔

”میں نہیں ہٹنے والی، اگر آپ کو گولی چلانی ہے تو بے شک چلادیں۔“ اُس نے ایک عزم سے جواب دیا۔

”اور گل کے بعد میری باری ہوگی۔“ زرینہ نے مداخلت کی۔ ”اب آپ سوچیں مت بلکہ گولی چلائیں، ہم مرنے کے لیے تیار ہیں۔“

صورتِ حال کو یک دم پلٹتے دیکھ کر اُس نے رائفل اپنی کنپٹی پہ رکھ دی۔ ”ٹھیک ہے اگر یوں نہیں تو پھر یوں سہی۔“ وہ فیصلہ کن انداز میں بولا اور دائیں بازو کو لمبا کرتے ہوئے انگوٹھا ٹریگر پر رکھ دیا۔

”نہیں......نہیں......“ دونوں ماں بیٹی ہذیانی انداز میں چیختی ہوئیں اُس کی طرف بھاگیں مگر اس سے قبل کہ وہ اُس تک پہنچ پاتیں معاً ”دھائیں دھائیں“ کی آواز گونجی اور جابر خان کٹے ہوئے درخت کی طرح لہراتا ہوا زمیں بوس ہوگیا۔



وہ دونوں ماں بیٹی کمرے کے فرش پر تڑپتے اور ایڑیاں رگڑتے جابر خان سے لپٹ کر رو رہی تھیں۔ اُن کی چیخیں اور آہیں سن کر صمد یار خان تیزی سے اُٹھا اور اپنے ہاتھ میں موجود ریوالور پلک جھپکنے کی دیر میں قمیص کے نیچے شلوار میں اڑس لیا۔ اُس کی چلائی گئی دونوں گولیاں جابر خان کے سر میں لگی تھیں۔ اُن ماں بیٹی کو خبر ہی نہ ہو سکی کہ جابر خان کو قتل کیا گیا ہے۔ وہ اُسے اقدام خودکشی سمجھ رہی تھیں۔ دونوں بدستور جابر خان سے لپٹی رو رہی تھیں مگر اب وہ قیدِ حیات سے آزاد ہو چکا تھا۔ اُسے اُن کے رونے، تڑپنے اور بین کرنے کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔

”ہائے خالہ! یہ......یہ کیا ہوگیا......خالو نے کیوں کیا ایسا؟......کاش تم لوگوں نے خالو کو نہ روکا ہوتا۔“ وہ مگرمچھ کے آنسو بہاتا ہوا زرینہ سے بولا۔ ”اس سے تو اچھا تھا کہ خالو میری جان لے لیتے......اب میں مور جان کو کیا منہ دکھاؤں گا؟“

زرینہ اُس وقت صدمے کی کیفیت میں تھی۔ اُس نے صمد یار خان کی بات کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ تب وہ بھی ماں

بیٹی کے ساتھ مل کر بین کرنے لگا۔ آن کی آن میں پورا گاؤں اُن کے گھر میں اکٹھا ہو گیا۔ کچھ اُنھیں تسلی دلاسہ دینے لگے تو بعض اصل بات کی تہہ تک پہنچنے کے لیے اُن سے سوال و جواب کرنے لگے۔ وہ ماں بیٹی لوگوں کے سوالات سے عاجز آنے لگی تھیں کہ ایسے ہی وقت یاری خان اور خانم وہاں پہنچ گئے۔ زرینہ بہن کے گلے لگ کر بین کرنے لگی۔ اُس کے نالے و آہیں آسمان کا دل دہلانے لگے۔ گل رخ بھی رو رہی تھی۔ رشتے دار اور جاننے والے اُنھیں تسلیاں اور دلاسے دے رہے تھے مگر غم کا یہ پہاڑ تسلیوں سے کہاں ٹلنے والا تھا۔

یاری خان نے جب صمد خان کو وہاں دیکھا تو ایک لمحے کو تو وہ چونک گیا۔ اُسے چھوٹے بھائی کی موجودگی وہاں کھٹک رہی تھی۔ ''رات کے اس وقت یہ یہاں کیا کر رہا تھا؟'' دماغ نے سوال کیا تو یاری خان کے دل و دماغ میں شک کے سانپ پھن اُٹھا کر کھڑے ہو گے۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر آگے بڑھ کر بھائی سے بولا۔ ''صمد! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

صمد خان اس اچانک سوال سے گڑبڑا گیا۔ ''لالہ! وہ......وہ......میں.....میں......''

یاری خان نے اُسے بازو سے پکڑا اور گھر کے ایک کونے میں لے گیا۔ ''ہاں اب بتاؤ یہ کیا چکر ہے......تم یہاں کیا کر رہے تھے؟''

صمد خان اتنی دیر تک خود کو سنبھال چکا تھا لہٰذا پُر اعتماد لہجے میں بولا۔ ''لالہ! میں خالو سے بات کرنے کے لیے آیا تھا۔''

''کون سی بات؟ اُس نے مشکوک انداز میں پوچھا۔

وہ بولا۔ ''آپ کے رشتے کی بات.........مجھے پتا ہے کہ آپ گل رخ کو پسند کرتے ہیں۔''

''جھوٹ مت بولو......سچ سچ بتاؤ اصل بات کیا ہے؟''

''لالہ! میں بھلا آپ سے کیوں جھوٹ بولوں گا......شاید......شاید آپ کو کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔'' اُس نے تحیر آمیز لہجے میں جواب دیا۔

''مجھے یقین نہیں آتا کہ تم خالو سے میرے رشتے کی بات کرنے آئے تھے؟''

''لالہ! مجھے آپ سے یہ اُمید نہیں تھی۔'' وہ روہانسا ہو گیا۔ ''آپ......آپ مجھ پہ شک کر رہے

ہیں......اپنے چھوٹے بھائی پہ.......اب میں یہ سچ ثابت کر کے ہی رہوں گا۔ چلو آؤ میرے ساتھ۔“

”کہاں؟“

”خالہ زرینہ کے پاس، وہ گواہ ہیں کہ میں نے آپ سے جو کچھ بھی کہا ہے اس میں رتی بھر بھی جھوٹ نہیں ہے۔“

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟“ یاری خان نے قدرے سخت انداز میں کہا۔ ”یہ وقت ایسی باتوں کے لیے مناسب نہیں ہے۔ اس وقت تو خالہ اپنے حواسوں میں بھی نہیں ہے۔ وہ بھلا تیری بات کیا جواب دے گی؟“

”ٹھیک ہے۔“ اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”جیسے آپ کی مرضی خالہ سے بعد میں پوچھ لیں گے......اگر میں جھوٹا ثابت ہو گیا تو پھر اپنے ہاتھوں سے مجھے گولی مار دینا میں آپ کو اپنا خون معاف کر دوں گا۔“

”جاہلوں جیسی باتیں مت کرو......میں اپنے بھائی کو گولی ماروں گا؟“

وہ بولا۔ ”بھائی پہ شک کر سکتے ہو تو پھر گولی مارنے میں تردد کیسا؟“

”میں نے تم پر شک نہیں کیا......البتہ تمہاری یہاں موجودگی مجھے ضرور کھٹک رہی ہے۔ بہر کیف یہ وقت ان باتوں کے لیے مناسب نہیں ہے۔ پہلے ہمیں خالو کے کفن دفن کا انتظام کرنا ہے۔“

دوسرے دن صبح سویرے جابر خان کا جنازہ پڑھ کر اُسے سپردِ خاک کر دیا گیا۔ گاؤں کے سردار نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے گاؤں کی بات گاؤں میں ہی رہنے دی تھی۔ علاقے کے پولیٹیکل ایجنٹ کے کانوں تک یہ بات پہنچی ہی نہیں تھی۔ زرینہ اور گل رُخ نے یاری خان کے سمجھانے پر یہ گواہی دی تھی کہ جابر خان کو رائفل کی صفائی کے دوران غلطی سے گولی لگ گئی تھی۔ چونکہ قبائلی علاقوں میں اکثر اس طرح کے واقعات پیش آتے رہتے تھے اس لیے سردار کے لیے شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ چنانچہ صمد خان صاف بچ گیا تھا۔

☆......☆......☆

چند روز گزرنے کے بعد جب خالہ کا غم قدرے ہلکا ہو گیا تو یاری خان اپنے شک کی تصدیق کرنے کے لیے اُن کے گھر پہنچ گیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد یاری خان براہ راست اصل موضوع پر آ گیا۔ ”خالہ! میں آپ سے کچھ پوچھنے کے لیے آیا ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ میری بات کا ٹھیک ٹھیک جواب دیں گی؟“ یاری خان نے

سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔
"کیا پوچھنا ہے تجھے؟" خالہ نے حیرانی کا اظہار کیا۔
وہ بولا۔"خالہ! جس رات خالو نے خودکشی کی تھی اُس رات صمد خان آپ کے ہاں کس لیے آیا تھا؟"
"مم......میں سمجھی نہیں.......تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" اُس کی حیرت دوچند ہوگئی۔
"خالہ! میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اُس رات صمد خان آپ کے گھر میں کیا کسی کام کے سلسلے میں آیا تھا، یا پھر ویسے ہی آیا تھا؟"
"تم جان کر کیا کرو گے؟ یہ گزری باتیں ہیں ان پر مٹی ڈالو۔"
"خالہ! میں بہت بڑی اُلجھن کا شکار ہوں اور آپ ہی مجھے اس اُلجھن سے نکال سکتی ہیں۔ خدا کے لیے بات کو ٹالنے کی کوشش نہ کریں۔ جو حقیقت ہے مجھے بتادیں؟" یاری خان نے منت کے انداز میں سوال کیا۔
"مجھے کچھ بھی معلوم نہیں ہے کہ وہ کس لیے آیا تھا.......کیا اُس نے تجھے کچھ بتایا ہے؟" خالہ نے نگاہیں چراتے ہوئے سوال کیا۔
"خالہ! مجھے لگتا ہے کہ آپ کچھ چھپا رہی ہیں۔"
"نن......نہیں......میں بھلا تم سے کوئی بات کیوں چھپاؤں گی؟.......میں اس بارے میں مکمل طور پر لاعلم ہوں۔"
"میں بتاتی ہوں یاری بھائی کہ اصل بات کیا ہے؟" بالکل غیر متوقع طور پر گل رُخ نے کمرے میں داخل ہو کر مداخلت کی۔
"تم چپ رہو گل رُخ۔" زرینہ نے بیٹی کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔"بڑوں کے بیچ چھوٹے نہیں بولتے۔ جاؤ باورچی خانے میں جا کر کام کرو۔"
"بڑے جب حقائق کو جھوٹ کا لبادہ اوڑھانے لگتے ہیں تو چھوٹوں کی مداخلت ناگزیر ہو جاتی ہے۔ آپ یاری بھائی سے اصل بات کس لیے چھپا رہی ہیں، کس کا ڈر ہے آپ کو؟"
زرینہ بولی۔"تم منہ بند کرتی ہو یا میں.............."

’’کیا کرلیں گی آپ؟‘‘ گل رُخ نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔’’کیا بابا کی طرح مجھے بھی خُودکشی کرنے پر مجبور کردیں گی؟‘‘

’’یہ......یہ......تم کیا رہی ہو گل......کیا خالو نے خالہ کی وجہ سے خودکشی کی ہے؟‘‘ یاری خان نے تحیر کے عالم میں سوال کیا۔

’’دماغ چل گیا ہے اس کا، بکواس کرتی ہے یہ۔‘‘ زرینہ خالہ چلائی۔’’اس کی بات کا کون اعتبار کرے گا؟‘‘

’’اماں! آپ مجھے بات کرنے دیں گی یا نہیں؟‘‘ گل نے دوٹوک انداز میں پوچھا۔

’’یاری! تم جاؤ یہاں سے۔‘‘ زرینہ خالہ دوبارہ چلائی۔’’میں......میں خود کوئی مناسب موقع دیکھ کر تمہیں ساری بات بتا دوں گی......مگر اس وقت خدا کے لیے یہاں سے چلے جاؤ......یہ......یہ لڑکی پاگل ہو چکی ہے۔‘‘

’’اماں! کیوں جھوٹ بولتی ہیں؟ میں یاری بھائی کو سچ بتانا چاہتی ہوں اور آپ مجھے پاگل قرار دے رہی ہیں۔‘‘

زرینہ نے بیٹی کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے یاری خان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔’’یہ دیکھ بیٹے! میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ تمہیں خدا کا واسطہ ابھی یہاں سے چلے جاؤ......یہ موقع ایسی باتوں کے لیے مناسب نہیں ہے۔‘‘

’’خالہ! مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ آپ.....آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں؟‘‘ یاری خان نے اُلجھے ہوئے انداز میں پوچھا۔

وہ بولی۔’’وقت آنے پر میں تجھے حق بجانب نظر آؤں گی۔ بعض دفعہ ہمیں جو نظر آ رہا ہوتا ہے حقیقت اُس کے برعکس ہوتی ہے۔ تم بھی کچھ روز تک صبر کرلو، سب معلوم ہو جائے گا۔ آج میں تجھے غلط لگتی ہوں مگر کل مجھے یقین ہے کہ میں تجھے صحیح لگوں گی۔‘‘

اُس نے کہا۔’’خالہ! میں آپ کو غلط نہیں سمجھتا۔ البتہ آپ سے ایک شکایت ضرور ہے کہ آپ مجھ پر اعتبار نہیں کر رہیں۔‘‘

''میں تمہارے سب گلے شکوے دُور کردوں گی مگر اس وقت نہیں۔''

''ٹھیک ہے خالہ! میں جارہا ہوں۔'' اُس نے مایوسی کے عالم میں جواب دیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا بیرونی دروازے سے باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

''تم بھائی کے ہاتھوں بھائی کا خون کرانے پر کیوں تلی ہو؟'' یاری خان کے باہر نکلتے ہی زرینہ بیٹی پر چڑھ دوڑی۔ ''صمد خان کی موت سے تیرا باپ کیا واپس آجائے گا؟''

''وہ میرے باپ کا قاتل ہے ماں! میں اُسے کبھی معاف نہیں کروں گی۔'' گل رُخ نے طیش کے عالم میں جواب دیا۔

''وہ تمہارے باپ کا قاتل کیسے ہوگیا......؟ تم جانتی ہو کہ تمہارے باپ نے خودکشی کی ہے اور وہ بھی تمہاری نگاہوں کے سامنے۔''

''اُسے خودکشی کرنے پر صمد خان نے ہی مجبور کیا ہے۔ میں جب اُسے پسند ہی نہیں کرتی تو پھر وہ کیوں میرے پیچھے پڑا ہوا ہے؟ میں مرتو سکتی ہوں مگر اُس سے شادی نہیں کرسکتی، یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔''

''تمہیں اُس سے شادی کرنے پر کون مجبور کررہا ہے؟ بے فکر رہو تمہاری شادی ہوگی تو یاری خان سے ہی ہوگی مگر خدا کے لیے یاری خان کو یہ بات کبھی مت بتانا کہ صمد خان بھی تم سے شادی کرنے کا خواہش مند تھا۔''

''میں اُن دونوں میں سے کسی سے بھی شادی نہیں کرسکتی۔''

''کیوں نہیں کرسکتی؟'' زرینہ نے چلا کر پوچھا۔ ''یاری خان میں کیا کمی ہے......کیا وہ اندھا ہے، لولا ہے یا لنگڑا ہے؟''

''اُس میں ایک ہی خامی ہے اور وہ ہے صمد یار خان کا بھائی ہونا، میں اُس گھر میں زندگی بھر کے لیے کیسے جاسکتی ہوں جہاں میرے باپ کا قاتل رہتا ہو؟''

وہ بولی۔ ''گل! مجھے مجبور مت کرو......شادی تو تجھے یاری خان ہی سے کرنا پڑے گی، چاہے ہنسی خوشی کرو یا رو دھو کر۔''

"ماں! آپ مجھے مجبور کریں گی تو میں بھی بابا کی طرح خودکشی کرلوں گی۔ بہتر ہوگا کہ آپ میری شادی کا خیال دل سے نکال دیں۔" اُس نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔

"دور ہوجاؤ میری نظروں سے بے حیا نافرمان۔" وہ چلائی۔ "وقت آنے دو پھر میں تم سے نمٹ لوں گی۔"

گل رُخ اُٹھی اور بھاگ کر باپ کے کمرے میں داخل ہوگئی۔ کھڑکی کے ساتھ ہی جابر خان کا بستر لگا ہوا تھا۔ اُسے دنیا سے گزرے ایک ہفتہ ہونے کو آیا تھا مگر اُس کا بستر بدستور اُسی جگہ لگا ہوا تھا۔ گل رُخ بستر پر اوندھی لیٹ گئی اور تکیے میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ اُسے شدت سے بابا کی یاد آنے لگی۔ آج اگر وہ زندہ ہوتے تو یقیناً اپنی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی کا ساتھ دیتے۔ اماں اُسے یوں بے عزت کرنے کی کبھی ہمت نہ کرتیں۔ اُس کے خاموش آنسو بابا کا تکیہ بھگونے لگے مگر بابا کے وہ پُرشفقت ہاتھ جن کی انگلیوں کی پوریں یہ آنسو پونچھا کرتی تھیں وہ ہاتھ، وہ انگلیاں بابا کے ساتھ ہی رزقِ خاک ہوچکی تھیں۔ بابا اُس کے لیے وقت کی کڑی دھوپ میں شجرِ سایہ دار کی طرح تھے لیکن آج وہ شجر نہیں رہا تھا۔ چنانچہ وقت کی کڑی دھوپ اُس کا کومل بدن جلا رہی تھی۔ روتے روتے اُس کی ہچکی بندھ گئی مگر اماں نے پلٹ کر اُس کی خبر ہی نہ لی۔

ذرا دیر کے بعد جب اُس کے دل کا بوجھ قدرے ہلکا ہوگیا تو وہ خود ہی اوڑھنی کے پلو سے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے اُٹھ بیٹھی۔ بابا کے بستر سے ذرا اُوپر دیوار پر لگی کھونٹی سے بابا کی محبوب رائفل لٹکی ہوئی تھی۔ یہ آٹھ ایم ایم کی ایک خوب صورت اور دیدہ زیب رائفل تھی۔ اسی رائفل سے بابا نے خودکشی کی تھی۔ اس رائفل کے چیمبر میں دس گولیوں کی گنجائش تھی اور بابا اُسے ہمہ وقت لوڈ رکھا کرتے تھے۔ رائفل کے چیمبر میں دس کی دس گولیاں بھری رہتی تھیں۔ گل رُخ چند لمحے رائفل کو گھورتی رہی پھر غیر ارادی طور پر اُٹھ کر کھونٹی سے رائفل اُتار لی ...... دیگر بہت سی قبائلی لڑکیوں کی طرح وہ بھی رائفل کے استعمال سے اچھی طرح واقف تھی۔ بابا نے خود ہی بڑے شوق سے اُسے رائفل چلانا سکھایا تھا۔ اُس کا نشانہ بھی بہت اچھا تھا۔ چند ثانیے وہ رائفل پر ہاتھ پھیرتی رہی اور بابا کو یاد کرتی رہی، پھر اچانک ہی اُس نے رائفل کا کاکنگ ہینڈل کھینچا اور چیمبر میں موجود گولیاں نکالنے لگی۔ ایک ایک کرکے اُس نے تمام گولیاں نکال لیں اور پھر گولیوں کو شمار کیا تو اُس کا دل بے اختیار دھڑک اُٹھا۔ یہ پوری دس گولیاں تھیں، حالانکہ دس کی بجائے چیمبر میں نو گولیاں ہوتیں۔ جو گولی بابا نے خود پر چلائی تھی وہ

رائفل میں موجود نہیں ہونی چاہیے تھی۔ اُس کا دل پہلو میں اچھلنے لگا۔ دس گولیوں کی موجودگی سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اُس کے بابا نے خودکشی نہیں کی تھی۔ اُس نے دل ہی دل میں سوچا۔ ''اگر بابا نے خودکشی نہیں کی تو پھر اُس پر گولی کس نے چلائی تھی؟'' دماغ نے فوراً دلیل دی۔ ''یہ کام صمد خان ہی کا ہو سکتا ہے۔'' وہ دماغ کی اس دلیل کی نفی نہیں کر سکتی تھی کیونکہ اُس وقت کمرے میں اُن ماں بیٹی کے علاوہ تیسرا شخص صمد خان ہی تھا۔

''اماں اماں۔'' وہ چلاتی ہوئی کمرے سے باہر نکلی اور ماں کے کمرے میں داخل ہوگئی۔ زرینہ نے اُسے حواس باختگی کے عالم میں دیکھا تو پریشان ہو کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے تم چلا کیوں رہی ہو؟''

وہ پُرجوش انداز میں بولی۔ ''اماں! بابا نے خودکشی نہیں کی تھی بلکہ اُنھیں قتل کیا گیا ہے۔''

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟'' اماں نے حیرت اور پریشانی کی ملی جلی کیفیت میں سوال کیا۔ ''یہ......یہ......کیا بکواس کر رہی ہو......تمہارے بابا نے ہم دونوں کے سامنے ہی تو خود کو گولی ماری تھی۔''

''نہیں اماں۔'' اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''بابا نے خود کو گولی نہیں ماری تھی......بلکہ اُسے......اُسے صمد خان نے گولی ماری تھی۔''

''شاید تم اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی ہو۔'' ماں نے ترحم آمیز نظروں سے اُسے دیکھا۔ ''ہوش میں آؤ میری بچی! یہ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو؟''

''ماں! میں پوری طرح ہوش میں ہوں، آپ میرے ساتھ بابا کے کمرے میں چلیں میں آپ کو کچھ دکھاتی ہوں۔'' اُس نے جوش کے عالم میں جواب دیا۔

''چلو دکھاؤ ایسا کیا ہے وہاں کہ تم اتنا پرجوش ہو رہی ہو۔'' اماں اُٹھ کر اُس کے ساتھ چل دی۔

دونوں آگے پیچھے چلتی ہوئی جابر خان کے کمرے میں داخل ہوگئیں۔ سامنے ہی بستر پر رائفل اور گولیاں پڑی ہوئی تھیں۔ گل رُخ رائفل اور گولیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''اماں! یہ گولیاں گنو۔''

''مجھے لگتا ہے تم سچ مچ پاگل ہوگئی ہو؟'' اماں نے مشکوک نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

وہ بولی۔ ''پہلے آپ گولیاں تو گنیں، پھر بے شک مجھے پاگل کہتی رہنا۔''

زرینہ نے بیزار انداز میں گولیاں گنیں اور کہا۔ ''یہ دس گولیاں ہیں۔''

''اور بابا کی رائفل میں کتنی گولیاں آتی ہیں؟'' گل نے پوچھا۔

''دس گولیاں آتی ہیں اور کتنی آتی ہیں؟'' زرینہ نے اُلجھے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

''اماں! یہ دس گولیاں میں نے ابھی ابھی بابا کی رائفل سے نکالی ہیں۔اگر بابا نے اس رائفل سے خودکشی کی ہے تو پھراس میں دس کی جگہ نو گولیاں ہوتیں۔ دسویں گولی کا کوئی جواز ہی نہیں بنتا؟''

''تم......تم سچ کہہ رہی ہو؟'' ماں نے صدمے کی کیفیت میں سوال کیا۔

''مجھے بھلا جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟'' گل رُخ نے جواب دیا۔

'' اس......اس......کا مطلب ......ہے کہ......کہ تمہارے بابا......کو گولی صمد خان نے ......مم ......ماری......'' بات مکمل ہونے سے قبل ہی زرینہ لہراتے ہوئے زمین بوس ہوگئی۔

''اماں!'' گل رُخ چیختے ہوئے ماں سے لپٹ گئی۔'' خدا کے لیے اُٹھو......اماں اُٹھو........اُٹھو اماں اُٹھو........'' وہ چیخ چیخ کر رونے لگی مگر ماں کے بدن میں کوئی جنبش پیدا نہ ہوئی۔



گاؤں سے باہر صمد خان ایک پہاڑی چٹان پر پریشانی کے عالم میں بیٹھا ہوا تھا۔اُس کے قریب ہی اُس کے بچپن کا دوست شاہ ولی بھی بیٹھا ہوا تھا جو ترحم نظروں سے صمد خان کی جانب دیکھ رہا تھا۔صمد خان کا کوئی بھی راز شاہ ولی سے پوشیدہ نہیں تھا۔وہ ہر بات بغیر پوچھے شاہ ولی کو بتا دیا کرتا تھا حتیٰ کہ اپنے خالو کو قتل کرنے والی بات بھی اُس نے شاہ ولی کو بتا دی تھی۔شاہ ولی چند لمحے تو اُس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا پھر کہنے لگا۔''صمد خان! تم نے اپنے خالو کو قتل کر کے بہت بُرا کیا ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ تم گل رُخ سے یہ کیسا پیار کرتے ہو؟ میں نے آج تک ایسا عاشق نہیں دیکھا جس نے اپنی محبوبہ کو یتیم بنا ڈالا ہو؟''

صمد خان بولا۔''شاہ ولی! میں نے ایسا جان بوجھ کر تو نہیں کیا، میں اگر ایسا نہ کرتا تو وہ مجھے گولی مار دیتا۔ میں نے صرف اپنی جان بچائی ہے اور اپنی جان بچانا کوئی جرم نہیں ہے۔تم بھی اگر میری جگہ ہوتے تو شاید یہی کرتے جو میں نے کیا ہے۔''

''نہیں۔'' اُس نے نفی میں سر ہلایا۔''میں کبھی بھی ایسا نہ کرتا...... پیار کرنے والے اپنی جان کی پرواہ نہیں

کیا کرتے۔ وہ جان دیتے ہیں، جان لیتے نہیں۔"

وہ ہنسا۔" شاہ ولی! ایسی باتیں فلموں اور قصے کہانیوں میں اچھی لگتی ہیں، حقیقی زندگی میں کوئی ایسا نہیں کرتا...... یہاں سب اپنے لیے جیتے ہیں۔ میں اگر گل رُخ کے باپ کی گولی کھا کر مرجاتا تو مجھے کیا فائدہ ہوتا، میں گل رُخ کو کیسے حاصل کرتا؟"

"گل رُخ کو تو تم اب بھی حاصل نہیں کر سکتے، وہ یاری خان کی منگیتر ہے۔"

"میرے اور گل کے بیچ جو بھی آیا جان سے جائے گا........ چاہے وہ میرا بھائی ہی کیوں نہ ہو؟" اُس نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔

"پیار میں زبردستی نہیں چلتی صمد خان! دیکھنا تم ایک دن ہار جاؤ گے۔ تمہاری محبت یک طرفہ ہے، گل تم سے محبت نہیں کرتی۔"

وہ پھر ہنسا۔" محبت ہمیشہ یک طرفہ ہوتی ہے۔ دو طرفہ تو سودا ہوتا ہے۔ مزا تو تب آتا ہے جب کوئی تم سے نفرت کرے اور تم اُس سے پیار کرو...... پیار کے بدلے پیار تو میرے نزدیک تجارت ہے اور میں تاجر نہیں ہوں عاشق ہوں۔"

"تمہاری یہ منطق میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ یک طرفہ محبت، محبت نہیں ضد کہلاتی ہے۔" شاہ ولی نے جواب دیا۔

"ضد کہلائے یا محبت....... مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ گل میری ہے اور ہمیشہ میری ہی رہے گی۔"

"گل کوئی پلاسٹک کی بنی گڑیا نہیں ہے، ایک جیتی جاگتی لڑکی ہے۔ تم اُسے زبردستی اپنے ساتھ کیسے رکھو گے، وہ تمہارا جینا حرام کر دے گی۔"

"گل کے ساتھ میں جہنم میں بھی جی سکتا ہوں۔"

"اور گل تمہارے ساتھ جنت میں بھی جینے کو تیار نہیں ہے۔" شاہ ولی نے طنز کیا۔

"تم کس کے ساتھ ہو میرے یا گل کے؟" اُس نے بُرا مناتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ بھی بھلا کوئی پوچھنے والی بات ہے؟ تم میرے دوست ہو تمہیں سمجھانا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ تم غلط راہوں پر چل رہے ہو، تمہارا یہ جنون کسی دن تمہاری جان لے لے گا۔ اب بھی وقت ہے خود کو سدھار لو بعد میں پچھتانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔''

''میں عاشق ہوں اور عاشقوں کی نصیحتوں کی ضرورت نہیں ہوتی...... سمجھے تم۔'' اُس نے بدستور بگڑے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

شاہ ولی نے کہا۔'' آج تجھے میری نصیحتیں ناگوار گزر رہی ہیں مگر کل جب زمانہ تجھے سبق سکھائے گا تو اُس وقت میں تجھے یاد آؤں گا مگر تب تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوگا۔ تمہارے اس سفر کا اختتام ایک دن بند گلی میں ہوگا۔ آگے جا نہیں سکو گے اور واپسی کے رستے وقت کی دھول میں کھو چکے ہوں گے۔''

''میں ہر دیوار گرانے کی طاقت رکھتا ہوں۔ تم دیکھنا ایک دن کامیابی میرے قدم چومے گی اور تم میرا دوست ہونے پر فخر کیا کرو گے۔''

وہ بولا۔'' میں ضرور تمہارا دوست ہونے پر فخر کروں گا اگر تم بغیر خون خرابہ کیے منزل تک پہنچ سکے تو تب۔''

''کیا تم نے وہ مثل نہیں سنی کہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔''

''تمہارے جیسے کسی جنونی نے ہی بنائی ہوگی یہ مثل ورنہ محبت تو نام ہی قربانی کا ہے۔''

اُس نے قہقہہ لگایا۔'' محبت کی خاطر میں نے اپنے ہاتھ خون سے رنگ لیے ہیں۔ یہ قربانی نہیں تو اور کیا ہے؟''

''تم پاگل ہو صمد خان اور پاگلوں کا علاج کسی کے پاس نہیں ہوتا۔''

''تو پھر ہار مان لو، اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔''

''میرے ہار ماننے یا نہ ماننے سے کیا ہوگا؟........ کیا گل ہاں کر دے گی؟'' شاہ ولی نے سوال کیا۔

''وہ ہاں کرے یا ناں کرے بہر کیف ایک دن میں اُسے حاصل کر کے ہی رہوں گا۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو لیکن مجھے یہ ناممکن لگتا ہے۔ عورت کی نفرت کو محبت میں بدلنا آسان کام نہیں ہے؟''

وہ بولا۔'' میں نے یہ کب کہا ہے کہ یہ آسان کام ہے؟ بہت مشکل ہے مگر ناممکن نہیں ہے۔ دنیا میں کچھ بھی

ناممکن نہیں ہوتا البتہ اس کا انحصار انسان کی ہمت پر ہوتا ہے۔ بزدل کے لیے ممکن بھی ناممکن ہوتا ہے جب کہ ایک بہادر اور مستقل مزاج انسان ناممکن کو بھی ممکن بنا ڈالتا ہے۔''

''ٹھیک ہے بابا تم جیتے میں ہارا۔'' شاہ ولی نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔''اب چلو بہت دیر ہوگئی ہے۔''

''نہیں۔'' اُس نے سر ہلایا۔''تم جاؤ میں ابھی تھوڑی دیر تک بیٹھوں گا۔''

شاہ ولی خدا حافظ کہہ کر رخصت ہوگیا جب کہ وہ سوچوں میں غرق ہوگیا۔



وہ ایک چھوٹا سا ہاسپٹل تھا جہاں زرینہ سفید بستر پر چت لیٹی ہوئی تھی جب کہ گل رُخ بستر کے قریب بچھی ہوئی کرسی پر بیٹھی افسردہ انداز میں ماں کی جانب دیکھ رہی تھی۔ زرینہ غنودگی کے عالم میں تھی۔ غالباً ڈاکٹر نے اُسے سکون آور انجکشن لگا دیا تھا۔ ڈاکٹر نے کمرے سے جاتے ہوئے گل کو یہ تسلی بھی دے دی تھی کہ مریض کی حالت اب خطرے سے باہر ہے لہٰذا اُسے جاگنے اور تنگ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ گل کے چہرے پہ بے چارگی کے تاثرات چھائے ہوئے تھے اور وہ دل ہی دل میں ماں کی لمبی عمر کے لیے خدا سے دعائیں کر رہی تھی۔ ایسے ہی وقت کمرے سے باہر کاریڈور میں قدموں کی چاپ سنائی دی اور گل سر پر موجود دوپٹہ درست کرنے لگی۔

یاری خان کمرے کے اندر داخل ہوا اور خالہ کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔''گل! تجھے یوں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ خالہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں، ڈاکٹر نے کہا ہے کہ وہ صرف ذہنی صدمے کی وجہ سے بے ہوش ہوگئی تھیں۔''

وہ بولی۔''کیا آپ یہ نہیں پوچھیں گے کہ اماں کی اس حالت کا ذمہ دار کون ہے؟''

''میں سمجھا نہیں گل! کہ...... کہ تم کہنا کیا چاہتی ہو؟'' اُس نے حیرانی سے پوچھا۔

وہ چند لمحے یاری خان کی طرف دیکھتی رہی پھر ٹھہر ٹھہر کر بولی۔''اگر...... میں...... یہ کہوں کہ میرے بابا کو قتل کیا گیا ہے تو کیا آپ میری بات کا یقین کریں گے؟''

''یہ...... یہ...... تم کیا کہہ رہی ہو...... ہوش میں تو ہو؟''

''ہاں۔'' اُس نے سرہلایا۔''میں پوری طرح اپنے ہوش وحواس میں ہوں مگر میری بات سن کر آپ کے ہوش ضرور اُڑ جائیں گے۔''

''مم........میں نے کیا کیا ہے؟''

وہ بولی۔''میں نے یہ کب کہا ہے کہ آپ نے کچھ کیا ہے؟''

''تمہارا انداز اور رویہ بتارہا ہے کہ تم مجھ سے شاکی ہو۔''

''ہاں آپ کا یہ اندازہ بالکل درست ہے۔'' گل نے اثبات میں سرہلایا۔''میں آپ سے واقعی شاکی ہو، مگر میرے شاکی ہونے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ آپ نے کوئی قصور کیا ہے؟''

''تو پھر بتاؤ کون قصوروار ہے؟''

''سننے کا حوصلہ ہے آپ میں؟'' اُس نے طنز کے عالم میں سوال کیا۔

وہ بولا۔''تجھے اگر میرا حوصلہ آزمانا ہی مقصود ہے تو پھر جو کچھ تمہارے دل میں ہے بلا جھجک کہہ ڈالو، میں زخم کھانے کا عادی ہوں۔تم سے کوئی شکوہ نہیں کروں گا۔''

''تو پھر دل تھام کر سنو........''

''پپ........پانی........'' اچانک زرینہ نے کمزور سی آواز میں پانی مانگا اور گل کی بات ادھوری رہ گئی۔

گل نے سائیڈ ٹیبل پر رکھے جگ سے گلاس میں پانی ڈالا تو تب تک یاری خان خالہ کے سر کے نیچے بازو ڈال کر اُسے سہارا دے چکا تھا۔گل نے گلاس اُٹھایا اور ماں کے لبوں سے لگادیا۔زرینہ گھونٹ گھونٹ کر کے پانی پینے لگی۔گل کا دھیان پانی کے گلاس اور ماں کے چہرے کی طرف تھا جب کہ یاری خان گل کے چہرے کی طرف والہانہ انداز میں دیکھ رہا تھا۔اس قدر غور سے اُس نے پہلی بار گل کی طرف دیکھا تھا۔چنانچہ اُس کے دل کی دھڑکنیں اُتھل پتھل ہونے لگیں۔گل بے حد حسین وجمیل تھی، بلکہ حسین وجمیل کے الفاظ اُس کے حسن کا احاطہ کرنے کے لیے ناکافی تھے۔وہ یاری خان کو آسمان سے اُتری ہوئی کوئی اپسرا لگ رہی تھی جو شاید زمین پر اُس کے لیے اُتاری گئی تھی۔دل ہی دل میں وہ اپنی قسمت پر رشک کرنے لگا۔عین اسی لمحے کوئی کھنکارا تو یاری خان کی محویت ٹوٹ گئی۔اُس نے نظر اُٹھا کر کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا تو صمد خان اندر داخل ہو کر اُنھیں

غصیلی نگاہوں سے گھور رہا تھا۔
یاری خان اُسے دیکھ کر بولا۔ ''آؤ صمد خان! خالہ تمہاری ہی راہ دیکھ رہی ہے۔''
''خالہ کے پاس اُس کا چہیتا بھانجا موجود ہے پھر میری کیا ضرورت ہے؟'' اُس نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔
''یہ.....یہ تم کس لہجے میں بات کر رہے ہو؟'' یاری خان نے اُلجھ کر پوچھا۔
صمد خان جو اُن دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ بات بدل کر بولا۔ ''لالہ! کیا یہ میری خالہ نہیں ہیں؟''
''بالکل ہیں اس میں بھلا کیا شک ہے؟'' یاری خان نے مسکرا کر جواب دیا۔
''تو پھر مجھے خالہ کے بیمار ہونے کی اطلاع کیوں نہیں دی گئی۔ کیا میں خالہ کا کچھ بھی نہیں لگتا؟''
صمد خان کو دیکھ کر گل کے تن من میں آگ لگی ہوئی تھی مگر یہ موقع مناسب نہیں تھا۔ ماں کی موجودگی میں وہ کھل کر اپنی نفرت کا اظہار نہیں کر سکتی تھی تاہم اگر اُس کا بس چلتا تو وہ صمد خان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی۔ وہ اُس کے باپ کا قاتل تھا، اُسے یتیم اور اُس کی ماں کو بیوہ کرنے والا درندہ تھا لیکن وائے قسمت کہ وہ چاہتے ہوئے بھی اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ اُس نے ابھی تک نگاہ اُٹھا کر صمد خان کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔
یاری خان اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔ ''میں اماں کو بتا کر آیا تھا۔ اُس وقت تم گھر میں موجود نہیں تھے۔''
وہ بولا۔ ''لالہ! قصور آپ کا ہے اور گل ناراض مجھ سے ہوگی، اسی لیے تو وہ میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کر رہی۔''
گل کا جی چاہا کہ اُٹھ کر اُس قاتل کا منہ نوچ ڈالے مگر یہ سوچنا جس قدر آسان تھا اس پر عمل کرنا اُسی قدر مشکل تھا۔ وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔
''نہیں بھئی! یہ تمہارا وہم ہے گل تم سے ناراض تو نہیں ہے۔ دراصل اس وقت وہ صدمے کی کیفیت میں ہے۔'' یاری خان نے جواب دیا۔
''اوہ تو یہ بات ہے۔'' وہ آگے بڑھا اور گل سے زرینہ خالہ کی طبیعت کے متعلق سوال کرنے لگا۔ ''خالہ اب

ٹھیک تو ہیں ناں؟ انھیں ہوا کیا تھا...... کل تک تو یہ بالکل تندرست تھیں؟"

گل نے اُس کے کسی سوال کا جواب نہ دیا بلکہ اُس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ تب وہ کھسیانا سا ہو کر یاری خان سے بولا۔ "گل شاید ابھی تک صدمے کی کیفیت میں ہے، تبھی تو میری کسی بات کا جواب ہی نہیں دے رہی۔"

"تم جاؤ گھر میں ماں اکیلی ہوں گی۔ خالہ کا خیال رکھنے کے لیے میں کافی ہوں۔" یاری خان نے اُسے ٹالنے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

"نہیں لالہ! آپ جائیں میں ان کا خیال رکھوں گا۔" وہ بھلا کہاں جھانسے میں آنے والا تھا۔ "ویسے بھی اماں آپ کو بلا رہی ہیں۔"

"کیوں اماں مجھے کس لیے بلا رہی ہیں؟" یاری خان نے استفسار کیا۔

"مجھے اماں نے بتایا تو کچھ نہیں لیکن مجھے اندازہ ہے کہ وہ آپ سے کوئی بہت اہم بات کرنا چاہتی ہیں۔"

"تم ایسا کرو اماں کو یہیں لے آؤ۔" یاری نے مشورہ دیا۔ "وہ خالہ سے بھی مل لیں گی اور مجھ سے بات بھی کر لیں گی۔"

"نہیں لالہ! میں خالہ کو ایسی حالت میں چھوڑ کر جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔" اُس نے چہرے پر مصنوعی پریشانی طاری کرتے ہوئے جواب دیا۔

"میں ہوں ناں! خالہ کے ساتھ پھر تجھے کیا پریشانی ہے؟"

"میں تو کہتی ہوں کہ آپ دونوں چلے جائیں، اماں کے ساتھ میں ہوں ناں! پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔" گل نے مداخلت کی۔

"میں تو قطعاً نہیں جاؤں گا...... ہاں اگر لالہ جانا چاہے تو جا سکتا ہے۔" صمد خان نے حتمی لہجے میں جواب دیا۔

"ٹھیک ہے تو پھر میں ہی چلی جاتی ہوں آپ دونوں خالہ کے پاس رہیں۔" گل نے جھنجھلا کر کہا اور پھر تیزی سے اُٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

یہ سب کچھ اس قدر تیزی سے وقوع پذیر ہوا تھا کہ دونوں بھائی ایک دوسرے کی صورت ہی دیکھتے رہ گئے۔

''چلواب خالہ کا خیال رکھو، میں دیکھتا ہوں کہ گل کدھر گئی ہے؟'' یاری خان نے پریشانی کے عالم میں کہا اور پھر اُسے بولنے کا موقع دیے بغیر تیزی سے باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

ہاسپٹل کے احاطے میں یاری خان کی نگاہیں چاروں طرف گھوم رہی تھیں مگر کوشش کے باوجود اُسے گل نظر نہیں آرہی تھی۔ یونہی گھومتے گھومتے وہ ہاسپٹل کے اکلوتے کنٹین میں داخل ہوگیا۔ سامنے ہی ایک ٹیبل پر گل موجود تھی۔ وہ تیز تیز چلتا ہوا اُس کے پاس پہنچ گیا۔ ''گل! بات کیا ہے مجھے بتاؤ...... تم یوں خالہ کو چھوڑ کر یہاں آکر کیوں بیٹھ گئی ہو، مجھ سے کوئی شکایت ہے یا صمد خان سے؟''

''کسی سے بھی نہیں ہے۔'' اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''نہیں کچھ تو ہے ورنہ میں نے تجھے کبھی اس قدر پریشان نہیں دیکھا۔ بولو کیا بات ہے؟'' یاری خان نے اصرار کیا۔

''میں نے کہا ہے ناں کہ کوئی بات نہیں پھر آپ کیوں میرے پیچھے پڑے ہوئے ہو؟'' وہ جھنجھلا اُٹھی۔

''گل! میری بات سنو'' وہ اُس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ تمہیں افسردہ دیکھ کر مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ میں تمہارے دکھ بانٹنا چاہتا ہوں۔ جانتی ہو کیوں؟...... اس لیے کہ میں تجھے اپنا سمجھتا ہوں اور...... اور اگر سچ پوچھو تو...... میں تم سے پیار کرنے لگا ہوں۔''

''کتنا پیار کرتے ہو مجھ سے؟'' اُس نے بلاجھجک سوال کیا۔

''مم...... میں سمجھا نہیں۔'' وہ گڑبڑا گیا۔ ''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟''

وہ بولی۔ ''اس میں سمجھ میں نہ آنے والی کون سی بات ہے؟...... یہ تو ایک عام سا سوال ہے کہ آپ مجھ سے کتنا پیار کرتے ہیں؟''

''اوہ...... تو یوں کہو ناں! کہ تم مجھے آزمانا چاہتی ہو؟''

''ہاں'' اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں یقیناً آپ کو آزمانا چاہوں گی۔''

''ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔ بولو مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

"میں بابا کے قاتل سے انتقام لینا چاہتی ہوں کیا آپ میری خاطر یہ کام کر سکتے ہیں ہیں؟" اُس نے پُرامید نظروں سے یاری خان کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں اگر تم مجھے یقین دلا دو کہ تمہارے بابا کو واقعی قتل کیا گیا ہے تو میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں قاتل کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" یاری خان نے پُرعزم لہجے میں جواب دیا۔

"یاری خان! ابھی قسم مت کھاؤ...... یہ نہ ہو کہ قاتل کا نام سن کر آپ کے پیروں تلے سے زمین نکل جائے؟"

"پہیلیاں مت بوجھواؤ گل! مجھے قاتل کا نام بتاؤ؟"

وہ بولی۔ "پہلے ثبوت پیش کروں گی، پھر قاتل کا نام بتاؤں گی۔"

"تو ثبوت پیش کرو ناں! کس نے روکا ہے تجھے؟"

"ثبوت یہاں نہیں، گھر میں موجود ہے۔"

"تو چلو گھر چلتے ہیں۔" وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "میں بھی دیکھوں کہ تمہارے پاس کون سا ثبوت ہے؟"

"نہیں ابھی نہیں۔" اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ "ماں کو یہاں چھوڑ کر میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی۔"

"خالہ کے پاس صمد خان ہے ناں! اُس کی تم فکر مت کرو، صمد خان خالہ کا خیال رکھے گا۔"

"آپ بیٹھیں۔" وہ یاری خان کا ہاتھ پکڑتے ہوئی بولی۔ "جلد بازی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وقت آنے پر میں آپ کو ثبوت دینے کے ساتھ ساتھ قاتل کا نام بھی بتا دوں گی۔"

گل نے اُس کا ہاتھ کیا پکڑا یاری خان کے جسم میں کرنٹ سا دوڑ گیا۔ گل کا ہاتھ مخمل کی طرح نرم وگداز تھا۔ یاری خان کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اس ہاتھ پر اپنے لب رکھ دے۔ اُس وقت وہ لذت وکیف کی جس کیفیت سے گزر رہا تھا وہ اُس نے اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ دل ہی دل میں وہ اپنی قسمت پر رشک کر رہا تھا کہ اُسے بن چاہے گل جیسی کومل اور سندر لڑکی جیون ساتھی کے طور پر مل گئی تھی۔ وہ سحر زدہ سا ہو کر گل کے سامنے بیٹھ گیا اور اُسے والہانہ انداز میں دیکھنے لگا۔ گل نے اپنے چہرے پر اُس کی نگاہوں کی تپش محسوس کرتے ہوئے نظریں جھکا دیں اور پھر حیا آلود لہجے میں پوچھا۔ "ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں، کیا اس سے پہلے کبھی کوئی لڑکی

نہیں دیکھی؟"

وہ بولا۔"بہت سی دیکھی ہیں مگر اُن میں کوئی بھی تیرے جیسی نہیں تھی۔"

"مجھے بنائیں مت۔"اُس نے لجا کر کہا۔"مجھ میں ایسا کیا ہے جو آپ کو دوسری لڑکیوں میں نظر نہیں آیا؟"

"مجھے آپ نہیں "تم" کہو گل۔" وہ لفظ "تم" پر زور دیتے ہوئے بولا۔"میں تیرے منہ سے آج کے بعد لفظ آپ نہیں سننا چاہتا، مجھے اس لفظ سے اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔وعدہ کرو کہ تم اب مجھے "آپ" کہہ کر نہیں پکارا کرو گی؟"

"آپ......آپ بڑے ہیں مجھ سے......میں بھلا یہ گستاخی کیسے کرسکتی ہوں؟" اُس نے شرما کر جواب دیا۔

"نہیں......یہ گستاخی نہیں ہے گل! بلکہ اسے میں اپنی عزت افزائی سمجھوں گا۔"

وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔"لل......لیکن......مم......مجھے شرم آتی ہے۔میں......آپ کو......تم نہیں کہہ سکتی۔"

ایسے ہی وقت جب وہ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے ایک دوسرے کو والہانہ انداز میں دیکھ رہے تھے۔بالکل غیر متوقع طور پر کنٹین کی کھڑکی سے اُنھیں دو آنکھیں گھور رہی تھیں اور اُن آنکھوں میں نفرت کے شعلے سے بھڑک رہے تھے۔یہ آنکھیں کسی دشمن کی نہیں تھیں بلکہ صمد خان کی تھیں، جو اُنھیں تلاش کرتے کرتے اچانک ہی وہاں پہنچ گیا تھا۔یاری خان کے ہاتھوں میں گل کے ہاتھ دیکھ کر اُس کے تن من میں آگ سی لگ گئی تھی۔اُسے اپنا بدن ان دیکھے شعلوں میں جلتا ہوا محسوس ہونے لگا۔گل کے ہاتھ وہ کسی غیر کے ہاتھوں میں بھلا کیسے برداشت کرسکتا تھا۔چاہے وہ ہاتھ اُس کے بھائی کے ہی کیوں نہ ہوتے؟

"لالہ!" وہ خود کلامی کرتے ہوئے بولا۔"یہ......یہ آپ نے اچھا نہیں کیا میرے ساتھ......میں اب چاہوں بھی تو آپ کو معاف نہیں کرسکتا......بہت بُرا کیا ہے آپ نے لالہ بہت بُرا۔" غیر ارادی طور پر اُس کا ہاتھ رینگتا شلوار کے نیفے تک پہنچ گیا۔دوسرے ہی لمحے اُس کے ہاتھ میں ایک خوف ناک پستول نظر آنے لگا اور آنکھوں سے قہر برسنے لگا۔اُس نے پستول والا ہاتھ سیدھا کیا اور یاری خان کے سر کا نشانہ لیتے ہوئے ہونٹ بھینچ لیے۔اُس وقت اُس کے چہرے پر رحم کا شائبہ تک نہیں تھا۔

صمد خان کے دائیں ہاتھ کی شہادت والی انگلی ٹریگر پر تھی اور اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے قہر برس رہا تھا۔گل کے ہاتھ یاری خان کے ہاتھوں میں تھے اور صمد خان کے دل پر آرے سے چل رہے تھے۔ایک آتش فشاں تھا جو اُس کے دل کے اندر جل رہا تھا۔اُسے یوں محسوس ہونے لگا کہ نفرت کا یہ آتش فشاں اُسے بھک سے اُڑا دے گا اور اُس کا جسم ننھے ننھے ذروں میں بٹ جائے گا۔اُس کے اندر کی ساری نفرت اُس کی اُس انگلی میں سما گئی جو اُس نے پستول کے ٹریگر پر رکھی ہوئی تھی۔یاری خان اور گل اُس سے بے خبر ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے۔سر پر منڈلانے والی موت سے وہ قطعی لاعلم تھے۔

ٹریگر پر اُس کی انگلی کا دباؤ بڑھنے لگا اور ہونٹ سختی سے بھنچ گئے۔وہ بس گولی چلانے والا ہی تھا کہ معاً اُسے ایک گرج دار آواز سنائی دی۔"رُک جاؤ ورنہ کھوپڑی کھول کر رکھ دوں گا۔"

غیرارادی طور پر اُس نے اُس جانب دیکھا جدھر سے آواز آئی تھی۔اُس سے چند قدموں کے فاصلے پر ہاسپٹل کا سکیورٹی گارڈ ہاتھ میں گن پکڑے اُسے غضب ناک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" گارڈ نے اُس کے قریب پہنچ کر کرخت لہجے میں سوال کیا۔

"کک......کچھ......نہیں......بس ایسے ہی......اپنے......بھ......بھائی کو ڈرا رہا تھا۔" اُس نے بوکھلا کر جواب دیا۔

"ڈرا رہا تھا کہ قتل کر رہا تھا؟" گارڈ نے مشکوک انداز میں سوال کیا۔

"مم......میں بھلا......اپنے بھائی کو کیوں قتل کرنے لگا؟" وہ بدستور بوکھلایا ہوا تھا۔

گارڈ بولا۔"ڈرانے والے یوں کھڑکیوں سے چھپ کر بھائیوں کو نشانے پر نہیں رکھتے......اور پھر تمہارے ہاتھ میں پستول بھی اصلی ہے۔میں ابھی پولیس کو فون کرتا ہوں وہ خود ہی تم سے نمٹ لیں گے۔"

"نہیں......تم......ایسا نہیں کر سکتے۔" گارڈ کو جیب سے موبائل فون نکالتے دیکھ کر وہ گڑگڑایا۔"مجھے خواہ مخواہ پولیس کے حوالے کر کے تجھے کیا فائدہ ہوگا؟"

"اور تجھے چھوڑ کر بھلا مجھے کیا فائدہ ہوگا؟" گارڈ طنزیہ انداز میں مسکرایا۔

"تم اگر چاہو تو اچھا خاصہ فائدہ ہو سکتا ہے۔" اُس نے پستول چھپاتے ہوئے جیب سے والٹ نکال لیا۔

''اوہ.......تو تم مجھے رشوت دینا چاہتے ہو؟''

''آج کل لوگ اسے نذرانہ اور چائے پانی بولتے ہیں تم.............''

''میں لعنت بھیجتا ہوں تیرے نذرانے پر، اب تو تجھے پولیس کے حوالے کرنا ہی پڑے گا۔'' گارڈ نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔

''تم میری مجبوری کا ناجائز فائدہ اُٹھا رہے ہے...... تمہیں شرم آنی چاہیے ایک معزز شہری سے رشوت مانگتے ہوئے۔'' یاری خان اور گل کو کھڑکی کے قریب پہنچتے دیکھ کر وہ چلایا۔ ''تم...... تم کیسے انسان ہو...... کچھ شرم حیا ہے کہ نہیں؟''

لمحہ بھر کے لیے تو گارڈ اُس کی دیدہ دلیری پہ حیران رہ گیا۔ اُس نے گرگٹ کے رنگ بدلنے والا محاورہ سنا تھا، مگر کسی انسان کو گرگٹ کے مانند رنگ بدلتے پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ جو شخص چند لمحے قبل اُس کے سامنے گڑگڑا رہا تھا، وہی اب چلا چلا کر بول رہا تھا۔

''یہ...... یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو؟'' گارڈ اپنے دفاع میں بولا۔ ''میں ایک ایمان دار ریٹائرڈ فوجی ہوں اور تم اپنا جرم چھپانے کے لیے مجھ پر رشوت لینے کا گھناؤنا الزام لگا رہے ہو...... میں نے زندگی میں تم جیسا بے غیرت انسان کبھی نہیں دیکھا۔''

''اب دیکھ لیا ہے ناں؟'' وہ اُسے آنکھ مارتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔ ''جاؤ ورنہ نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔''

''یہ تم نے کیا ہنگامہ مچا رکھا ہے صمد خان؟'' یاری خان نے کھڑکی پر جھکتے ہوئے سوال کیا۔

''لالہ! ہنگامہ میں نے نہیں بلکہ اس رشوت خور گارڈ نے مچا رکھا ہے۔ یہ...... یہ مجھ سے یونہی رشوت مانگ رہا ہے۔'' اُس نے سفید جھوٹ بولتے ہوئے جواب دیا۔

گارڈ بولا۔ ''یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اس کے پاس پستول ہے اور یہ یہاں کھڑکی سے غالباً آپ کو گولی مارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اسے رنگوں ہاتھوں پکڑا ہے۔''

''میں اور اپنے لالہ کو گولی ماروں گا...... پاگل کے بچے! تمہارا دماغ تو درست ہے؟'' صمد خان نے

چلا کر جواب دیا۔

''تمہارے پاس پستول ہے؟'' یاری خان نے مداخلت کی۔

''ہاں...... ہے لیکن...... مم...... میں تو وہ......''

''تم یہاں ہسپتال میں پستول لے کر کیوں آئے؟'' یاری خان نے اُسے ٹوکتے ہوئے سوال کیا۔ ''جب کہ ہماری کسی کے ساتھ دشمنی بھی نہیں ہے۔''

''آپ بھول رہے ہیں لالہ!'' وہ وقتی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ''ہمارے یہاں دوست اور دشمن کا پتا نہیں چلتا، جیسے یہ گارڈ بالکل غیر متوقع طور پر میرا دشمن بن گیا ہے اور مجھ پر اتنا سنگین الزام لگا رہا ہے کہ دل چاہتا ہے اسے گولی مار دوں۔''

''بکواس مت کرو۔'' یاری خان نے اُسے ڈانٹا اور پھر گارڈ سے معذرت کرتے ہوئے بولا۔ ''دوست! اس کی جگہ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں، دراصل اس کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ہے کبھی کبھار یہ ایسی اُلٹی سیدھی حرکتیں کرتا رہتا ہے۔''

گارڈ بولا۔ ''کوئی بات نہیں صاب! بس آپ ذرا اس سے محتاط رہیں ورنہ کسی دن نقصان اُٹھا بیٹھیں گے، پاگل کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔''

''مجھے...... مجھے پاگل کہتا ہے...... تیری تو میں......'' صمد خان گارڈ کو ایک گندی گالی دیتے ہوئے آگے بڑھا مگر یاری خان نے اُسے پکڑ لیا۔

''یہ کیا بے وقوفی ہے؟'' یاری خان چلایا۔ ''تمہیں یہاں تماشا لگانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، چلو خالہ کے پاس چلتے ہیں۔''

''آپ اور گل جاؤ، مجھے ایک کام ہے۔'' اُس نے ناگوار انداز میں جواب دیا اور ہسپتال کے بیرونی گیٹ کی طرف چل پڑا۔

☆......☆......☆

بالکل غیر متوقع طور پر کمرے میں ایک بلند قامت، وجیہہ و شکیل نوجوان داخل ہوا اور داؤد خان اپنی

سرگذشت سناتے سناتے اچانک خاموش ہوگیا۔ میں جو اُس کی کہانی کے سحر میں کھویا ہوا تھا معاً ٹرانس کی کیفیت سے باہر نکل آیا۔ اب میری نگاہیں نو وارد کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ دیدہ زیب انداز میں مسکرایا، آگے بڑھا اور مجھ سے گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ ''شیر دل خان! میں تم سے ملنے کا بہت متمنی تھا۔ میرا نام عدنان حیدر چودھری ہے اور تعلق گجرات سے ہے۔''

''لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے قطعی اجنبی ہیں۔'' میں نے اُلجھن آمیز انداز میں جواب دیا۔

''بالکل۔'' اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اس سے مجھے انکار نہیں ہے مگر جب تم میری داستانِ حیات سنو گے تو میں تجھے قطعی اجنبی نہیں لگوں گا...... دراصل میرا، داؤد خان کا اور تمہارا دشمن ایک ہی شخص ہے۔''

''میں سمجھا نہیں...... تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' میں مزید اُلجھ گیا۔

''شیر دل! یہ ٹھیک کہتا ہے۔'' داؤد خان نے مداخلت کی۔ ''تم اس کی کہانی سن لو، میرا دل کہتا ہے کہ تم اس کی کہانی سن کر ایک بہت بڑی اُلجھن سے آزاد ہو جاؤ گے۔''

''مگر میں تو کسی ایسی اُلجھن میں گرفتار نہیں ہوں۔'' میں نے بلا سوچے سمجھے جواب دیا۔

وہ بولا۔ کیا تم اُس لڑکی کو بھول گئے ہو جس کی تصویر تم نے اخبار میں لگوائی تھی؟''

میں نے کہا۔ ''اُسے میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ وہ تو مجھے ہر رات خواب میں دکھائی دیتی ہے۔''

''تو پھر عدنان حیدر کی کہانی سن لو تمہاری اُلجھن دُور ہو جائے گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے بادلِ نخواستہ اثبات میں سر ہلایا تو عدنان حیدر ممنون انداز میں میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''عدنان حیدر! شروع ہو جاؤ مگر پلیز اپنی کہانی جلد سمیٹنے کی کوشش کرنا کیونکہ ابھی داؤد خان کی داستانِ حیات بھی باقی ہے۔''

''او کے۔'' اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''میری کہانی کوئی اتنی زیادہ طویل نہیں ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ چند لمحوں کے لیے کھو سا گیا اور پھر اُس نے جو واقعات میرے سامنے دوہرائے وہ میں اختصار کے ساتھ یہاں بیان کیے دیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ عدنان حیدر کی کہانی سن کر قارئین بے حد محظوظ ہوں گے۔ اُس کی کہانی میں دل

دلچسپی کے تمام لوازمات موجود ہیں اور سب سے اہم بات یہ ہے اُس کی کہانی نے میرے خوابوں کا عقدہ کچھ اس طرح کھولا کہ آج برسوں بیت جانے کے باوجود مجھے اُس کی کہانی نہیں بھولتی، قدرت بھی کیا کیا کھیل رچاتی ہے۔ یہ آپ کو عدنان حیدر کی داستان پڑھ کر معلوم ہوگا۔

☆......☆......☆

''انسان احساسات وجذبات کا مجموعہ ہے اور اس کے پاس طاقت ور ترین جذبہ بھوک کا ہے۔ جسے پیٹ کی آگ بھی کہتے ہیں۔'' کلاس روم میں پروفیسر ارشد زمان کی آواز گونج رہی تھی۔ پوری کلاس ہمہ تن گوش تھی۔ طلباء وطالبات کی نگاہیں پروفیسر کے چہرے پر مرتکز تھیں۔ پروفیسر ارشد زمان پوری یونی ورسٹی میں اپنے پُر مغز، مدلل اور دل چسپ لیکچرز کی وجہ سے مشہور تھا۔ وہ کسی بھی موضوع پر بلا تکان بولتا تھا اور اُس کے بولنے کا انداز مسحور کن تھا۔ اسٹوڈنٹس پوری دلجمی اور شوق کے ساتھ اُس کے لیکچر سنا کرتے تھے۔ بلاشک وشبہ وہ پوری یونی ورسٹی میں اسٹوڈنٹس کا پسندیدہ پروفیسر تھا۔ چنانچہ اس پاپولریٹی نے اُسے کسی حد تک مغرور بنا دیا تھا۔

پروفیسر لیکچر جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''دنیا میں ایسے لاتعداد واقعات رونما ہو چکے ہیں جب کسی انسان نے اپنی بقا کے لیے اپنے ہی جیسے انسان کا گوشت کھانے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ بھوک کے سامنے تمام انسانی جذبات کچھ بھی اہمیت نہیں رکھتے۔ ایک بھوکے انسان کے سوچنے سمجھنے کی سب صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں۔ بھوک ہر انسانی جذبے پر غالب آجاتی ہے۔ معروف شاعر ساحر لدھیانوی کہہ گیا ہے کہ بھوک آداب کے سانچے میں نہیں ڈھل سکتی۔ اپنی بھوک مٹانے کے لیے انسان نے......''

''بھوک سے بھی طاقت ور ترین انسانی جذبہ عشق کہلاتا ہے۔'' معاً درمیانی نشستوں سے ایک لڑکے کی آواز آئی اور پروفیسر کی بات ادھوری رہ گئی۔

اوہ......عدنان حیدر صاحب......یہی نام ہے ناں تمہارا۔'' پروفیسر کا انداز سوالیہ مگر لہجے میں طنز تھا۔

''یس سر'' عدنان نے اثبات میں سر ہلایا۔ '' آپ کو اچھا لگتا ہے تو آپ رکھ لیں، میں کوئی اور اچھا سا نام ڈھونڈ لوں گا۔''

کلاس روم میں ہنسی کی آواز گونجنے لگی، جسے پروفیسر نے نظر انداز کر دیا۔ وہ چند لمحے عدنان حیدر کو گھورتا

رہا پھر طنزاً بولا۔ ''میں نے سنا ہے کہ تمہارا باپ ایک ارب پتی ہے اگر یہ بات سچ ہے تو پھر تمہیں بھوک کا تجربہ ہو ہی نہیں سکتا۔ تاہم عشق و محبت کے تجربے کے بارے میں کچھ بھی کہنا مشکل ہے......شاید یہ تجربہ تمہیں ہو چکا ہو یا پھر ابھی ابتدائی مراحل میں ہو، بہر کیف میں اتنا جانتا ہوں کہ خالی پیٹ انسان محبت تو کیا خود کو بھی بھول جاتا ہے......محبت کی اوقات ہی کیا ہے بھوک کے سامنے۔''

''اوقات ہے سر۔'' وہ لفظ اوقات پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''ہاں آپ کی نگاہوں میں نہ ہو تو یہ اور بات ہے۔''

''لگتا ہے برخوردار کو نئی نئی محبت ہوئی ہے۔'' پروفیسر نے برجستہ کہا اور تمام کلاس بے ساختہ ہنسنے لگی۔

''نہیں سر! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ جذبہ تو قسمت والوں کو عطا کیا جاتا ہے۔ وہ جن کے پاس ظرف ہوتا ہے، کم ظرف کبھی محبت کی قدر نہیں کرتے۔'' اُس نے جھٹ سے جواب دیا۔

پروفیسر کے چہرے پر سے ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ عدنان کا جواب اُس کے لیے کسی طمانچے سے کم نہیں تھا۔ لمحہ بھر کے لیے اُس کے چہرے پر ذلت کا احساس اُبھرا مگر دوسرے ہی لمحے معدوم ہو گیا۔ گرمیوں کا موسم ہونے کی وجہ سے اُس نے ہاف آستین کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اُس کی دونوں کہنیوں کی ہڈیاں جوڑ سے قدرے اُبھری ہوئی تھیں۔ غور سے دیکھنے پر صاف معلوم ہوتا تھا جیسے کہنیوں کی ہڈیاں ٹوٹنے کے بعد دوبارہ جوڑی گئی ہوں اور یہ کام کسی اناڑی سرجن نے انجام دیا ہو۔ پروفیسر نے سر جھکا کر کہنیوں کی طرف دیکھا اور پھر سر اُٹھا کر بولا۔ ''ہم بات طاقت ور ترین انسانی جذبے کی کر رہے تھے۔ نہ کہ ظرف اور کم ظرفی کی......اب بات صرف موضوع پر ہو گی۔''

''میں کہاں موضوع سے ہٹا ہوں سر؟ آپ نے خود ہی موضوع کو پسِ پشت ڈال دیا ہے۔'' عدنان نے احتجاج کیا۔

پروفیسر نے سر ہلایا۔ ''اوکے میں تم سے متفق ہوں......چلو اب ثابت کرو کہ محبت بھوک سے کس طرح طاقت ور ہے؟''

وہ بولا۔ ''سر! اسے ثابت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟......یہ تو ثابت شدہ حقیقت ہے۔ کیا آپ نیوز پیپر نہیں پڑھتے، ٹی وی نہیں دیکھتے؟ روزانہ کتنے ہی لوگ محبت میں ناکام ہونے کے بعد خودکشی کر لیتے ہیں جب کہ

کوئی بھوکا کبھی کبھار ہی ایسا قدم اُٹھاتا ہے۔"
"کیا تم محبت میں ناکام ہونے کے بعد خودکشی کرنے کی ہمت کر سکتے ہو؟" پروفیسر نے مذاق کے انداز میں پوچھا۔
"ہو سکتا ہے...... لیکن فی الحال میں کسی سے محبت نہیں کرتا۔"
"اوکے...... یہ بتاؤ کہ محبت ہوتی کیا ہے؟"
"مجھے لگتا ہے سر! کہ مجھ سے بہتر آپ یہ بات جانتے ہوں گے۔" اُس نے سنجیدہ انداز میں جواب دیا اور کلاس روم میں ایک بار پھر ہنسی کی آواز گونج اُٹھی۔
ایک ثانیے کے لیے عدنان نے اپنے کلاس فیلوز کی طرف دیکھا تو کچھ اُسے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ جب کہ بعض کی نظروں میں اُس کے لیے ناپسندیدگی تھی۔ اُس سے چند نشستیں دور بیٹھی ایک لڑکی اُسے قدرے غصیلے انداز میں گھور رہی تھی۔ اُس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں لڑکی سے استفسار کیا تو لڑکی نے اُسے چپ رہنے کا اشارہ کر دیا۔ مگر اس دوران پروفیسر اُسے مخاطب کر چکا تھا۔
"کیوں بھئی! میں بھلا تم سے بہتر کس طرح جان سکتا ہوں...... کیا میں نے عشق کی دکان کھول رکھی ہے؟"
"سر! میری چھٹی حس کہتی ہے کہ آپ نے نوجوانی میں ضرور کسی نہ کسی سے محبت کی ہو گی...... ورنہ آپ محبت سے نفرت کیوں کرتے؟"
پروفیسر کی رنگت ایک مرتبہ پھر سے پھیکی پڑ گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے اُس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہو، خیالات کی ایک یلغار تھی جو اُسے گھیر چکی تھی اور ماضی کی ایک فلم سی اُس کے دماغ میں چل پڑی تھی۔ وہ اب اُس وقت کو کوس رہا تھا جب اُس نے عدنان حیدر جیسے منہ پھٹ لڑکے سے بحث چھیڑی تھی۔ عدنان انجانے میں اُسے چڑ کے پرچرکا لگائے جا رہا تھا لیکن وہ بے بس تھا۔ عدنان کو کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ پروفیسر کو عشق و محبت سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ اُس کی نگاہوں میں محبت ایک بے کار ترین مشغلہ تھا جو فارغ لوگوں کی ہی راس آتا تھا۔
"عدنان حیدر!" وہ دوبارہ موضوع پر آتے ہوئے بولا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ بھوکا انسان خدا کو بھی بھول جاتا ہے۔ محبت کی تو کوئی حیثیت نہیں ہے بھوک کے سامنے۔"

"نہیں سر!" اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ خدا کو ہمیشہ پیٹ بھرے ہی بھولتے ہیں، بھوکے تو پل پل اُسے یاد کرتے ہیں۔"

وقتی طور پر اُس نے پروفیسر کو لاجواب کر دیا تھا۔ اُس کے کلاس فیلوز اب اُسے ستائشی انداز میں دیکھ رہے تھے۔ مگر محبت اور بھوک کی اس بحث میں پروفیسر کو محبت کی جیت کسی صورت میں بھی منظور نہیں تھی۔ وہ بولا۔ "بھوک نے دنیا میں کئی بار انقلاب برپا کیے ہیں لیکن محبت نے آج تک کچھ بھی نہیں کیا سوائے رونے دھونے اور خودکشیاں کرنے کے۔ تم ایسی ایک بھی مثال پیش نہیں کر سکتے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ محبت بھوک کے مقابلے میں طاقت ور ہوتی ہے۔"

"میں ثابت کر سکتا ہوں۔" وہ پُرجوش ہو گیا۔ "آج سے چودہ صدیاں قبل ایک انقلاب برپا ہوا تھا۔ جس نے اُس وقت کی دنیا کا نقشہ بدل ڈالا تھا اور ہم سب جانتے ہیں کہ وہ انقلاب بھوک کا مرہونِ منت نہیں تھا۔ اگر غیر جانب داری سے دیکھا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُس عظیم انقلاب کو برپا کرنے میں محبت نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ رسول ﷺ کی خدا سے محبت اور آپ ﷺ کے پیروکاروں کی آپ ﷺ سے محبت ہی اُس عظیم انقلاب کی سب سے بڑی وجہ تھی لیکن شاید آپ بھی اُن لبرل مائنڈڈ لوگوں کی طرح یہ بات تسلیم نہیں کریں گے جو اس عظیم انقلاب کا سبب عربوں کی بھوک اور ہوسِ ملک گیری بتاتے ہیں۔"

"یہ لبرل لوگ کچھ غلط تو نہیں کہتے میاں! اب تمہاری طرح ہر کوئی حقیقت سے انکار تو نہیں کر سکتا۔" پروفیسر نے جواب دیا۔

"سر! میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ بھوک جان لیتی ہے جب کہ محبت جان دیتی ہے اور یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ جان لینا آسان ہوتا ہے مگر جان دینا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ جان وہی لوگ دیتے ہیں جن کے دل میں عشق کی شمع روشن ہوتی ہے اور جان لینے والے کبھی بھوک تو کبھی نفرتوں کے مارے لوگ ہوتے ہیں۔ محبت تاج محل تعمیر کرتی ہے تو نفرت بابری مسجد شہید کرتی ہے۔ محبت عظیم ہوتی ہے سر عظیم کبھی نہ مٹنے والی جب کہ بھوک پیٹ بھرتے ہی مٹ جاتی ہے۔ سیر ہونے کے بعد بھوک کا احساس تک باقی نہیں رہتا۔ بھوک کی عشق کے سامنے کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔" اُس نے جذباتی لہجے میں جواب دیا تو پوری کلاس نے باقاعدہ

تالیاں بجا کر اُسے داد دی۔

پروفیسر ارشد زمان ایک بار پھر لاجواب ہو کر رہ گیا۔ مگر وہ شکست ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ بیس برس قبل ہی وہ محبت پر لعنت بھیج چکا تھا۔ چنانچہ تالیوں کا شور تھمتے ہی پروفیسر نے کہا۔ ''محبت بھی تو بھوک ہی کی ایک قسم ہے۔ بدن کے حصول کے بعد اکثر محبتیں ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہیں۔''

''محبت اگر بدن کے حصول تک محدود ہوتی تو تاج محل کبھی تعمیر نہ ہوا ہوتا سر اور ایک ماں اپنے بچے سے محبت بدن کے حصول کے لیے تو نہیں کرتی......مان لیں سر! کہ محبت سے بڑا کوئی جذبہ نہیں ہے۔ بھوک آپے سے باہر ہو کر خونی انقلاب لاتی ہے جب کہ محبت دلوں کو تسخیر کرتی ہے اور دائمی انقلاب کا باعث بنتی ہے۔ کائنات کی ساری رنگینیاں محبت ہی کے دم سے ہیں، بقول شاعر۔

رونق بزم جہاں ہے تو اسی کے دم سے
اور کچھ بھی نہیں دنیا میں محبت کے سوا

پروفیسر بولا۔ ''تم کچھ بھی کہو مگر میں تم سے متفق نہیں ہوں......میں اب بھی یہی کہوں گا کہ بھوک طاقت ور ترین احساس ہے۔ محبت میں ہارا ہوا انسان زندہ رہ سکتا ہے لیکن بھوک کا مارا ہوا......ناممکن......کبھی بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔''

اسی دوران پیریڈ اختتام پذیر ہو گیا اور یہ بحث ادھوری رہ گئی۔ پروفیسر نے چبھتی ہوئی نگاہوں سے عدنان کی طرف دیکھا اور پھر کلاس روم سے باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

عاتکہ نے گھور کر اُسے دیکھا اور پھر شکایتی انداز میں بولی۔ ''آج تم نے اچھا نہیں کیا۔ میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا لیکن تم نے پھر بھی پاپا کی انسلٹ کر دی۔ کیوں کرتے ہو تم ایسا، آخر پاپا سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟''

''میں نے کچھ غلط نہیں کیا عاتکہ یہ تو صرف ایک بحث تھی جو بغیر کسی نتیجے کے ختم ہو گئی۔ ورنہ تم جانتی ہو کہ میں تمہارے پاپا کی بہت عزت کرتا ہوں۔'' اُس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''میں جانتی ہوں عدی......لیکن تمہیں شاید نہیں معلوم کہ پاپا کو محبت کے نام سے سخت چڑ ہے۔ بلکہ اُنھیں

تو محبت کا نام سننا بھی گوارا نہیں ہے۔"

اُس وقت وہ دونوں ایک معروف ریسٹورنٹ میں بیٹھے کولڈ ڈرنکس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اُن کی دوستی کو تقریباً ایک سال کا عرصہ ہونے والا تھا مگر بات ابھی تک صرف دوستی تک ہی محدود تھی۔ پسندیدگی کے مراحل تک نہیں پہنچی تھی۔ یا اگر پہنچ بھی چکی تھی تو اس کا اظہار ابھی تک کسی جانب سے بھی نہیں ہوا تھا۔ البتہ اُن کی دوستی واقعی بے مثال تھی۔ دونوں ایک دوسرے کا دل سے احترام کرتے تھے۔ جس کا اظہار وہ ایک دوسرے سے گاہے گاہے کرتے رہتے تھے۔ عاتکہ زمان پروفیسر ارشد زمان کی اکلوتی بیٹی تھی جب کہ عدنان حیدر کا تعلق گجرات کی ایک جاگیردار فیملی سے تھا۔ اُس کا باپ فرمان حیدر چودھری ایک وسیع و عریض جاگیر کا مالک تھا اور روایتی جاگیرداروں کی طرح ملکی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا رہتا تھا۔ گو کہ اُس نے خود کبھی بھی عملی طور پر سیاست میں حصہ نہیں لیا تھا۔ تاہم اپنے چھوٹے بھائی قربان حیدر چودھری کو وہ کئی بار صوبائی اسمبلی کی نشست پر بطور اُمیدوار کھڑا کر چکا تھا۔ مگر جیت ایک بار بھی قربان حیدر کے حصے میں نہیں آئی تھی۔

عاتکہ کی بات سن کر عدنان کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "یہ پروفیسر بھی ناں! بس عجیب چیز ہیں۔ کبھی انہیں چودھریوں سے کے نام سے چڑ ہو جاتی ہے تو کبھی محبت کے نام سے۔ پتا نہیں ان کی پرابلم کیا ہے؟"

"تم نے پاپا کو چیز کہا۔" عاتکہ نے آنکھیں نکالیں۔ "وہ تمہیں چیز نظر آتے ہیں........ کچھ شرم و حیا ہے کہ نہیں؟"

"شکر کرو صرف چیز کہا ہے۔ عجیب نہیں کہا۔" اُس نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔

"جس دن پاپا کو پتا چل گیا ناں کہ تم بھی چودھری ہی ہو تو اُس دن تمہیں معلوم ہو گا کہ وہ کیا چیز ہیں؟"

"نہیں بھئی! یہ بات اُنہیں پتا نہیں چلنا چاہیے۔ میں آئندہ اُنہیں چیز نہیں کہوں گا۔ آئی ایم ریئلی سوری۔" اُس نے باقاعدہ کانوں کو چھوتے ہوئے پراسس کیا تو عاتکہ کھل اُٹھی۔

"عدی!" وہ کولڈ ڈرنک کا سپ لیتے ہوئے ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ "یہ یونی ورسٹی میں ہم دونوں کا فائنل ایئر ہے ناں؟"

"یس۔" اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "کوئی پریشانی ہے کیا؟"

''مطلب ہم دونوں چند ماہ کے بعد ہمیشہ کے لیے جُدا ہو جائیں گے؟'' اُس نے افسردہ ہو کر پوچھا۔

''عاتکہ! ہم یہاں انجوائے کرنے کے لیے آئے ہیں۔ کامیاب انسان وہی ہوتا ہے جو ہر قسم کے حالات میں خوش رہنا سیکھ لیتا ہے۔ جو آج سے لطف اندوز ہونا جانتا ہے اُسے آنے والے کل کی فکر کبھی پریشان نہیں کرتی...... یہ تمہیں بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا ہے؟''

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے عدی۔'' وہ مصر ہوئی۔ ''تم بات کو ٹالنے کی کوشش کر رہے ہو۔''

''تو کیا کہوں تم بتاؤ ناں؟'' اُس نے اُلٹا سوال کر دیا۔

''محبت کی فیور میں اس قدر بڑھ چڑھ کر بولنے والا کیا اتنا انجان ہو سکتا ہے؟''

''اوہ...... آئی سی...... مطلب تم سنجیدہ ہو۔'' وہ حیران رہ گیا۔

''ہاں......'' عاتکہ نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''میں...... میں تم سے......''

''پلیز عاتکہ!'' اُس نے جھنجلا کر قطع کلامی کی۔ ''میں اس موضوع پر کوئی بات نہیں سننا چاہتا۔''

''لیکن کیوں؟'' وہ مستفسر ہوئی۔

''بس ہم صرف اچھے دوست ہیں اور ہمیشہ دوست رہیں گے۔''

''مگر جب تم چند ماہ کے بعد ہمیشہ کے لیے چلے جاؤ گے تو کیا یہ دوستی قائم رہ سکے گی؟''

''میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ یہیں کراچی ہی میں رہوں گا۔''

''یہ بات تو تم مجھے خوش کرنے کے لیے کہہ رہے ہو ورنہ میں جانتی ہوں کہ تمہارے دل میں میرے لیے......''

''ڈونٹ بی سلی عاتکہ۔'' اُس نے تیز لہجے میں بات کاٹی۔ ''میں تمہاری بہت قدر کرتا ہوں۔ میرے دل میں تمہارا ایک خاص مقام ہے اور وہ خاص مقام شاید میں کسی کو بھی نہ دے سکوں لیکن......'' وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

''لیکن کیا؟'' وہ مضطرب ہو گئی۔

''ابھی میں نے ازدواجی زندگی کے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچا...... اور پھر یہ ضروری بھی تو نہیں ہے کہ

انسان جس سے پیار کرے شادی بھی اُسی سے کرلے۔ کیا محبت کرنے کے لیے شادی کرنا لازمی شرط ہے؟''

اُس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

عاتکہ کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ لمحہ بھر کے لیے اُس کا چہرہ متغیر ہو گیا مگر اُسے چہرے کے تاثرات چھپانے میں ملکہ حاصل تھا۔ وہ ایک دم کھلکھلا کر بولی۔ ''ارے گھونچو! میں تو مذاق کر رہی تھی، تم تو سیریس ہی ہو گئے۔ میں جانتی ہوں کہ پاپا مجھے زہر دینا پسند کرلیں گے مگر کسی چودھری کے ساتھ مجھے دلہن بنا کر رخصت کرنے کے لیے راضی نہیں ہوں گے۔''

''ہاں یہ بات تو ہے۔'' وہ قدرے پھیکا پڑ گیا۔ ''تمہارے پاپا کی چودھریوں سے نفرت سمجھ میں نہیں آتی۔''

''تمہیں کیا دُکھ ہے اس بات کا؟'' اُس نے انجانی سی خوشی محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں تو۔'' وہ بے تاثر آواز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ تمہارے پاپا کا ذاتی معاملہ ہے۔ مجھے بھلا اس میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے اور دکھ ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا...... اُن کی مرضی جس سے نفرت کریں، جس سے پیار کریں میرا کیا لینا دینا؟''

اُس کی وقتی خوشی کافور بن کر اُڑ گئی۔ دل مرجھا سا گیا تھا مگر لبوں پر بدستور ہنسی رقصاں تھی۔ عدنان حیدر بہت گہرا آدمی تھا۔ کسی اُلجھی ہوئی پہیلی کی طرح سمجھ میں نہ آنے والا۔ ایسے ہی وقت اُسے ایک شعر شدت کے ساتھ یاد آنے لگا مگر وہ اُسے زبان پر لانے کی ہمت نہ کرسکی بس دل ہی دل میں دوہرا کر رہ گئی۔

ہاتھ اُلجھے ہوئے ریشم میں پھنسا بیٹھے ہیں
اب بتا کون سے دھاگے کو جدا کس سے کریں

''اے کہاں کھو گئی ہو؟'' عدنان نے اُس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

''پاپا کے متعلق سوچ رہی تھی۔'' اُس نے سفید جھوٹ بولا مگر چہرے کے تاثرات سے اس جھوٹ کا بھرم قائم رکھا۔

''پاپا سے کبھی پوچھو ناں! کہ وہ چودھریوں سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟''

عاتکہ نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا اور سوچا کیا یہ وہی شخص ہے جو لمحے قبل اس بات کو پاپا کا ذاتی معاملہ

کہہ رہا تھا۔ تاہم اپنی اس سوچ کو وہ لفظوں کا جامہ پہنانے سے قاصر رہی اور ٹالنے والے انداز میں بولی۔ ''کئی بار کوشش کر چکی ہوں مگر پاپا ہمیشہ میرے اس سوال پر چپ سادھ لیتے ہیں، کچھ بتاتے ہی نہیں۔''

''اور محبت کے نام سے کیوں چڑتے ہیں؟'' عدنان نے ہنس کر پوچھا۔

وہ بولی۔ ''عدی! تم پاگل تو نہیں ہو...... کوئی بیٹی بھلا باپ سے اس قسم کا سوال پوچھ سکتی ہے؟''

''کیوں...... کیا ایسا سوال پوچھنا جرم ہے، یا پھر تم اُن سے ڈرتی ہو؟''

''نہیں۔'' اُس نے منفی انداز میں سر ہلایا۔ ''بس میں اُن سے پوچھنا ہی نہیں چاہتی۔ کوئی بھی مشرقی لڑکی اپنے باپ سے ایسا سوال پوچھنے کی جسارت نہیں کر سکتی۔''

''اوکے تو پھر میں ہی پوچھ لوں گا، بس موقعہ ملنے کی دیر ہے۔''

''وہ تمہیں کچھ بھی نہیں بتائیں گے بلکہ اُلٹا تمہاری بے عزتی کر دیں گے۔''

''نہ بتائیں مگر میں اُن سے پوچھوں گا ضرور، بے عزتی ہوتی ہے تو ہونے دو۔'' اُس نے اٹل انداز میں جواب دیا۔

''اوکے یہ حسرت بھی پوری کر لینا، مگر یہ یاد رکھنا کہ آئندہ تم نے پاپا سے کسی بھی موضوع پر بحث نہیں کرنی ورنہ ہماری دوستی میں دراڑ پڑ جائے گی۔'' اُس نے اُٹھتے ہوئے جواب دیا۔

''مجھے دھمکی دے رہی ہو؟'' عدنان نے جیب سے والٹ نکالتے ہوئے پوچھا۔

''حقیقت بتا رہی ہوں۔ تم بس پاپا سے بحث مت کیا کرو مجھے اچھا نہیں لگتا۔''

''میری جیت بُری لگتی ہے؟'' اُس نے ناراض انداز میں سوال کیا۔

''نہیں پاپا کو ہارتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔''

عدنان نے والٹ سے ایک نوٹ نکال کر بل چکایا اور پلٹ کر بولا۔ ''میں اگر بحث میں تمہارے پاپا سے ہار جایا کروں تو کیا تمہیں اچھا لگے گا؟''

''پتا نہیں۔'' وہ کش مکش کا شکار ہو گئی۔ ''اس بارے میں شاید میں کچھ بھی نہ کہہ سکوں۔''

اس دوران وہ ریسٹورنٹ سے نکل کر گاڑی کے قریب پہنچ چکے تھے۔ عدنان نے کہا۔ ''جب دو شخص آپس

میں کسی موضوع پر بحث کرتے ہیں تو اُن میں سے کسی ایک کو ہارنا پڑتا ہے۔تم سچ بتاؤ تمہیں کس کی جیت اچھی لگتی ہے میری یا پھر اپنے پاپا کی؟''

''کسی کی بھی نہیں۔''

''یہ تو کوئی جواب نہ ہوا۔'' وہ مصر ہوا۔

''عدی! سانڈوں کی لڑائی میں پودے کچلے جاتے ہیں۔تیری اور پاپا کی بحث سے تکلیف مجھے پہنچتی ہے۔میں ایک کی ہار اور دوسرے کی جیت کی خوشی ایک ہی وقت میں کیسے منا سکتی ہوں؟ میرے سینے میں ایک ہی دل ہے جو تمہاری اور پاپا کی یکساں قدر کرتا ہے۔پلیز یا تو پاپا سے بحث کرنا چھوڑ دو یا پھر مجھ سے اس قسم کے سوال مت پوچھا کرو۔'' اُس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''چلو بیٹھو۔'' وہ گاڑی کی کھڑکی کھولتے ہوئے بولا۔''آئندہ میں خیال رکھوں گا۔''

وہ چپ چاپ گاڑی میں بیٹھ گئی۔عدنان نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے ریورس گیئر لگایا، گاڑی کا رخ تبدیل کیا اور پھر دوبارہ گیئر لگاتے ہوئے گاڑی آگے بڑھادی۔



پروفیسر ارشد زمان سخت جھنجلایا ہوا تھا۔اُسے عدنان حیدر پر بے حد غصہ آرہا تھا۔زندگی میں پہلی بار کسی اسٹوڈنٹ نے اُسے یوں چیلنج کیا تھا۔اس سے قبل کبھی کسی نے کلاس کے دوران اُس سے بحث نہیں کی تھی۔پروفیسر کو اپنی فصاحت و بلاغت پر بڑا مان تھا مگر آج یہ مان ٹوٹ گیا تھا اور یہ مان توڑنے والا کوئی دانش ور نہیں بلکہ ایک عام سا اسٹوڈنٹ تھا۔وہ اگر کوئی پروفیسر، دانش ور یا تجزیہ نگار ہوتا تو شاید پروفیسر زمان کو اس قدر دُکھ نہ ہوا ہوتا۔وہ خود کو لفظوں کا کھلاڑی سمجھتا تھا مگر ایک اناڑی نظر آنے والے نوجوان نے اُسے کلین بولڈ کردیا تھا۔اپنے پاس معلومات کا خزانہ رکھنے کے باوجود وہ اپنے ایک شاگرد سے بُری طرح ہار گیا تھا۔ذلت کا احساس کسی زہریلے بچھو کی طرح اُسے ڈنک مار رہا تھا۔اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ابھی جاکر عدنان حیدر کو شوٹ کردے مگر کسی دشمن سے بدلہ چکانے کے لیے جو ہمت درکار ہوتی ہے وہ اُس کے پاس نہیں تھی۔وہ فطرتاً انتہائی بزدل انسان تھا۔چھوٹی چھوٹی باتوں سے ڈر جانے والا، منٹوں میں مدِمقابل سے دب کر ہتھیار پھینک دینے

والا۔ اپنی اس بزدلی کے ہاتھوں اُس نے زندگی میں کئی بار نا قابلِ تلافی نقصانات اُٹھائے تھے لیکن ان نقصانات کا الزام وہ ہمیشہ مخالف فریق پر لگا دیتا تھا۔ بچپن سے لے کر آج تک اُس نے کبھی اپنی غلطی تسلیم نہیں کی تھی۔ وہ ہمیشہ خود کو ہی حق بجانب سمجھا کرتا تھا۔ اسی ہٹ دھرمی کے سبب وہ کئی رشتوں اور مخلص دوستوں سے ہاتھ دھو چکا تھا اور پھر ایک دن ایسا ہوا کہ اپنی ہر بات کو حرفِ آخر سمجھنے والا پروفیسر ارشد زمان بھری دنیا میں تنہا رہ گیا، سوائے اپنی اکلوتی بیٹی عاتکہ زمان کے، اُس کے پاس کوئی رشتا رہا اور نہ ہی دوست۔ بس اب عاتکہ ہی اُس کی زندگی کا مقصد و محور تھی۔ وہ بچپن ہی سے پروفیسر کا ہر حکم بلا چوں چراں مانتی چلی آ رہی تھی۔ پروفیسر اُس کے لیے آئیڈیل باپ تھا۔ اُس نے کبھی بھی کسی معاملے میں باپ سے بحث نہیں کی تھی۔

عاتکہ کی ماں عائشہ بیگم تو پروفیسر جیسے شخص کے ساتھ بمشکل دس برس ہی گزار سکی تھی۔ اور یہ دس برس بھی اُس بچاری نے روتے اور کڑھتے ہوئے گزارے تھے۔ پروفیسر نے ازدواجی زندگی کے دوران اُسے سکھ کم اور دکھ زیادہ دیے تھے۔ پروفیسر کے مقابلے میں وہ کم پڑھی لکھی تھی اس لیے ہمیشہ بحث میں ہار جایا کرتی تھی۔ پروفیسر اپنی ہر غلطی اُس کے سر تھوپ دیا کرتا تھا اور جب وہ اپنے دفاع میں کچھ بولنے کی کوشش کرتی تو پروفیسر اپنی دانش ورانہ گفت گو سے اُسے چپ کرا دیا کرتا تھا۔ وہ پروفیسر کے منطقی دلائل کے جوابات ہی نہیں دے پاتی تھی۔

عاتکہ اُس وقت تین برس کی تھی جب عائشہ بیگم دماغی نس پھٹنے کی وجہ سے اللہ کو پیاری ہو گئی۔ اُس کے مرنے کے بعد پروفیسر نے اپنی تمام تر توجہ ننھی عاتکہ پر مرکوز کر دی اُس نے بیٹی کی ہر ضرورت کا خیال رکھا اور اُسے اس قدر توجہ اور پیار دیا کہ وہ ماں کی کمی محسوس ہی نہ کر سکی۔ پروفیسر ہمیشہ بیٹی کی ہر خواہش کو مقدم سمجھتا تھا۔ حتیٰ کہ بڑی ہو کر جب عاتکہ نے عدنان حیدر سے دوستی کی تو تب بھی پروفیسر نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ عدنان ایک اچھا لڑکا تھا اور پروفیسر اُسے پسند کرتا تھا لیکن آج عدنان کے ساتھ ہونے والی بحث کے بعد پروفیسر کے خیالات تبدیل ہو چکے تھے کہ اُسے بیٹی کی خوشی سے زیادہ اپنی انا عزیز تھی۔ اب عدنان اُسے دنیا کا بدترین لڑکا لگ رہا تھا اور ایسے بدترین لڑکے سے اپنی بیٹی کی دوستی اُسے سخت تکلیف پہنچا رہی تھی۔

پروفیسر ایک اچھے خاصے شان دار گھر میں رہتا تھا۔ اور یہ گھر اُس نے اپنی حلال کی کمائی سے تعمیر کیا تھا۔ گھر

کے کام کاج کے لیے اُس نے ایک ادھیڑ عمر کی نوکرانی رکھی ہوئی تھی۔ فاطمہ نامی اُس عورت کو پروفیسر کے ہاں کام کرتے ہوئے طویل عرصہ ہو چکا تھا اور اب اُس کی حیثیت گھر کے ایک فرد کی سی ہو گئی تھی۔ فاطمہ کا چونکہ آگے پیچھے کوئی نہیں تھا اس لیے وہ بھی پروفیسر کے گھر کو اپنا ہی گھر سمجھتی تھی۔ مگر اتنی طویل رفاقت کے باوجود پروفیسر نے ہمیشہ اُسے ایک نوکرانی ہی سمجھا تھا۔ البتہ عاتکہ کی فاطمہ سے خوب بنتی تھی۔ عاتکہ اُسے بچپن ہی سے بُوا کہتی چلی آرہی تھی اور فاطمہ نے بھی کبھی اُسے یہ احساس دلانے کی کوشش نہیں کی تھی کہ وہ محض ایک نوکرانی ہے۔ وہ عاتکہ کو سگی بیٹی کی طرح چاہتی تھی اور اُس کے پیار میں کسی قسم کی بناوٹ یا تصنع نہیں تھا۔ عاتکہ کے بچپن ہی سے وہ اُس کا بے حد خیال رکھتی چلی آرہی تھی۔ وہی اُسے نہلاتی دھلاتی تھی اور کسی ماں کی طرح اُس کی ہر ضرورت کا خیال رکھا کرتی تھی۔

پروفیسر نے کبھی اُن دونوں کے اس رشتے پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ عاتکہ اُس کی موجودگی میں بھی فاطمہ کو بُوا کہتی تھی۔ مگر پروفیسر کے لیے فاطمہ ہمیشہ ایک غیر عورت ہی رہی تھی۔ پروفیسر اب بھی اُسے باقاعدگی کے ساتھ تنخواہ دیتا تھا۔ گو کہ اب تنخواہ لینے کو فاطمہ کا دل نہیں چاہتا تھا۔ لیکن وہ پروفیسر کو اچھی طرح جانتی تھی اس لیے انکار کر کے وہ یہ محفوظ ٹھکانا نہیں کھونا چاہتی تھی۔ بہت عرصہ پہلے ایک بار اُس نے تنخواہ لینے سے انکار کیا تھا تو تب پروفیسر نے اُسے دوٹوک الفاظ میں کہا تھا۔

"فاطمہ! میں کسی کا احسان لینے کا قائل نہیں ہوں۔ میں نے تمہیں گھر میں کام کاج کے لیے رکھا ہوا ہے اگر تم تنخواہ نہیں لوگی تو پھر میں تمہیں اس گھر میں نہیں رکھ سکوں گا۔ میں کوئی اور کام والی ڈھونڈ لوں گا۔"

فاطمہ کو پروفیسر کے کہے گئے الفاظ آج بھی یاد تھے۔ اُس وقت تو اُسے پروفیسر پر بے حد غصہ آیا تھا اور شاید وہ وہاں سے چلی بھی جاتی مگر عاتکہ کی محبت نے اُسے یہ انتہائی قدم اُٹھانے سے روک دیا تھا۔ وہ بن ماں کی ایک معصوم بچی کو یوں چھوڑ کر جانے کی ہمت نہ کر سکی۔ ان گزرے برسوں کے دوران وہ پروفیسر کو اچھی طرح جان گئی تھی کہ وہ بحث کرنے والے ہر شخص کو سخت ناپسند کرتا ہے، بس اپنی کہتا ہے دوسرے کی سننا اُسے ناگوار گزرتا ہے۔

اُس دن پروفیسر جب یونی ورسٹی سے گھر پہنچا تو لنچ کا ٹائم نکلنے والا تھا۔ لیکن اُس کی بھوک اُڑ چکی

تھی۔ ڈائننگ روم کا رخ کرنے کی بجائے وہ اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ اُس کا دماغ مسلسل عدنان حیدر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اُس کی سماعتوں میں اب بھی عدنان حیدر کے کہے گئے الفاظ گونج رہے تھے۔ ''محبت عظیم ہوتی ہے سرعظیم...... کبھی نہ مٹنے والی جب کہ بھوک پیٹ بھرتے ہی مٹ جاتی ہے...... سیر ہونے کے بعد بھوک کا احساس تک باقی نہیں رہتا...... محبت تاج محل تعمیر کرتی ہے۔''

''ہونہہ محبت۔'' پروفیسر منہ بناتے ہوئے اُٹھ بیٹھا۔ ''تاج محل محبت نے نہیں بلکہ ایک شہنشاہ کی دولت نے تعمیر کیا تھا، اُن مزدوروں اور راج مستریوں نے تعمیر کیا تھا جن کے نام تک تاریخ یاد نہ رکھ سکی۔''

پروفیسر یوں بُرے بُرے منہ بنا رہا تھا جیسے اُس نے کونین کی گولی چبا ڈالی ہو، پھر یونہی کسی خیال کے تحت اُس نے عاتکہ کو پکارنا شروع کر دیا۔ چند لمحوں کے بعد عاتکہ کی بجائے فاطمہ اندر داخل ہوئی اور سلام کرنے کے بعد بولی۔ ''صاحب! عاتکہ بی بی تو ابھی تک یونیورسٹی سے واپس نہیں لوٹی۔''

''کیوں؟'' پروفیسر نے چلا کر پوچھا۔ ''کیا اُس نے تمہیں لیٹ آنے کے متعلق بتایا تھا؟''

''نہیں صاحب! اُس نے ایسا کچھ نہیں بتایا تھا۔''

''میں جانتا ہوں وہ اُسی بدتمیز کے ساتھ گھوم رہی ہوگی۔ بس بہت ہو گیا آج کے بعد اُس کے ساتھ عاتکہ کا ملنا جلنا بند۔''

''کیوں صاحب! کیا عدنان صاحب نے کچھ......''

'' صاحب مت کہو اُسے۔'' پروفیسر نے چلا کر قطع کلامی کی۔ '' ایک نمبر کا بدتمیز اور بے شرم ہے وہ...... اُسے بڑوں سے بات کرنے کی تمیز تک نہیں ہے۔''

''صاحب! کھانا لگا دوں؟'' فاطمہ نے موضوع بدل کر پوچھا۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

''کیا مجھ سے کوئی خطا ہو گئی ہے صاحب؟'' فاطمہ نے سہم کر پوچھا۔

''بس تم جاؤ۔'' پروفیسر چلایا اور فاطمہ حیرانی اور پریشانی کی ملی جلی کیفیت میں کمرے سے باہر نکل گئی۔ پروفیسر دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔ اُس کا دماغ مسلسل عدنان حیدر کے متعلق سوچ رہا تھا۔ عدنان کے الفاظ

کسی ہتھوڑے کے مانند اُس کی سماعتوں پر برس رہے تھے۔ بظاہر جسمانی طور پر وہ مکمل صحت مند انسان تھا۔ بس کبھی کبھی اُسے ہائی بلڈ پریشر کی شکایت ہو جاتی تھی۔ اُس روز عدنان حیدر سے بحث کرنے کی وجہ سے اُس کا بی پی قدرے بلند تھا رہی سہی کسر گھر میں بیٹی کی عدم موجودگی نے پوری کر دی تھی۔ وہ جوں جوں عدنان حیدر کے بارے میں سوچتا گیا، اُس کا غصہ بھی بڑھتا گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اُس پر وہی کیفیت طاری ہو گئی جو بلند فشارِ خون کے مریضوں کی خاصیت ہوتی ہے۔ پہلے اُسے کنپٹیوں پر دباؤ محسوس ہوا اور دل کی دھڑکن رفتار پکڑنے لگی۔ اس کے بعد اُس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اُس نے چلا کر فاطمہ کو پانی لانے کا حکم دیا اور پھر ٹیبل کی دراز کھول کر بی پی کنٹرول کرنے والی ٹیبلٹس تلاش کرنے لگا۔ دراز میں ٹیبلٹس موجود نہیں تھیں۔ اُس کا غصہ شدید تر ہو گیا۔ اب اُس کا پورا بدن کانپ رہا تھا اور وہ بلند فشارِ خون کی وجہ سے پسینہ پسینہ ہونے لگا۔

''کہاں مر گئی ہو فاطمہ؟'' وہ چلایا اور پھر لرزتا کانپتا بستر پر گر گیا۔ اب اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ بے ہوش ہونے سے قبل اُس نے کسی کے دوڑتے ہوئے قدموں کی چاپ سنی تھی۔ اس کے بعد اُس کا ذہن اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔



عاتکہ کو اس گھر کے دروازے پر ڈراپ کرتے ہوئے عدنان آگے بڑھ گیا جبکہ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔

''کہاں مر گئی ہو فاطمہ!..................؟'' گھر میں گھستے ہی اس کے کانوں میں باپ کی اذیت بھری آواز گونجی۔ اور وہ بھاگتے ہوئے باپ کی خواب گاہ کی طرف بڑھی...... خواب گاہ میں داخل ہوتے ہی اس نے دیکھا کہ پروفیسر بستر پر پڑا تڑپ رہا ہے۔

''پاپا......'' وہ چیختی ہوئی آگے بڑھی۔ اسی اثناء میں پروفیسر نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے تھے۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ یقیناً فاطمہ گھر میں موجود نہیں تھی ورنہ پروفیسر کے پکارنے کی آواز ضرور سن لیتی۔

باپ کو بے ہوش دیکھ کر اس کے ہاتھ پاؤں پھول چکے تھے اور دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا، اچانک اس کے دماغ میں عدنان کا نام گونجا اور وہ جلدی سے سیل فون نکال کر اسے کال کرنے لگی۔

”جی محترمہ!“ اس نے کال اٹینڈ کی۔ ”ابھی تو میں نے تجھے......“

”عدی!......جلدی آؤ، پاپا بے ہوش ہو گئے ہیں؟“ وہ قطع کلامی کرتے ہوئے چیخی۔

”کیوں......؟......کیسے؟“ وہ حیران رہ گیا تھا۔

”پتا نہیں......شاید، ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔“

”پریشان نہ ہونا، میں بس دو منٹ میں پہنچتا ہوں۔“ اُس نے یوٹرن لے کر گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی۔

عاتکہ نے باپ کو سیدھا لٹایا اور بھاگتے ہوئے باہر نکلی۔ گھر کا دروازہ کھول کر وہ وہیں بے چینی سے عدنان کا انتظار کرنے لگی۔ عدنان نے وہاں پہنچنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ پروفیسر کو گاڑی کی پچھلی نشست پر منتقل کر کے ہاسپٹل کا رخ کر رہے تھے۔

رش ڈرائیو کرتے ہوئے عدنان نے آدھ گھنٹے میں ہاسپٹل کی پارکنگ میں گاڑی روک دی تھی۔ پرائیویٹ ہاسپٹل کے مستعد عملے نے پروفیسر کو سٹریچر پر منتقل کر کے ایمر جنسی وارڈ کا رخ کیا۔ وہ دونوں بھی ان کے ساتھ بھاگتے ہوئے چلتے رہے ایمر جنسی وارڈ میں موجود ڈاکٹر نے پروفیسر کی حالت دیکھتے ہی اسے آئی سی یو میں پہنچانے کا حکم دیا۔ انھیں آئی سی یو میں داخل نہیں ہونے دیا گیا تھا۔ وہ دونوں پریشانی کے عالم میں دروازے کے سامنے ٹہلنے لگے۔

”عاتکہ! بیٹھ جاؤ......اس طرح پریشان ہونے سے مسائل حل نہیں ہوا کرتے؟“ عدنان نے گفتگو میں پہل کی۔

”عدی!......اگر پاپا کو کچھ ہو گیا تو میں زندہ نہیں رہ پاؤں گی؟“

”پاگل مت بنو......“ عدی نے اسے ڈانٹا۔ ”کچھ نہیں ہو گا سر کو......“

”عدی مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”اللہ پاک آسانی فرمائے گا......“ عدنان نے اسے تسلی دی۔

جب تک آئی سی یو کا دروازہ کھول کر ڈاکٹر باہر نہ نکلا وہ اسی طرح کاریڈور میں ٹہلتے رہے۔ جیسے ہی ڈاکٹر باہر آیا وہ دونوں اس کی طرف لپکے۔

”خدا کا شکر ہے ...... وہ بہتر ہیں، فی الحال سکون آور دوا کے زیرِ اثر سو رہے ہیں، آپ انھیں دیکھ سکتے ہیں...... اور ہاں اگر وہ ہوش میں آجائیں تو زیادہ بات چیت نہ کرنا۔“ ڈاکٹر نے ایک لمحہ رک کر مختصر الفاظ میں مریض کی حالت سے آگاہ کرتے ہوئے ہدایت جاری کی اور آگے بڑھ گیا۔

وہ دونوں اندر داخل ہوگئے۔ پروفیسر سینے تک کمبل اوڑھے لیٹا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلا سکون اس کی بہتر حالت کا پتا دے رہا تھا۔ وہ وہیں صوفے پر بیٹھ گئے۔

عاتکہ بولی۔ ”عدی!...... اب اگر تم جانا چاہو تو جا سکتے ہو، مجھے تو شاید ساری رات جاگنا پڑے گا۔ کیونکہ جب تک پاپا اٹھ نہیں جاتے میں نہیں سو سکوں گی۔“

”نہیں میں بھی تمھیں اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔“

وہ مسکرائی۔ ”میں بچی تھوڑی ہوں کہ اکیلے میں ڈر جاؤں گی۔“

”عورت ذات تو ہو ناں؟“

”عدی!...... قسم سے ابھی تک میرا دل لرز رہا ہے کہ اگر پاپا کو کچھ ہو جاتا تو میں تو بالکل اکیلی رہ جاتی۔“

”کیوں!...... میں مر گیا تھا کیا؟“ عدنان ایک دم جذباتی ہوگیا۔

”عدی!...... کسی دوست کے سہارے زندگی نہیں گزاری جا سکتی۔“ عاتکہ کے لہجے میں دوپہر کی گفتگو کا اثر موجود تھا۔

”عاتکہ!...... جانتی ہو تمھارے پاپا محبت کے نام سے کیوں الرجک ہیں اور چودھریوں سے کیوں نفرت کرتے ہیں؟“ عدنان نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”اس پر ہم تفصیلی بات کر چکے ہیں۔“

”مجھے پتا ہے؟“ اس نے نارمل لہجے میں انکشاف کیا۔

وہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”عدی! بجھارتیں نہ ڈالو؟“

وہ مغموم لہجے میں بولا۔ ”اس کا نام صالحہ تھا۔ چوہدری حیدر علی کی لاڈلی بیٹی دو بھائیوں کی اکلوتی بہن ناز و نعم میں پلی ہوئی، اس کی کسی بات کو کبھی رد نہیں کیا گیا تھا، مگر پھر اس کی بدقسمتی کہ وہ ایک عام سے جوان کی محبت میں

گرفتار ہوگئی، ایک ایسا نوجوان جس کا اپنا گھر بار بھی نہیں تھا، جو اپنے چچا کے گھر رہائش پذیر تھا...... لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ محبت ذات پات نہیں دیکھتی، وہ دونوں بھی ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ ان کے چھپ چھپ کر ملنے کی خبر زیادہ عرصہ راز نہ رہ سکی اور ایک دن اس کے بھائیوں کو معلوم ہو گیا۔ چودھری خاندان کے سپوت کہاں یہ برداشت کر سکتے تھے کہ ان کی بہن ایک عام سے نوجوان کی محبت میں گرفتار ہو۔ انھوں نے ایک دن اس نوجوان کو پکڑ کر سر عام سزا دی اور اپنی بہن کو چھونے کی پاداش میں اس کے دونوں بازو کہنیوں سے توڑ دیے اور اُسے بے ہوش حالت میں چوراہے میں پھینکوا دیا۔ چودھریوں کے وہاں سے ہٹتے ہی اس نوجوان کا چچا اسے زخمی حالت میں اپنے علاقے سے راولپنڈی لے آیا۔ یہاں علاج معالجے کے بعد وہ نوجوان پوری دل جمی سے تعلیم کے حصول کی طرف متوجہ ہو گیا۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ پروفیسر بن گیا پھر اس نے شادی کر لی اور بھول کر بھی اپنے علاقے کا رخ نہ کیا۔ اس بات کو اتنا عرصہ گزر گیا ہے کہ اس کی بیٹی بھی جوان ہو گئی ہے مگر آج تک اس کے دل سے چودھریوں کی نفرت گئی اور نہ ہی پیار و محبت سے بیر۔''

''اور وہ شخص میرے پاپا ہیں...... ہے ناں؟''

عدنان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تمھیں یہ سب کس طرح معلوم ہوا؟''

''کیونکہ...... حیدر علی میرے دادا تھے...... اور آپ کے پاپا کے بازو توڑنے والے میرے چچا قربان حیدر اور والد فرمان حیدر تھے۔''

''گویا تم پہلے سے ساری کہانی جانتے ہو؟''

''ہاں۔''

''مطلب تم نے پاپا سے جان بوجھ کر اس طرح کی بحث کی، انھیں چھیڑا بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ ذہنی ٹارچر کیا تو غلط نہیں ہوگا؟''

''''ہاں یہ سچ ہے۔'' عدنان نے اثبات میں سر ہلایا۔

عاتکہ ہونٹ چباتے ہوئے بولی۔ ''پاپا کی چودھریوں سے نفرت بلاوجہ نہیں ہے؟''

"بھلاوہ کیسے؟"

"جب پاپا کے بازو توڑے گئے، انھیں زدوکوب کیا گیا، اس وقت محبت کے دعوے کرنے والی چودھرانی کہاں تھی؟......اب تم کہو گے کہ وہ عورت ذات تھی اور کچھ نہیں کر سکتی تھی ......کیا بعد میں بھی پاپا سے رابطہ کر کے انھیں تسلی نہیں دے سکتی تھی ......ان کی ہمت نہیں بندھا سکتی تھی، مگر کیوں؟ ایک چودھرائن کو کیا فرق پڑتا تھا؟ برباد تو کسی غریب کی زندگی ہو رہی تھی ناں؟ امیروں کا کیا؟ تو نہ سہی اور سہی اور نہیں اور سہی......؟"

"ہونہہ!......لگتا یہی ہے کہ پروفیسر صاحب ہیرو ہیں۔" عدنان کے لہجے میں شامل طنز عاتکہ کو چونکا گیا۔

"اس میں شبہ ہی کیا ہے؟"

"صرف مجھے نہیں......شاید پروفیسر صاحب کو بھی شبہ ہو؟"

"ہاں تم کہہ سکتے ہو؟"

"عاتکہ! تم نے صرف اپنے پاپا کی کہانی سنی ہے......صالحہ بوا کے بارے میں تو میں نے بتایا ہی نہیں۔"

"تو اب بتا دیں؟" اب طنز کرنے کی باری عاتکہ کی تھی۔

"وہ بمشکل ایک سال ہی جی پائی۔ اپنے محبوب کے دکھ میں گھل گھل کر مر گئی وہ چودھرائن اس غریب محبوب سے بچھڑنے کے بعد نہ تو کبھی ہنس پائی اور نہ خوش ہو پائی، تو ہیرو کون ہوا؟"

"عدی......!.........." عاتکہ سسک کر رہ گئی تھی۔

"ہاں عاتکہ!......پروفیسر نے ایک چودھرائن کو دھوکا دیا......اسے سسکتا، بلکتا، روتا، روگوں کے حوالے کر گیا، وہ بھولی بھالی چودھرائن نہیں جانتی تھی کہ اس کا چاہنے والا کہاں چلا گیا ہے؟ اگر پروفیسر نے کسی کے ہاتھ پیغام ہی بھجوا دیا ہوتا تو شاید وہ ساری زندگی اس کی راہ تکتی رہتی مگر ایک غریب محبت کے دعوے دار مرد سے اتنا بھی نہ ہو سکا، بس اس نے صرف اتنا کیا کہ محبت اور اپنی محبوبہ کی قوم سے نفرت شروع کر دی......تمھارے پاپا نے کبھی محبت کی ہی نہیں تھی، بس وہم تھا کہ اسے محبت ہے۔"

"نہیں بیٹا!......میں بزدل تھا۔" وہ دونوں پروفیسر کی آواز سن کر اچھل پڑے وہ جانے کب سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔

''پاپا.........'' عاتکہ دوڑ کر اس سے لپٹ گئی تھی۔

''پاپا کی جان......'' پروفیسر اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

''پاپا!......اب کیسا محسوس ہو رہا ہے؟''

''اللہ کا کرم ہے۔ اچھا ہوں......'' اتنا کہہ کر وہ عدنان سے مخاطب ہوا۔

''عدنان بیٹا!......تم میرے گلے نہیں لگو گے؟''

''ڈرتا ہوں سر!......''

''بیٹا!......مجھے اپنی غلطی تسلیم ہے......میں تو آج تک یہی سمجھتا رہا کہ میرے ساتھ ظلم ہوا، میں نے تو تنہائی میں بھی صالحہ کو یاد کرنا چھوڑ دیا تھا......مجھے کیا معلوم تھا۔ کہ.........'' یہ کہتے ہی پروفیسر کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔

عدنان بھی آگے بڑھ کر پروفیسر سے لپٹ گیا۔

''مجھے معاف کر دینا بیٹا! انجانے میں، میں بہت بڑی غلطی کر بیٹھا ہوں بھائیوں کی زیادتی کا بدلہ ان کی بہن سے لیتا رہا، جو، ان سے زیادہ میری اپنی تھی۔'' حقائق جان کر وہ سسک اُٹھا۔

''نہیں سر!......آپ اکیلے قصوروار نہیں ہیں......ابوجان اور چچا جان بھی اس جرم میں برابر کے شریک ہیں۔''

''بیٹا!......میں صالحہ کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا ازالہ تو نہیں کر سکتا ہاں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ تمھارے اور عاتکہ کے بیچ دیوار نہیں بنوں گا۔''

عاتکہ نے باپ کی چھاتی سے سر اٹھا کر عدنان کی طرف دیکھا تو اس کے دماغ میں ایک بار پھر دوپہر کے وقت ہونے والی گفتگو تازہ ہونے لگی۔ اس وقت عدنان نے بڑی سختی سے اس کی پیش قدمی ٹھکرا دی تھی۔ مگر اس وقت وہ ششدر رہ گئی جب اس نے عدنان کا پراعتماد لہجہ سنا۔

''جی سر!......عاتکہ ہے بھی ہماری امانت، اور اسی امانت کے حصول کے لیے میں نے اس یونیورسٹی میں داخلہ لیا جس میں آپ پڑھاتے ہیں۔'' اس کا دل خوشگوار انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔

☆......☆......☆

تنہائی ملنے پر اس نے سب سے پہلے عدنان سے یہی سوال کیا تھا۔

''کیوں جناب!......کل دوپہر کو تو محبت کے نام پہ بہت سیخ پا ہو رہے تھے؟''

''کیونکہ میں چاہتا تھا کہ یہ ساری کہانی تمھیں سر کی زبانی سننے کو ملے......اسی لیے بار بار زور دے رہا تھا کہ اپنے پاپا سے پوچھو کہ وہ محبت اور چودھریوں سے کیوں نفرت کرتے ہیں؟''

''اگر تم مجھے پہلے دن یہ ساری کہانی بتا دیتے تو کیا فرق پڑتا؟''

''بہت فرق پڑتا......''۔

''بھلا کیسے؟''

''کیونکہ، میرا ارادہ تھا کہ پروفیسر کو بھی وہی دکھ دوں گا جس کا شکار میری پھوپھو جان ہوئی تھیں۔''

''عدنان!......'' عاتکہ کے منہ سے تحیر آمیز آواز نکلی۔''کیا کہہ رہے ہو؟''

وہ اطمینان سے بولا۔''صحیح کہہ رہا ہوں......میری امی جان نے مجھے تاکید کی تھی کہ پروفیسر کی بیٹی کو اپنی دلہن بناؤں مگر......میں نے تمھاری جانب قدم بدلہ لینے کے لیے بڑھائے تھے......یہ علیحدہ بات کہ خود بھی تمھاری محبت میں گرفتار ہو گیا۔''

''بہت برے ہو تم؟'' عاتکہ دکھ بھری آواز میں بولی۔

''عاتکہ سیانے کہتے ہیں......جیسا کرو گے ویسا بھرو گے......اور یہ کہ تمھارے گناہوں کی فصل شاید تمھاری اولاد کو کاٹنی پڑے۔''

''پاپا کا گناہ اتنا بڑا تو نہیں تھا......تمھارے چچا اور والد صاحب نے بھی تو زیادتی کی ہے۔وہ تمھیں نظر نہیں آتی؟''

''نظر آئی تھی......مگر اس میں میری پھوپھو کا قصور تو نہیں تھا......میرے چچا اور والد کی سزا میری معصوم پھوپھو کو ملی آخر کیوں......؟''

''تم بھی تو یہی کر رہے تھے......پاپا کا بدلہ مجھ سے لے رہے تھے۔''

''لیا تو نہیں ناں؟......اور امی جان نے بھی یہی کہا تھا کہ تمھیں ان کی بہو بناؤں مجھے تو بس غصہ آیا ہوا تھا

اور ویسے بھی جب سے تمھیں دیکھا ہے میرا دل بدلہ لینے اور تمھیں اپنانے کے فیصلے کے درمیان اٹکا ہوا تھا......یوں بھی اگر بدلہ لینا ہوتا تو پہلے ہی دن سے تم پر اپنی محبت ظاہر کر دیتا، یقین مانو عاتکہ گزشتہ رات تک میں کسی فیصلے پر نہیں پہنچا تھا......یہ تو بس تمھارے پاپا کے اعتراف جرم نے میری مدد کی اور میں نے موت کے بجائے زندگی کو ترجیح دی حالانکہ امی جان کب سے زور دے رہی ہیں کہ تمھیں بیاہ کر گھر لے آؤں کیونکہ انھوں نے میرے ذمہ ایک ضروری کام لگانا ہے۔"

"موت......؟......زندگی......؟"

"ہاں عاتکہ!......اگر میں تم سے دور چلا جاتا تو یقیناً جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا اور پھر امی جان کا دوسرا کام درمیان میں ہی رہ جاتا۔"

"عدی!......" عاتکہ نے بے ساختہ اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔" آئی لو یو سو مچ۔"

"می ٹو......جان۔" عدنان کے لہجے میں محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

"دوسرا کون سا کام آنٹی نے تمہارے ذمہ لگانا ہے؟"

"یہ تو اللہ پاک کو یا پھر خود امی جان کو معلوم ہے۔" عدنان آسمان کی طرف نظر اٹھا کر بولا۔اور عاتکہ ہنسنے لگی۔



اس ساری کہانی میں میری اُلجھن کا تو کوئی ذکر ہی نہیں آیا؟" عدنان کے خاموش ہوتے ہی میں نے بے ساختہ پوچھا۔

عدنان مسکرایا......" کہانی ختم کہاں ہوئی ہے جناب۔"

"تمھاری اور عاتکہ کی شادی ہوگئی......تمھارے ابو اور چچا نے پروفیسر سے معافی مانگ لی ہوگی......باقی کیا بچا؟"

"ابھی تک میرا قصہ تو باقی ہے ناں محترم؟" داؤد خان ہنسا۔

"دیکھو بھائی......تم دونوں کی کہانیاں دل چسپ ہونے کے باوجود مجھے الجھا رہی ہیں......براہ مہربانی پہلے مجھے کھانے کو کچھ دیں......مجھے سخت بھوک محسوس ہو رہی ہے اس کے بعد ہی میں کچھ سننے سمجھنے کے قابل ہوں گا۔"

داؤد خان مسکرایا۔"ہاں بھئی واقعی ہم نے تمہارا کافی ٹائم لے لیا ہے...... باقی کی گپ شپ کل ہوگی۔ فی الحال کھانا کھائیں گے، اس کے بعد تم آرام کرنا...... انشاءاللہ زندگی رہی تو صبح بات کریں گے۔"

میں نے وال کلاک کی طرف نگاہ دوڑائی شام کے چھ بجنے والے تھے بہت لمبی نشست تھی، گو اس دوران ہم نے دو تین بار چائے بھی پی اور گاہے گاہے فریش ہونے کے لیے واش روم تک بھی گئے تھے، مگر کہانی کا تسلسل برقرار رکھنے کے لیے مجھے یہ ذکر حذف کرنا پڑا۔

ڈنر میں داؤد خان نے بہت زیادہ تکلف سے کام لیا تھا...... مجھے اپنی گزشتہ رات یاد آ گئی جب مجھے پیٹ بھر کر کھانا بھی میسر نہیں ہوا تھا۔ اور پھر رات جس طرح سردی میں ٹھٹھرتے گزری تھی وہ ایک الگ اذیت تھی۔ پر تکلف ڈنر کے بعد ایک شریف صورت ملازم نے ایک آرام دہ خواب گاہ کی طرف میری رہنمائی کی مجھے اغوا کر کے قید کرنے والے دونوں آدمیوں کو شاید داؤد خان نے کہیں بھیج دیا تھا۔ وہ مجھے دوبارہ نظر نہیں آئے تھے۔ میرا سارا سامان مجھے واپس مل گیا تھا اور سونے سے پہلے میں راشد کو کال کرنا نہیں بھولا تھا۔ وہ بہت مخلص اور پیارا دوست تھا۔ ناراض ہونے کے باوجود اس نے گلے شکوؤں میں ٹائم ضائع کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور براہ راست اصل بات پر آ گیا تھا۔ وہ گزشتہ رات بھی مجھے کال کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا مگر میرا موبائل فون آف ہونے کی وجہ سے ناکام رہا تھا۔ اور اب وہ بے چینی سے ساری تفصیل سننے کے لیے بے تاب تھا۔ میں نے مختصر الفاظ میں اسے ساری کہانی سنائی اور آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا۔ حسب سابق وہ رات کو پھر میرے خواب میں آئی...... اسی طرح اداس، دکھی اور خفا خفا۔ جب سے صمد خان کے ہاتھوں میری عزت کا جنازہ نکلا تھا وہ میرے خواب میں خفا خفا سی دکھائی دیتی تھی...... پہلے چند دن تو اس کی آنکھوں میں حقارت بھی ہوا کرتی مگر اب اس حقارت کی جگہ خفگی نے لے لی تھی...... بہت زیادہ سوچنے اور سر کھپانے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ کسی نہ کسی طرح اس کا تعلق صمد خان سے ضرور ہے اور یہ تعلق بھی دشمنی کا ہے ورنہ دوستی کا ہوتا تو وہ بھی میرے چوڑیاں پہننے کے عمل سے خفا نہ ہوتی، بہرحال کچھ بھی تھا اب اس حقیقت سے پردہ اٹھنے والا تھا...... کون جانے یہ جان کاری مجھے افسردہ کرنے والی تھی یا خوش؟...... اس حقیقت سے صرف اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات ہی واقف تھی۔

صبح فریش ہونے کے بعد میں نے پرتکلف ناشتا کیا اور پھر راشد کو کال کرنے لگا۔

"جی جناب!......" موبائل فون کے سپیکر سے اس کی چہکتی آواز میرے کانوں میں گونجی۔

"ناشتا کرلیا ہے اور قصہ گو صاحبان کا منتظر ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"خیال رکھنا...... یہ نہ ہو قربانی کے بکرے کی طرح کھلا پلا کر تجھے قربان کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔"

"نہیں یار!......دونوں بہت مخلص دکھائی دیتے ہیں۔"

"کبھی کبھی بھیڑ کے روپ میں بھیڑیے بھی چھپے ہوتے ہیں؟"

"ابھی مجھ میں بھیڑیوں کا سامنا کرنے کا حوصلہ آگیا ہے دوست!"

"کیا؟" راشد کی آواز میں تحیر تھا۔

"ہاں راشد!...... میرا مسئلہ نفسیاتی سا تھا...... خود کو امن پسند سمجھ کر اپنی بزدلی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ صمد یار خان نے میری عزت نفس جس طرح مجروح کی وہ میری انا، خودداری اور روح پر تازیانے کی طرح لگی، پھر بابا جان اور مہر دل خان کا حقارت آمیز سلوک، تمہارے طعنے اور سب سے بڑھ کر خوابوں والی کی خفگی مجھے معلوم ہی نہ ہوا کہ کیسے میرے اندر غیر محسوس سی تبدیلی آنے لگی اور پھر پرسوں جب داؤد خان کے آدمی نے مجھے باپ کی گالی بکی تو یہ لاوا ایک دم پھٹ پڑا اور میں نے سچ مچ اس کا گلا دبا دیا......اور یہیں سے میری کایا پلٹ گئی۔"

"کیا کیا کیا......تم نے ایک آدمی کا گلا دبا کر اسے جان سے مار دیا۔" راشد کے لہجے سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بے ہوش ہونے کے قریب ہے۔ "یہ بات تم نے مجھے کل رات کے وقت کیوں نہیں بتائی تھی؟"

"رات کو تو بس مختصر سی بات چیت ہوئی تھی تفصیلی بات چیت تو انشاءاللہ ملاقات ہونے پہ ہوگی۔"

"مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میں اسی شیر دل خان سے بات کر رہا ہوں کہ جس کی چھاتی میں بکری کا دل دھڑکتا تھا۔"

"ہاں دوست!...... کیونکہ مجھے معلوم ہو گیا ہے، کہ امن کے لیے جنگ لازم ہے۔" میں پر اعتماد لہجے میں بولا۔ "جب تک آپ دشمن کو یہ باور نہیں کرا دیتے کہ آپ اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں بلکہ اینٹ سے ہی دیں

گے تب تک وہ آپ پر حاوی رہے گا اور تنگ کرنے کا کوئی موقع جانے نہیں دے گا، اس کی زندہ مثال میں خود ہوں، صمد یار خان کی بے عزتی بابا جان اور مہر دل نے کی مگر صمد یار خان ان کا کچھ نہ بگاڑ سکا...... جبکہ میں اس کے قدموں میں جھک گیا مگر اس نے مجھے معاف کرنے کے بجائے مجھے اپنی نظروں میں گرنے پر مجبور کر دیا۔ اور یقین کرو جب اسے یقین ہو گیا کہ ان تلوں میں تیل نہیں ہے تو تبھی وہ اس حد تک آ گیا تھا۔''

''شیر دل!...... مجھے فخر ہے تم پر۔''

''اور مجھے تمھاری دوستی پر۔'' یہ الفاظ میرے منہ میں تھے کہ دروازے پر دستک دے کر داؤد خان کا ملازم اندر داخل ہو کر مؤدبانہ لہجے میں بولا۔

''خان جی!...... صاحب کہہ رہے ہیں کہ فارغ ہو کر تشریف لے آئیں عدنان صاحب بھی پہنچ گئے ہیں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر راشد سے کہا۔''اچھا یار!...... بعد میں بات ہو گی، فی الوقت تو میرا بلاوا آ گیا ہے۔''

''اوکے......'' کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا اور میں بستر چھوڑ کر ڈرائینگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ وہ دونوں میرے منتظر تھے۔

''آیئے شیر دل خان!'' داؤد خان اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے بولا۔ عدنان بھی میرے استقبال کے لیے کھڑا ہو گیا تھا۔

دونوں سے مصافحہ کر کے میں نے عدنان کے ساتھ والی نشست سنبھال لی۔ داؤد خان عمر میں ہم دونوں سے بڑا تھا۔ بلکہ مجھ سے تو عدنان بھی دو تین سال بڑا ہی ہو گا۔

بیٹھتے ہی داؤد خان نے پوچھا۔''چائے، قہوہ یا کافی؟''

میں ہنسا۔''ابھی تو ناشتا کیا ہے......؟''

''بات چیت کے دوران کوئی نہ کوئی مشروب تو ہونا چاہیے ناں؟''

''میرا خیال ہے چائے بہتر رہے گی...... کیوں عدنان بھائی؟''

''صحیح کہا۔'' عدنان نے میری تائید کی اور داؤد خان ملازم کو چائے کا بتانے لگا۔

''داؤد بھائی!......ایک درخواست ہے؟'' وہ جیسے ہی ملازم کو چائے کا بتا کر میری طرف متوجہ ہوا میں نے بے تکلفی سے کہا۔

''حکم کرو شیر دل!......؟''

''بھیا!......تم دونوں کی کہانی بہت دل چسپ اور پر تجسس ہے لیکن بخدا میں اپنے خوابوں میں آنے والی محترمہ کے بارے جاننے کے لیے بہت بے چین ہوں۔تو اس لیے پلیز اپنی کہانی کو مختصر کریں یا پہلے اس کے بارے میں میرا تجسس ختم کریں بعد میں اپنی کہانی سنا لینا۔''

وہ مسکرایا......''چلو جیسی تمھاری مرضی ......میں تمھیں بابا جان اور اپنے چچا صمد یار خان کی ہونے والی کش مکش کے بارے بتا رہا تھا......صمد یار خان نے بڑی بے دردی سے گل رخ کے والد کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اور اس بارے میں گل رخ کو سب معلوم ہو گیا تھا۔کیونکہ اس کے باپ کی رائفل سے کوئی گولی فائر نہیں ہوئی تھی۔گل رخ کی ماں زرینہ گل یہ جان کر ہسپتال پہنچ گئی تھی۔''

''ہاں یاد ہے لالہ'' میں نے کہا اور داؤد خان کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔یہ خوشی میرے لالہ کہنے سے اس کے چہرے پر ظاہر ہوئی تھی۔

''بس اس کے بعد مختصراً یہ سمجھ لو کہ صمد یار خان جسے چچا کہتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔زیادہ دن گل رخ اور میرے بابا جان احمد یار خان کا تعلق برداشت نہ کر سکا اور گل رخ کی ماں کو تنگ کرنا شروع کر دیا،کہ گل رخ کی شادی اس کے ساتھ کر دی جائے ورنہ وہ اسے اغوا کر کے لے جائے گا۔دوسری جانب گل رخ نے ساری بات میرے بابا جان کو بتا دی تھی......لیکن اس سے پہلے کہ بابا جان،صمد یار خان کے خلاف کوئی کارروائی کرتا وہ پہل کر گیا اور ایک رات خالہ کے گھر گھس گیا۔اس کا ارادہ گل رخ کو زبردستی وہاں سے لے جانے کا تھا،زرینہ خالہ اسے ایسا کرنے کی اجازت بھلا کب دے سکتی تھی۔وہ بے ساختہ صمد یار خان سے لپٹی اور بیٹی کو بھاگ جانے کا کہا۔گل رخ بھی صمد یار خان کے چہرے پر چھائے وحشت بھرے تاثرات دیکھ کر ڈر گئی تھی۔چنانچہ وہ گھر سے نکل بھاگی جبکہ صمد یار خان اپنی خالہ سے الجھ گیا۔زرینہ خالہ کسی آکٹوپس کی طرح اس سے چمٹ گئی تھی۔صمد یار خان کا اس سے جان چھڑانا مشکل ہو گیا تھا......تنگ آ کر اس نے اپنی خالہ کے سر پر پستول کی نال رکھ کر بغیر کسی

ہچکچاہٹ کے ٹریگر دبا دیا۔ اپنی جنونی محبت کی خاطر اس نے بھرے پرے خاندان کا صفایا کر دیا تھا۔

خالہ کے گرتے ہی وہ بھاگتے ہوئے باہر نکلا مگر گل رخ اسے نظر نہیں آئی تھی۔ اندھیرے کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ سردیوں کی رات میں ہر کوئی منہ سر لپیٹے سویا تھا۔ شاید وہ کسی کے گھر میں گھس گئی تھی۔ صمد یار خان وہاں سے غائب ہو گیا۔

گل رخ جیسے ہی گھر سے نکلی اس کے کانوں میں فائر کی آواز گونجی اور اس کے ساتھ ہی اپنی ماں کی دل خراش چیخ نے اس پر لرزہ طاری کر دیا تھا۔ وہ ننگے پاؤں گلی میں بھاگتی چلی گئی۔ رک کر کسی کا دروازہ کھٹکھٹانے میں یہ خطرہ تھا کہ شور کی آواز سن کر صمد یار خان وہاں پہنچ جاتا اور جو بندہ اپنی خالہ اور خالو کو بے دردی سے ٹھکانے لگا سکتا تھا وہ کسی دوسرے، تیسرے کا کیا لحاظ کرتا بھاگتے بھاگتے بے اختیار اس کا رخ بابا جان کے گھر کی طرف ہو گیا۔ بابا جان رات کے وقت اسے یوں ننگے پاؤں بغیر دوپٹے کے دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔

پھر گل رخ کی زبانی ساری بات سنتے ہی بابا جان نے رائفل لے کر گل رخ کے گھر کا رخ کیا۔ مگر صمد یار خان وہاں موجود نہیں تھا۔ گل رخ کی بدقسمتی کہ وہ سیدھا اپنے گھر آیا اور گل رخ کو یہاں دیکھ کر اس کی مراد بر آئی۔ وہ اپنی ماں کی موجودگی کی پروا کیے بغیر واشگاف الفاظ میں گل رخ سے کہنے لگا۔

''تم جتنا چاہو بھاگ لو تمھیں دنیا کی کوئی طاقت چھین مجھ سے نہیں سکتی۔ تم میری بیوی بنو گی یا پھر کسی کی نہیں بنو گی۔''

گل رخ اس کے منہ پر تھوکتے ہوئے بولی۔ ''مجھے کسی کتے کی بیوی بننا قبول ہے مگر تیری نہیں۔''

یہ بات صمد یار خان کو مشتعل کر گئی اور اس بدبخت نے اپنی ماں کا لحاظ کیے بغیر گل رخ پر مجرمانہ حملہ کر دیا۔ اگر وہاں دادی جان موجود نہ ہوتیں تو وہ اپنے مذموم مقصد میں ضرور کامیاب ہو جاتا۔ مگر دادی جان پٹھان زادی تھیں، اپنی موجودگی میں کیسے ایک معصوم لڑکی کی عزت لٹتے دیکھ سکتی تھیں۔ انھوں نے ایک موٹا سا ڈنڈا اٹھا کر اتنی زور سے صمد یار خان کے سر پہ مارا کہ وہ وہیں تیورا کر گر پڑا۔ اس کے گرتے ہی دادی نے گل رخ کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

''بیٹی!...... خدا کے لیے یہاں سے کہیں دور چلی جاؤ...... اگر تم یہاں موجود رہیں تو دونوں بھائیوں میں

سے کسی ایک کی جان چلی جائے گی...... خدارا کہیں دور چلی جاؤ...... کسی دوسرے شہر میں چلی جاؤ...... یہاں اب تیرا کون بچا ہے؟...... یوں بھی صمد یار خان نہایت ضدی اور اکھڑ ہے، یہ تیرا پیچھا نہیں چھوڑے گا چاہے اس کی جان چلی جائے...... اس لیے خدارا یہاں سے چلی جاؤ۔ میرے جڑے ہاتھوں کا واسطہ، مجھ پر رحم کھاؤ۔"

گل رخ اپنی سگی خالہ کا یہ رویہ دیکھ کر سن ہو کر رہ گئی تھی...... مگر بعد میں جب اس نے خود کو خالہ کی جگہ پر رکھ کر سوچا تو اسے ان کا رویہ اتنا عجیب نہ لگا۔ صمد یار خان سے ازحد نفرت کرنے کے باوجود وہ اکیلی تھی اور اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی...... خالہ ماں کی طرح ہی ہوتی ہے مگر اس کی خالہ نے بیٹے کی محبت میں بھانجی سے آنکھیں پھیر لی تھیں۔ وہ دوبارہ اپنے گھر پہنچ گئی ماں کی آخری رسومات سے پہلے وہ گاؤں چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتی تھی۔

ادھر بابا جان جب خالہ کے گھر پہنچے تو وہاں صمد یار خان موجود نہیں تھا البتہ اس کی خالہ کی لاش پڑی تھی۔ جو گل رخ کی بات کی گواہی دے رہی تھی۔ خالہ کی لاش کو چارپائی پر لٹا کر اس نے لاش پر کپڑا ڈالا اور سیدھا تھانے پہنچ گیا۔ وہاں اس نے صمد یار خان کے خلاف خالہ کے قتل کی ایف آئی آر کٹائی اور گھر پہنچ گیا۔ ماں نے بے ہوش صمد یار خان کو اپنی چارپائی کے نیچے لٹا کر چھپا دیا تھا۔ یاری خان نے ماں کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا اور گل رخ کے بارے پوچھا تو دادی نے بیٹے سے جھوٹ کہہ دیا کہ وہ اپنی مرضی سے کہیں چلی گئی ہے۔ گو بابا جان کو حیرانی تو ہوئی مگر اس نے زیادہ استفسار نہ کیا اور ماں کو ساتھ لے کر واپس خالہ کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں گل رخ موجود تھی اور اپنی ماں کی لاش کے ساتھ بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ پولیس کے پہنچنے تک سارا گاؤں وہاں اکٹھا ہو گیا تھا۔ بابا جان سب کو صمد یار خان کی کارستانی کے بارے میں بتانے لگا مگر اس وقت اس کی حیرانی کی انتہا نہ رہی جب اس کی ماں نے سختی سے اس کی مخالفت کر دی۔

"یاری خان!...... کیا بک رہا ہے، کیوں اپنے چھوٹے بھائی پر جھوٹے الزام دھر رہا ہے۔"

بابا جان نے حیرانی سے کہا۔ "مور جان!...... آپ کو تو سب پتا ہے پھر بھی آپ؟"

"مجھے کچھ نہیں معلوم۔" دادی جان اپنے پیارے بیٹے کی جان بچانے کے لیے ہٹ دھرمی پر اتر آئی تھی۔ پولیس کے سامنے بھی اس نے بابا جان کے بیان کو سختی سے جھٹلا دیا تھا۔ پولیس نے گل رخ سے بیان لیا اس نے زخمی نظروں سے خالہ کے بوڑھے جھریوں بھرے چہرے کی طرف دیکھا۔ صمد یار خان اس کے والدین کا قاتل تھا

وہ اسے کیسے معاف کر سکتی تھی چاہنے کے باوجود وہ خالہ پر ترس نہ کھا سکی اور اس نے پولیس کے سامنے ساری کہانی بلاکم وکاست دہرا دی۔

جب کہ اس کی خالہ نے پولیس کو یہ بیان دیا کہ جس وقت یہ واقعہ پیش آیا اس وقت صمد یار خان گھر میں موجود تھا۔ان کا گھرانا دو دھڑوں میں بٹ گیا تھا۔ماں اور صمد یار خان ایک طرف اور بابا جان دوسری طرف۔صمد یار خان کو جب ساری کہانی کا پتا چلا تو اس نے بھاگنے کے بجائے گرفتاری دینے میں بہتری سمجھی۔وہ اپنی خالہ خالو کے قتل سے بالکل مکر گیا تھا۔کیس چلا مگر گل رخ کے پاس کوئی واضح شہادت موجود نہیں تھی۔"اس کے باپ کی رائفل سے گولی نہیں چلی تھی۔" یہ اتنی بڑی شہادت نہیں تھی کیونکہ رائفل کو بعد میں بھی صاف کیا جا سکتا تھا۔اور پھر اس سے پہلے بھی اس رائفل سے کئی بار فائر ہو چکا تھا اگر وہ بالکل نئی رائفل ہوتی تب اس کی بات میں کچھ وزن ہوتا۔سب سے بڑھ کر گل رخ اور اس کی ماں کا جابر خان کی موت کو صیغہ راز میں رکھنا ایک سوالیہ نشان پیدا کر رہا تھا۔جلد ہی صمد یار خان ضمانت پر رہا ہو گیا۔گل رخ نے صاف طور پر میرے بابا جان سے کہہ دیا تھا کہ وہ صمد یار خان کی موت سے پہلے ان سے شادی نہیں کر سکتی۔بابا جان اپنے چھوٹے بھائی سے بہت محبت کرتے تھے ،گو کہ صمد یار خان کی غلط حرکات کی وجہ سے وہ اس سے شدید بدظن ہو گئے تھے مگر اس کے باوجود وہ اسے قتل کرنے کی ہمت نہ کر سکے گل رخ کی محبت اپنی جگہ ،مگر بھائی کو گولی مارنا اس کے لیے ناممکن تھا۔البتہ قانون کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے بابا جان نے گل رخ کا ساتھ دیا۔اسے امید تھی کہ وہ گل رخ کو انصاف دلانے میں کامیاب ہو جائیں گے مگر یہ ان کی بھول تھی ...... پاکستان میں نظام عدل سے انصاف کی توقع کرنا انگاروں سے ٹھنڈک مانگنے کے مترادف ہے۔یہاں پولیس سے لے کر وکیل اور منصف تک سب بکاؤ مال ہیں۔اپنی اپنی دکانیں سجائے بیٹھے ہیں۔

ضمانت پر رہا ہونے کے بعد اگلے دن صمد یار خان نے اپنے دو اوباش ساتھیوں کی مدد سے گل رخ کو اغوا کر لیا۔وہ اسے ایک ویگن میں ڈال کر پشاور لے گیا۔وہاں اسے اپنے دوست کے مکان میں بند کر کے واپس گاؤں پہنچا۔شام تک وہ گھر میں رہا،رات ہوتے ہی واپس شہر لوٹ آیا اور جا کر گل رخ کو دھمکانے لگا کہ اگر وہ اس کے ساتھ شادی نہیں کرے گی تو وہ اسے کوٹھے پر بٹھا دے گا اور اس سے پہلے وہاں جتنے بھی مرد ہیں تمام

اسے جنسی تشدد کا نشانہ بنائیں گے، وغیرہ وغیرہ۔ گل رخ ڈر گئی، مگر اس کے باوجود وہ ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ دل ہی دل میں اُس نے ایک فیصلہ کیا اور بولی۔

"صمد یار خان!...... تم میرے والدین کے قاتل ہو، اگر تم اتنا بڑا قدم نہ اٹھاتے تو میں خود بھی تمھیں پسند کرتی تھی...... تم نوجوان ہو؟...... خوبصورت ہو؟...... کسی چیز کی کمی نہیں ہے تم میں، پھر تم نے کیوں اتنا بڑا اور برا قدم اٹھایا؟"

"تم!...... یاری خان کی طرف مائل تھیں؟" گل رخ کا نارمل لہجہ صمد یار خان کو فتح کی نوید دلانے لگا۔

"میں نے کب کہا تھا کہ میں یاری خان سے شادی کروں گی؟"

"کہنا ضروری تو نہیں ہوتا...... بس رویے سے احساس دلایا جاتا ہے۔" صمد یار خان کے لہجے میں شکوہ تھا، ایسے کہ جیسے وہ اُس کا محبوب ہو۔

گل رخ نے اس کے لہجے سے حوصلہ پا کر کہا۔

"ٹھیک ہے صمد یار خان!...... مگر اس کے لیے میری کچھ شرائط ہیں۔"

"بتاؤ......؟" صمد یار خان کے لہجے میں دبا دبا جوش تھا...... اسے لگ رہا تھا کہ وہ گوہر مقصود حاصل کرنے والا ہے۔

"سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ جب تک امی جان کا چالیسواں نہیں گزر جاتا نکاح نہیں ہو گا...... دوسری تم پشاور میں مکان خریدو گے میں گاؤں واپس نہیں جاؤں گی۔ تیسری تم یاری خان سے صلح کرو گے اور اس سے معذرت بھی کرو گے اور چوتھی تم نکاح نامے پر لکھ کر دو گے کہ تم میرے مرنے سے پہلے دوسری شادی نہیں کرو گے۔"

"مجھے منظور ہے۔" صمد یار خان خوشی سے چہکا۔ اور گل رخ نے بناوٹی حیا سے سر جھکا لیا۔

اس کے بعد صمد یار خان گل رخ کو خوش کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو گیا۔ وہ اس کے لیے اچھے اچھے کپڑے اور میک اپ کا سامان خرید کر لانے لگا۔ گل رخ بھی دل پر جبر کیے وہ تحائف خوشی سے وصول کرتی رہی۔ اس کے رویے سے صمد یار خان کو یقین ہو گیا۔ کہ وہ بھی اس سے محبت کرتی ہے۔ اور پھر ایک دن موقع پا کر وہ

وہاں سے بھاگ نکلی۔

اس دن بھی صمد یار خان اپنے گاؤں گیا ہوا تھا جہاں بابا جان پاگلوں کی طرح گل رخ کو تلاش کرتا پھر رہا تھا، انھیں یقین تھا کہ گل رخ کی گم شدگی میں صمد یار خان کا ہاتھ ہے مگر اس کے پاس کوئی ثبوت موجود نہیں تھا۔ واپسی پر جب صمد یار خان کے دوستوں نے اسے گل رخ کے بھاگ جانے کی خبر سنائی تو ایک مرتبہ تو وہ چکرا گیا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟...... مگر ایسا ہو چکا تھا۔ اپنے دوستوں کو کوستا وہ اسی وقت واپس گاؤں پہنچا کہ شاید وہ گاؤں پہنچ گئی ہو، مگر وہ اتنی بیوقوف نہیں تھی...... گاؤں میں اس کا کوئی ایسا رشتا دار موجود نہیں تھا جس پر وہ بھروسا کر سکتی، سگی خالہ پہلے دن سے اپنے بیٹے کی سائیڈ لے رہی تھی، اور یاری خان بھی اپنے بھائی کے خلاف انتہائی قدم اٹھانے کے لیے تیار نہیں تھا، جبکہ پولیس یوں بھی بکا ؤ مال تھی۔ ماں باپ سے ہاتھ دھو بیٹھنے کے بعد صمد یار خان اس سے شادی کرنے کی تیاریوں میں تھا...... یقیناً وہ جنونی اس کے پیچھے پڑا رہتا ایسا دوسری تیسری بار ہو رہا تھا کہ وہ اس کے چنگل سے چھٹکارا پا رہی تھی، ایک مرتبہ اس کی ماں اسے بچاتے ہوئے قربان ہو گئی تھی دوسری مرتبہ اس کی خالہ نے اسے بچایا تھا اور تیسری مرتبہ وہ صمد یار خان کو پیار محبت کا لالچ دے کر بھاگ رہی تھی...... چوتھی مرتبہ وہ اپنے مذموم مقصد میں کامیاب بھی ہوسکتا تھا...... اور اسی ڈر سے وہ وہاں سے دور بھاگ جانا چاہتی تھی۔ پشاور لاری اڈے سے وہ پنڈی جانے والی بس میں بیٹھی اور پھر وہاں سے بغیر کسی منصوبے کے اتفاقاً گجرات جانے والی بس میں بیٹھ گئی۔ اس کے پاس زادِ راہ کے طور پر بہت محدود رقم تھی۔ تن تنہا خوبصورت اور جوان لڑکی کا مردوں کی دنیا میں اکیلے اپنی عزت کو محفوظ رکھنا ناممکنات میں سے ہے۔ عورت ذات کو ہمیشہ مرد کے سہارے کی ضرورت رہی ہے ورنہ ہر مرد اسے مالِ غنیمت سمجھ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ صمد یار خان نے بھی سب سے پہلے اس کے سہارے کو ختم کیا تھا اور اس کے بعد اس کی عزت کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔ وہ صمد یار خان کو معاف نہیں کر سکتی تھی مگر ابھی تک گیند صمد یار خان کے کورٹ میں تھی...... لیکن اس کا اس بات پر بھی ایمان تھا کہ ہر ظالم کی رسی کھینچنے کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے...... اللہ ہر فرعون کو مہلت ضرور دیتا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی اسی رب کا قانون ہے کہ ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ بھیجتا ہے۔

گجرات سے پندرہ بیس کلو میٹر پہلے بس خراب ہوئی۔ ڈرائیور کنڈ یکٹر تو بس کو ٹھیک کرنے میں جت گئے

جبکہ سواریاں نیچے اتر کر ٹہلنے لگیں۔گل رخ بھی نیچے اتری وہاں قریب ہی اسے ایک گاؤں کے آثار نظر آ رہے تھے۔ایک اونچی سفید رنگ کی حویلی کو دیکھ کر اس کے قدم کٹی پتنگ کی طرح بے اختیار اس طرف بڑھ گئے۔ پتا ہے وہ حویلی کس کی تھی؟'' کہانی سناتے سناتے اچانک اُس نے مجھ سے سوال کیا۔

''مجھے کیا معلوم؟''میں نے حیرانی سے جواب دیا۔

''وہ میرے دادا...... چوہدری حیدر علی کی حویلی تھی......'' خاموش بیٹھے عدنان حیدر نے مداخلت کی۔

''اوہ......''میں ششدر رہ گیا تھا...... ''مطلب تمہارے دادا نے گل رخ کو پناہ دے کر صمد یار خان سے دشمنی کا دروازہ کھولا؟''

''صحیح سمجھے۔''عدنان حیدر نے اثبات میں سر ہلایا۔

''مگر اسے پتا کیسے چلا کہ گل رخ نے تمہارے ہاں پناہ لی ہے؟''

''کہانی کے اختتام پر تمھیں پتا چل جائے گا۔''داؤد خان نے میرا تجسس بحال رکھا۔

''چلو...... پھر شروع رہو......''میں نے منہ بنایا۔اور داؤد خان نے ہنستے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

''بابا جان چند ماہ تک گل رخ کو ڈھونڈتے رہے مگر انھیں ناکامی ہوئی بابا جان کی طرح صمد یار خان بھی دیوانوں کی طرح گل رخ کو تلاش کرتا رہا مگر وہ اس علاقے میں ہوتی تو اسے ملتی۔بابا جان کا دل وہاں سے اچاٹ ہو گیا تھا۔چھوٹے بھائی سے یوں بھی اس کی بول چال بند تھی۔ماں کے لیے دونوں بیٹے برابر تھے وہ کبھی بابا جان کو کوسنے لگتی جو اپنے چھوٹے بھائی کو پھانسی دلانے پر کمربستہ تھے اور کبھی صمد یار خان کو کوسنے لگتی جس کی وجہ سے یہ سارا فساد پھیلا تھا۔گھر کے کشیدہ ماحول سے تنگ آ کر بابا جان نے اپنا ٹرک بیچا اور انگلینڈ کا ویزا بنا کر اپنا علاقہ کیا ملک بھی چھوڑ دیا...... یہ سارا فساد اس کے انگلینڈ جانے کے منصوبے سے ہی پھیلا تھا،مگر اس وقت انگلینڈ جانے کا مقصد کوئی اور تھا جبکہ اب اسے حالات سے دل برداشتہ ہو کر جانا پڑا تھا۔

انگلینڈ میں انھیں چند مخلص پٹھان مل گئے جنھوں نے بابا جان کی صحیح رہنمائی کی۔بابا جان نے وہاں ٹیکسی ڈرائیور کی حیثیت سے شب روز کا آغاز کیا اور جلد ہی اپنی ٹیکسی خرید لی انھیں انگلینڈ میں سال بھر ہی ہوا تھا کہ ایک دن ایک میم صاحب جن کی کار کا ٹائر پنکچر ہوا تھا،وہ بابا جان کی ٹیکسی میں آن بیٹھی۔اور پھر ایک سادہ لوح پٹھان

کی گلابی انگریزی سے ایسی محظوظ ہوئی کہ بابا جان کو دل دے بیٹھی۔ بابا جان پختہ مسلمان تھے......ایلس کو ان سے ایسی محبت ہوئی کہ اس نے اسلام قبول کرنے میں ایک لمحہ بھی پس و پیش نہیں کی۔ ان کا نام بابا جان نے یاسمین رکھا، جو کہ میری امی جان تھیں......شادی کے ایک سال بعد میری پیدائش ہوئی، جس وقت میری عمر سات سال ہوئی بابا جان کے دل میں ماں کی محبت نے جوش مارا اور انھوں نے واپسی کی راہ لی۔ امی جان کو بھی پاکستان دیکھنے کا شوق تھا۔ یہاں آکر بابا جان نے پشاور میں پلاٹ خریدا اور ایک اعلیٰ قسم کی کوٹھی تعمیر کی اس کے ساتھ اس نے اپنا سارا پیسا ٹرانسپورٹ کے بزنس میں لگا دیا۔ اس کام میں یوں بھی اسے کافی مہارت تھی۔ صمد یار خان جو اس کے انگلینڈ جاتے وقت نوجوان تھا ابھی بھرپور جوان ہو گیا تھا......اس کا اٹھنا بیٹھنا مجرم اور غلط قسم کے لوگوں سے تھا لیکن جب اسے پتا چلا کہ اس کا بھائی انگلینڈ سے کافی کچھ کما کر لوٹا ہے تو وہ بغیر کسی جھجک کے اسے ملنے آن پہنچا، ماں کا انتقال ہوئے دو سال گزر گئے تھے۔ بابا جان نے بھی بھائی کی ساری خطائیں معاف کر کے اسے گلے سے لگا لیا گو کہ امی جان نے انھیں صمد یار خان کا پچھلا رویہ یاد دلایا پر بابا جان ہنس کر ٹال گئے۔ مگر کہتے ہیں نا کہ کم ظرف جس تھالی میں کھاتا ہے ہمیشہ اسی میں چھید کرتا ہے۔ صمد یار خان بھی چند ماہ سے زیادہ صبر نہ کر سکا اور اس کا مجرمانہ دماغ اسے مجبور کرنے لگا کہ وہ کسی طرح سے بڑے بھائی کی دولت پر قبضہ کرے۔ اس ظالم نے دولت کے حصول کے لیے گھٹیا پن کی انتہا کر دی اور ایک دن بھائی کو زہر آلود مشروب پلا دیا۔ بابا جان کی موت نے امی جان کو نیم پاگل کر دیا تھا......اور اس پاگل پن کا فائدہ اٹھا کر صمد یار خان نے اپنے بھائی کو چپکے سے دفنا دیا۔ تعزیت کے لیے آنے والوں کو اس نے بتایا کہ اس کے بھائی کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ دو تین ماہ کے اندر امی جان کی حالت کچھ سنبھل گئی اور پھر ایک دن جب صمد یار خان نے مجھے مارنے کی کوشش کی تو امی جان کو پتا چل گیا کہ اس کے شوہر کا قاتل بھی وہی ہے۔ دراصل وہ بجلی کی ننگی تار میری طرف بڑھا کر مجھے پکڑنے کی دعوت دے رہا تھا۔ امی جان نے دیکھ لیا تو صمد یار خان بہانہ بنا کر کہنے لگا کہ وہ اپنے بھتیجے سے مذاق کر رہا تھا، مگر امی جان کوئی ان پڑھ جاہل عورت نہیں تھیں۔ انھوں نے فی الفور واپسی کا فیصلہ کیا۔ اگر وہ اپنے دیور کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی کوشش کرتی تو اسے اندیشہ تھا کہ صمد یار خان اس کے اکلوتے بیٹے کو نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ ہم دونوں انگلینڈ پہنچ گئے، وہ میرے جوان ہونے کا انتظار کرنے لگی تا کہ اپنے شوہر کے قاتل سے بدلہ لے

سکے۔لیکن امی جان کی عمر نے بھی وفا نہ کی میں بمشکل اپنا تعلیمی سفر پورا کر سکا تھا کہ ان کی آنکھیں بند ہو گئیں البتہ مرنے سے پہلے وہ مجھے ساری کہانی سنا گئی تھیں۔میں نے سب سے پہلے ان کے چھوڑے ہوئے کاروبار کی دیکھ بھال کی کیونکہ اپنے دشمن سے انتقام لینے کے لیے مجھے دولت کی ضرورت تھی ......گو امی جان میرے لیے کافی کچھ چھوڑ گئی تھیں لیکن وہ صرف میری ضروریات کے لیے کافی تھا جبکہ مجھے ایک ایسے شخص کا مقابلہ کرنا تھا جو اس وقت صوبائی اسمبلی کا ممبر تھا۔اس کے بارے میں امی جان شروع دن سے باخبر رہتی تھیں۔پاکستان میں رہائش کے دنوں میں امی جان نے کافی لوگوں سے تعلقات بنائے تھے اور انھی لوگوں سے انھیں صمد یار خان کے بارے میں تازہ معلومات ملتی رہتی تھی۔میں نے امی جان کے چھوڑے ہوئے کاروبار کو کافی وسعت دی اور جب سمجھا کہ اب میں دشمن کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو گیا ہوں تو، پاکستان آ گیا......اپنا سارا سرمایا میں نے انگلینڈ سے پاکستان منتقل کیا اور ایک امپورٹ، ایکسپورٹ کمپنی کی بنیاد ڈالی ......دولت کی فراوانی نے مجھے کسی مشکل سے دوچار نہیں ہونے دیا۔کاروبار کے ساتھ ساتھ میں نے صمد یار خان کے دشمنوں کی تلاش بھی جاری رکھی کیونکہ دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔صمد خان کے دشمن تو کافی ہیں مگر ان میں کچھ تو بالکل عام سے لوگ ہیں اور کچھ سیاسی دشمن ہیں۔جو کہ اس کے خلاف کوئی انتہائی قدم نہیں اٹھا سکتے۔تنگ آ کر میں نے کچھ مجرم قسم کے آدمی تیار کیے تاکہ ہر میدان میں اسے منہ توڑ جواب دے سکوں، پھر مجھے عدنان حیدر کے چچا قربان حیدر اور والد فرمان حیدر چودھری کے بارے پتا چلا کہ وہ بھی صمد یار خان کی جان کے دشمن ہیں اس طرح اس خاندان سے بھی میری دوستی ہو گئی۔''

''لالہ داؤد!......اس ساری تفصیل میں اس کردار کا ذکر تو کہیں نہیں ہے جس کی وجہ سے آج میں ادھر موجود ہوں۔''

وہ ہنسا۔''شیر دل خان!......ابھی تک میری بات جاری ہے۔''

''ٹھیک ہے جناب۔''میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہاں سے عدنان حیدر نے بات آگے بڑھائی۔''داؤد لالہ نے گل رخ کا ذکر درمیان میں چھوڑ دیا تھا ......بس سے اتر کر وہ حیدر علی یعنی میرے دادا کی وسیع و عریض حویلی کی طرف بڑھی......اور چوکیدار کی وساطت

سے میرے دادا حیدر علی سے ملی جاگیردار ہونے کے باوجود وہ بہت اچھے انسان تھے......اس نے ایک دکھیا لڑکی کو پناہ دینے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کی تھی۔گل رخ حویلی کے ایک فرد کی طرح وہاں رہنے لگی۔ پھوپھو صالحہ، گل رخ کی گہری سہیلی بلکہ منہ بولی بہن بن گئی تھیں ان کا آپس میں برتاؤ بالکل سگی بہنوں کا سا تھا۔اسی اثناء میں پروفیسر والا واقعہ ہوا جس کی تفصیل میں بتا چکا ہوں۔

صمد یار خان بھائی کی جائیداد اور ٹرانسپورٹ کے کاروبار کا بلا شرکت غیرے مالک بن چکا تھا اس نے ٹرانسپورٹ کمپنی فروخت کر کے ساری رقم سیاست میں لگادی اور پہلی ہی بار صوبائی اسمبلی کا ممبر بن گیا۔ یہ سیٹ اس کے جرائم پر پردہ ڈالنے کے لیے کافی تھی۔

گل رخ کو چودھری حیدر علی کے گھر رہتے نو سال ہو گئے تھے۔اس نے اپنے دکھوں کی سن گن بھی کسی کو نہیں لگنے دی تھی......اسی دوران چودھری فرمان حیدر کی بیوی یعنی میری پہلی امی جان بقضائے الٰہی وفات پا گئی۔پہلی بیوی سے ابو جان کی کوئی اولاد نہیں تھی...... بیٹے کی دوسری شادی کے لیے چودھری حیدر علی کی نظرِ انتخاب گل رخ پر پڑی......وہ ایک خوش شکل اور انتہائی خوددار لڑکی تھی ...... چودھری فرمان حیدر کو بھی گل رخ بہت اچھی لگتی تھی اس لیے اس نے بغیر کسی جھجک کے والد صاحب کی رائے پر سر جھکا لیا۔گل رخ کی حالت بھی کٹی پتنگ کی سی تھی۔ گو کہ یہاں اسے پناہ مل گئی تھی مگر بغیر مرد کی رفاقت کے ساری زندگی گزارنا عورت کے لیے اتنا ہی مشکل ہے جتنا ایک مرد کے لیے بغیر عورت کے ساری عمر بتا دینا۔اس نے بھی لحظہ بھر سوچنے کے بعد اثبات میں سر ہلا دیا۔

چچا قربان حیدر باقاعدگی سے الیکشن میں حصہ لیتا تھا گو اب تک وہ اسمبلی تک رسائی حاصل نہیں کر پایا تھا مگر خاندانی پس منظر کی وجہ سے اس کا اثر رسوخ کافی زیادہ تھا۔بڑے بھائی کی شادی میں اس نے کافی جاننے والوں کو دعوت دی تھی، بد قسمتی سے ان لوگوں میں صمد یار خان بھی شامل تھا۔نکاح کی تقریب کے لیے حویلی کے وسیع و عریض لان میں خوبصورت شامیانے اور قناتیں لگائی گئی تھیں۔اور جب نکاح کے لیے گل رخ سج سنور کر وہاں پہنچی تو صمد یار خان کے دل کی دھڑکن بے ربط ہونے لگی اس نے گل رخ کو پہچان لیا تھا......اور اس کے بعد ناممکن تھا کہ وہ خاموش رہتا......نکاح سے پہلے وہ چودھری قربان حیدر کو اکیلے میں لے جا کر بتانے لگا کہ گل رخ

اس کی خالہ زاد ہے اور کس طرح وہ گھر سے بھاگ کر وہاں پہنچی ہوئی ہے......اس لیے بہتر یہی ہے کہ گل رخ کو اس کے حوالے کر دیا جائے۔

چودھری قربان حیدر بے غیرت نہیں تھا......مگر صمد یار خان کے رتبے کو دیکھتے ہوئے اس نے کہا کہ وہ صبر کرے پہلے وہ گل رخ سے سب کچھ پوچھے گا پھر اس کے بعد اسے جواب دے گا۔باپ اور بڑے بھائی کو ساتھ لے کر اس نے گل رخ کو اکیلے میں بلایا، دیکھنے والوں نے سمجھا کہ کسی خاندانی رسم کی وجہ سے دلہن کو لے جایا جارہا ہے اس لیے کسی نے اس بات پر توجہ نہیں دی تھی۔

جب گل رخ سے قربان حیدر نے صمد یار خان کی بابت دریافت کیا تو پہلے تو وہ ہکا بکا رہ گئی کہ انھیں کیسے اس بارے پتا چلا، بعد میں روتے ہوئے اس نے ساری کہانی ان کے سامنے دہرا دی۔

''اس کی اتنی جرأت؟''چودھری حیدر علی غصے سے بھڑک اُٹھا......اس نے اسی وقت صمد یار خان کو وہیں بلا کر کھری کھری سنا دیں......صمد یار خان نکاح کی تقریب میں شمولیت اختیار کیے بغیر وہاں سے دفع ہو گیا، لیکن جاتے جاتے وہ بھی ہمارے خاندان کو بدلہ لینے کی دھمکی دے گیا تھا۔نکاح کی تقریب ہوئی مہمان رخصت ہو گئے۔رخصتی کی تقریب ایک ہفتے بعد ہونی تھی۔اس سے پہلے صمد یار خان نے کچھ غنڈوں کے ساتھ ہماری حویلی پر حملہ کیا مگر بابا جان اور چچا غافل نہیں تھے۔انھوں نے صمد یار خان کو بھرپور جواب دیا اور صمد یار خان کو اپنے دو ساتھیوں کی لاشیں چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔البتہ اس فائرنگ میں ایک گولی دادا جان کو بھی لگی تھی جو بعد میں ان کی موت کا باعث بن گئی۔

رخصتی کی تقریب اپنے وقت پر ہوئی صمد یار خان انگاروں پر لوٹتا رہا۔گل رخ اس کے ہاتھوں سے نکل گئی تھی۔اور بدلے میں ایک ایسی دشمنی اس کے حوالے کر گئی تھی کہ دشمن نہ صرف اُس کی ٹکر کے تھے بلکہ خاندانی لحاظ سے بھی اُس سے برتر تھے۔

چودھری فرمان حیدر ایک اچھا شوہر ثابت ہوا تھا۔شادی کے سال بھر بعد اللہ تعالیٰ نے انھیں ایک پیارے سے بیٹے سے نوازا جس کا نام گل رخ نے عدنان حیدر رکھا جب عدنان چند ماہ کا ہوا تو گل رخ نے اپنے شوہر سے صالحہ کے محبوب ارشد زمان کے متعلق دریافت کیا، وہ ابھی تک اپنی عزیز از جان سہیلی صالحہ کو نہیں بھلا سکی تھی

اس کی خالہ زاد ہے اور کس طرح وہ گھر سے بھاگ کر وہاں پہنچی ہوئی ہے...... اس لیے بہتر یہی ہے کہ گل رخ کو اس کے حوالے کر دیا جائے۔

چودھری قربان حیدر بے غیرت نہیں تھا...... مگر صمد یار خان کے رتبے کو دیکھتے ہوئے اس نے کہا کہ وہ صبر کرے پہلے وہ گل رخ سے سب کچھ پوچھے گا پھر اس کے بعد اسے جواب دے گا۔ باپ اور بڑے بھائی کو ساتھ لے کر اس نے گل رخ کو اکیلے میں بلایا، دیکھنے والوں نے سمجھا کہ کسی خاندانی رسم کی وجہ سے دلہن کو لے جایا جا رہا ہے اس لیے کسی نے اس بات پر توجہ نہیں دی تھی۔

جب گل رخ سے قربان حیدر نے صمد یار خان کی بابت دریافت کیا تو پہلے تو وہ ہکا بکا رہ گئی کہ انھیں کیسے اس بارے پتا چلا، بعد میں روتے ہوئے اس نے ساری کہانی ان کے سامنے دہرا دی۔

"اس کی اتنی جرأت؟" چودھری حیدر علی غصے سے بھڑک اُٹھا...... اس نے اسی وقت صمد یار خان کو وہیں بلا کر کھری کھری سنا دیں...... صمد یار خان نکاح کی تقریب میں شمولیت اختیار کیے بغیر وہاں سے دفع ہو گیا، لیکن جاتے جاتے وہ بھی ہمارے خاندان کو بدلہ لینے کی دھمکی دے گیا تھا۔ نکاح کی تقریب ہوئی مہمان رخصت ہو گئے۔ رخصتی کی تقریب ایک ہفتے بعد ہونی تھی۔ اس سے پہلے صمد یار خان نے کچھ غنڈوں کے ساتھ ہماری حویلی پر حملہ کیا مگر بابا جان اور چچا غافل نہیں تھے۔ انھوں نے صمد یار خان کو بھرپور جواب دیا اور صمد یار خان کو اپنے دو ساتھیوں کی لاشیں چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ البتہ اس فائرنگ میں ایک گولی دادا جان کو بھی لگی تھی جو بعد میں ان کی موت کا باعث بن گئی۔

رخصتی کی تقریب اپنے وقت پر ہوئی صمد یار خان انگاروں پر لوٹتا رہا۔ گل رخ اس کے ہاتھوں سے نکل گئی تھی۔ اور بدلے میں ایک ایسی دشمنی اس کے حوالے کر گئی تھی کہ دشمن نہ صرف اُس کی ٹکر کے تھے بلکہ خاندانی لحاظ سے بھی اُس سے برتر تھے۔

چودھری فرمان حیدر ایک اچھا شوہر ثابت ہوا تھا۔ شادی کے سال بھر بعد اللہ تعالیٰ نے انھیں ایک پیارے سے بیٹے سے نوازا جس کا نام گل رخ نے عدنان حیدر رکھا جب عدنان چند ماہ کا ہوا تو گل رخ نے اپنے شوہر سے صالحہ کے محبوب ارشد زمان کے متعلق دریافت کیا، وہ ابھی تک اپنی عزیز از جان سہیلی صالحہ کو نہیں بھلا سکی تھی

۔تھوڑی سی پس وپیش کے بعد چودھری فرمان نے اس سے وعدہ کرلیا کہ وہ ضرور اسے ڈھونڈے گا۔اور پھر اپنے وعدے کے مطابق اس نے پروفیسر کو ڈھونڈ لیا۔پروفیسر نے شادی کرلی تھی اور انھی دنوں ایک پیاری سی بیٹی کا باپ بنا تھا۔

''ٹھیک ہے فرمان!......یہ لڑکی ہماری بہو بنے گی۔''

فرمان نے کہا۔''میں کس منہ سے پروفیسر سے اس کی بیٹی مانگوں گا؟''

''آپ کو زحمت کی ضرورت نہیں ہے......پروفیسر کی بیٹی کا دل جیتنے کے لیے ہمارا بیٹا خود جائے گا۔''امی جان نے فیصلہ صادر فرمایا۔

فرمان حیدر ہنستے ہوئے بولا۔''جیسے تمھاری مرضی بیگم صاحبہ!میں کیا کرسکتا ہوں؟''

شادی کے چند سال تک تو صمد یار خان نے دو تین بار ہماری حویلی پر چڑھائی کی مگر اسے منہ کی کھانی پڑی ،اس بار اس کا واسطہ خود سے تگڑے دشمن سے پڑا تھا،مگر وہ اتنی جلدی ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھا،وہ کمینہ اور گھٹیا طبیعت کا شخص تھا۔لومڑی کی طرح مکار اور اونٹ کی طرح کینہ رکھنے والا۔اس نے تہیہ کرلیا تھا کہ وہ ہمارے خاندان سے ضرور بدلہ لے گا۔

عدنان کی پیدائش کے پانچ سال بعد چودھری فرمان حیدر کے ہاں ایک خوبصورت بچی نے جنم لیا جس کا نام اس نے سائرہ رکھا،میرا نام امی جان نے رکھا تھا،گڑیا کا ابو جان نے خود رکھا۔سائرہ نہایت خوب صورت اور ذہین بچی تھی۔تمام گھر والوں کی لاڈلی......جب وہ جوان ہوئی تو ایک رات اس نے خواب دیکھا کہ ایک کالے رنگ کا ناگ اس کا پیچھا کر رہا ہے......اور وہ تیزی سے نامعلوم سمت بھاگ رہی ہے،پھر ایک جوان وہاں پہنچ جاتا ہے سانپ کو دیکھ کر وہ نوجوان بھی بھاگنے لگتا ہے اسی دوران سائرہ گر جاتی ہے......سانپ اسے ڈسنے ہی والا ہوتا ہے کہ بھاگنے والا نوجوان ایک دم پلٹتا ہے اور سانپ کو گردن سے پکڑ کر اس کا سر پتھر پر رگڑ کر اسے ہلاک کردیتا ہے اور خود وہاں سے چلا جاتا ہے......سائرہ پہلے تو خوف کے مارے اپنی جگہ سن کھڑی ہوتی ہے پھر سانپ کے ہلاک ہوتے ہی اس کے اوسان اپنی جگہ پر آتے ہیں اور وہ نوجوان کو آواز دینے کی کوشش کرتی ہے مگر اس کے حلق سے آواز برآمد نہیں ہوتی......وہ اس نوجوان کا پیچھا کرتی ہے وہ نوجوان ایک وادی میں داخل

ہوتا ہے...... وہ بھی اس کے پیچھے وہیں داخل ہو جاتی ہے...... وہاں کا منظر نہایت خوب صورت اور دل موہ لینے والا ہوتا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ پھولوں کے ایک خوبصورت کنج کو عبور کر کے وہ تھوڑا مزید آگے بڑھتی ہے تو اسے وہ نوجوان ایک خوب صورت چشمے کے کنارے کھڑا نظر آتا ہے۔ وہ اس کی طرف بڑھتی ہے، مگر اس وقت اس کے لب قوت گویائی سے محروم ہو جاتے ہیں، اس کے چہرے پر افسردگی کے آثار نمودار ہوتے ہیں...... وہ نوجوان بھی بولنے کی کوشش کرتا ہے مگر بول نہیں پاتا...... یہ بے بسی کی انتہا تھی کہ وہ اپنے مسیحا سے بات نہیں کر پاتی، اس کی آنکھوں میں آنسو نمودار ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ پہلی بار تو اس خواب کو توجہ کے قابل نہیں سمجھتی مگر جب یہ خواب ایک تسلسل سے نظر آنے لگتا ہے تو مجبوراً وہ اپنی ماں کو بتاتی ہے، امی جان بھی پریشان ہو جاتی ہیں، وہ سب کچھ بابا جان کو اور مجھے بتا دیتی ہیں...... اس وقت تک عاتکہ میری بیوی بن کر گھر آ چکی ہوتی ہے...... عاتکہ کے مشورے پر ہم نے ایک کمپیوٹر کے ماہر سے سائرہ کے خوابوں میں آنے والے نوجوان کی تصویر بنائی تا کہ اسے پہچانا جا سکے مگر وہ ایک انجان آدمی تھا۔ تم یقیناً اس کی تصویر دیکھنا چاہو گے......؟" عدنان نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک تصویر نکال کر میری جانب بڑھائی

...... میں حیران رہ گیا تھا کیونکہ وہ تصویر میری ہی تھی۔

"یہ...... یہ...... تو...... میں ہوں۔" میں نے حیرت زدہ انداز میں جواب دیا۔

"ہاں بالکل تم ہو...... اور جو تصویر تم نے اخبار میں چھپوائی تھی وہ میری چھوٹی بہن سائرہ کی تھی۔

"سائرہ کہاں ہے؟" میرے لہجے میں بے صبری تھی۔

"اسے صمد یار خان نے اغواء کر لیا ہے۔" عدنان نے بے بسی سے سر ہلایا۔

"کیا اس کے بدلے کی تان ایک معصوم لڑکی کے اغوا پر آن ٹوٹی۔" میرے لہجے میں شامل غیظ و غضب مجھے خود حیران کر گیا تھا۔

داؤد خان کہنے لگا۔" گل رخ کی شادی کے کچھ عرصہ بعد صمد یار خان نے بھی شادی کر لی تھی...... اور اس نے عہد کیا تھا کہ چودھریوں کے خاندان کی کسی عورت کو زبردستی اپنی بیوی بنائے گا...... اس کی وہ قسم تو پوری نہیں ہو سکی کہ اس کی عمر اب ساٹھ سے تجاوز کر گئی ہے، البتہ اپنے بیٹے کے لیے جو ابھی تک جوان نہیں ہوا، اس نے سائرہ

کو اغوا کرالیا ہے اور جیسے ہی وہ جوان ہوگا صمد یار خان اپنی قسم پوری کرے گا۔“

”پہلے سے اغوا کرانے کی وجہ؟“

عدنان بولا۔”اس ڈر سے کہ ہم اسے کسی اور جگہ نہ بیاہ دیں...... حالانکہ وہ ابھی فرسٹ ایئر کی طالبہ ہے۔“

”کیا آپ لوگوں نے اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی؟“

داؤد خان نے کہا۔”بغیر کسی ثبوت کے ہم کیا کارروائی کر سکتے تھے...... اگر اس پر حملہ کرتے تو جوابی کارروائی میں وہ سائرہ کو جانی نقصان پہنچا سکتا تھا۔“

”اچھا آپ لوگ مجھ تک کیسے پہنچے؟“ میں نے ذہن میں مچلتا سوال پوچھا۔

”تمھارے بھائی اور والد کی صمد یار خان سے ہونے والی لڑائی کی خبر مجھ تک بھی پہنچ گئی تھی۔اس کے ساتھ تمھارے بارے بھی پتا چلا تھا کہ لڑائی جھگڑے سے دور رہنے والے بلکہ لڑائی جھگڑے کو بزدلی کی حد تک ناپسند کرنے والے ہو،لیکن اس وقت تک ہم تمھاری شکل سے ناواقف تھے...... پھر تم صلح کرنے کے لیے صمد یار خان کے بنگلے پر گئے مگر وہاں تمھارے ساتھ نہایت افسوس ناک واقعہ پیش آیا۔“

”اس بارے میں تمھیں کیسے پتہ چلا......؟“ میں نے قطع کلامی کی۔

”شیر دل خان...... دشمن سے مقابلے کا پہلا اصول یہی ہے کہ آپ اس پر برابر نظر رکھے ہوئے ہوں ......اور دشمن پر نظر رکھنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اس کے کسی اہم آدمی کو خرید لیا جائے۔“

”گویا اس کے آدمیوں میں تمھارا کوئی ساتھی موجود ہے؟“

”ساتھی تو نہیں ہے...... بس اس کے ایک ساتھی کو ہڈی ڈال کر اس سے صمد یار خان کے بارے ضروری معلومات حاصل کر لیتا ہوں۔“

”تو پھر اس آدمی نے سائرہ کی بات نہیں بتائی؟“

”کیوں نہیں بتائی...... مگر وہ کوئی ثبوت تو نہیں ہے ناں؟...... یوں بھی وہ ہمارے لیے عدالت میں گواہی دینے سے تو رہا؟“

”کیا اس نے سائرہ کے قید ہونے کی جگہ نہیں بتائی؟“

داؤد خان نے نفی میں سر ہلایا۔ ’’نہیں...... اس بارے میں اسے بھی کچھ معلوم نہیں۔‘‘

’’اسے کب اغوا کیا گیا؟‘‘

’’جس دن تم صدیار خان سے صلح کی بات کرنے گئے تھے اس سے دو دن پہلے یہ واقعہ ہوا۔‘‘

’’سمجھ گیا۔‘‘ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔ ’’تم کچھ بتا رہے تھے؟‘‘

وہ دوبارہ تفصیل بتانے لگا۔ ’’پھر تم نے اخبار میں اشتہار شائع کرایا...... جس میں سائرہ کی تصویر بھی شائع ہوئی...... وہ اشتہار جیسے ہی عدنان کی نظر سے گزرا وہ میرے پاس دوڑتا چلا آیا...... مجھے سائرہ کی بابت وہ تفصیل سے بتا چکا تھا ...... پس میں نے اپنے ایک ملازم کو حکم دیا کہ وہ تم سے رابطہ کرے...... اس وقت تک ہمارے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ تم ہو خیر میرے آدمی نے تم سے بات کر کے اس بات کی تصدیق کر دی کہ اشتہار شائع کرانے والے کا فون آن ہے...... بس میں نے اس نمبر کو ٹریس کرایا تو پتا چلا کہ وہ تو ان رجسٹرڈ نمبر ہے البتہ جس فون میں استعمال ہو رہا ہے اس فون میں ایک اور کنکشن بھی استعمال ہو رہا ہے جو شیر دل خان کے نام پر ہے ...... دو اور دو چار کی طرح آپ کی شخصیت ہمارے سامنے کھل گئی اور ہم اس عجیب اتفاق پر حیران رہ گئے۔‘‘

’’موبائل فون کے نمبر سے مجھے ٹریس کیا......؟‘‘ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

’’عجیب بات ہے...... تمہیں نہیں معلوم؟‘‘

’’نہیں......‘‘ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

’’ہر موبائل کا ایک ایمی نمبر ہوتا ہے...... ہم جب بھی کسی سم کو ایک موبائل فون میں استعمال کرتے ہیں تو بہت آسانی سے پتا چل جاتا ہے کہ یہ سم کس موبائل فون میں استعمال ہو رہی ہے۔ اسی طرح اگر موبائل فون کا ایمی نمبر معلوم ہو تب بھی پتا چل جاتا ہے کہ اس موبائل فون میں کون سی سم استعمال ہو رہی ہے۔‘‘

میں نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے پوچھا۔ ’’اور اس طرح تمہیں میرے بارے پتا چل گیا؟‘‘

’’جی ہاں...... پھر مجھے اچانک ایک ضروری کام سے کراچی جانا پڑ گیا اور میں نے اپنے دست راست سلیم کو بتایا کہ تمہیں کسی بہانے پشاور سے یہاں بلا لے...... البتہ اصل بات نہ بتائے، یوں بھی وہ اصل بات سے لاعلم تھا...... اب مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ بیوقوف تمہیں دشمن سمجھ لے گا...... خیر اپنی بیوقوفی کے ہاتھوں اسے جان سے

ہاتھ دھونے پڑے، وہ تمھیں آخر تک بزدل سمجھتا رہا۔‘‘

’’بزدل تو میں تھا......‘‘میں نے اثبات میں سر ہلایا...... ’’مگر حالات نے مسلسل ایسے جھٹکے دیئے کہ میری بزدلی کو کہیں غائب ہونا پڑا۔‘‘

میرے انداز پر وہ دونوں مسکرا دیے۔

’’اچھا اب تمھارا کیا ارادہ ہے؟‘‘ داؤد خان نے پوچھا۔

’’لالا جی!......عدنان بھائی سے معذرت کرتے ہوئے کہوں گا کہ، اس سے پہلے بھی میری زندگی کا مقصد اپنے خوابوں میں آنے والی معصوم صورت دوشیزہ کی تلاش تھی......اب تو میں اس کے بارے سب جان گیا ہوں ......اور میرا ارادہ اتنی جلدی نہیں بدلا کرتا۔‘‘

’’گویا صمد یار خان کے خلاف ہمارا ساتھ دو گے۔‘‘

’’نہیں......‘‘میں نے نفی میں سر ہلایا...... ’’وہ اکیلا تمہارا دشمن نہیں ہے......میرا بھی دشمن ہے......سائرہ کو اغوا کرنے کی وجہ سے، میری عزت نفس مجروح کرنے کی وجہ سے اور میرے بابا جان اور بھائی کے ساتھ جھگڑا کرنے کی وجہ سے بھی گویا میرے پاس اسے قتل کرنے کے لیے ایک سے زائد وجوہات موجود ہیں۔ لہٰذا تم لوگ میرے ساتھ ہوئے نہ کہ میں تمہارے ساتھ ہوا۔ یہ تم لوگوں کا مجھ پر احسان ہے۔ لہٰذا میں ممنون ہوں تم لوگوں کا۔‘‘

’’اعلیٰ ظرفی ہے تمہاری......‘‘ عدنان محبت سے بولا۔ جبکہ داؤد خان نے مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

’’اچھا اب کیا لائحہ عمل ہوگا؟‘‘ میں نے داؤد خان سے علیحدہ ہو کر پوچھا۔

’’سب سے پہلے تو تم گھر جاؤ......اپنے والد اور بھائی کی خیر خبر لو......پھر ہم چچا جان اور مہر دل خان کو بھی اس مشورے میں شامل کریں گے۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘میں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔’’ڈنر کر کے میں نکل جاؤں گا۔‘‘

☆......☆......☆

راشد کو میں نے اپنی واپسی کے بارے میں مطلع کر دیا تھا وہ بڑی بے صبری سے میرا منتظر تھا۔ میرے پاس

اپنی جیپ موجود تھی اس لیے ٹرانسپورٹ کی کوئی پرابلم نہیں تھی۔ پر تکلف ڈنر کر کے میں وہاں سے نکل آیا تھا۔ داؤد خان اور عدنان حیدر نے بڑی محبت سے مجھے رخصت کیا تھا۔ تین گھنٹوں کی تیز ڈرائیونگ کے بعد میں پشاور پہنچ گیا تھا۔

''ہاں بھئی!......رستا کیسے کٹا؟'' گھر کا دروازہ راشد ہی نے کھولا تھا۔

''رستا کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جاتا ہے یار! بس قدم نہیں رکنے چاہییں۔''

''ڈنر تو کر کے ہی آئے ہوں گے؟''

''بالکل......اور ابھی میں کافی تھکا ہوا ہوں......تھوڑی دیر آرام کروں گا۔''

''ناممکن......'' اس نے انکار میں سر ہلایا۔ ''جب تک میں ساری تفصیل نہیں سن لیتا تم نہیں سو سکتے۔''

''میں بہت تھکا ہوا ہوں؟'' اس کے بیڈ پر لمبا پڑتے ہوئے میں نے جان چھڑانے کی آخری کوشش کی۔

''کوئی بات نہیں......میں بھی تھکا ہوا ہوں......تم بولنا شروع کر دو میں کافی منگوا لیتا ہوں نیند ایک منٹ میں غائب ہو جائے گی۔''

میں کراہتے ہوئے اٹھ بیٹھا......اس نے حنا کو آواز دے کر دو کپ کافی لانے کا کہا اور میری طرف متوجہ ہو گیا۔ رات کا بقیہ حصہ مجھے اس کے ساتھ گپ شپ میں گزارنا پڑا۔ صبح کی اذان کے وقت تک میں اسے ساری کہانی سنا چکا تھا، نماز پڑھ کر میں نے دو تین گھنٹے آرام کیا کہ تھکن سے میری آنکھیں بند ہو رہی تھیں اور اس کے بعد میں نے فریش ہو کر ناشتا کیا اور گاؤں جانے کے لیے تیار ہو گیا......گھر سے آئے مجھے بمشکل دو ہفتے ہوئے تھے مگر یوں لگ رہا تھا کہ جانے کتنے عرصے سے میں گھر سے باہر ہوں، اس سے پہلے میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے ہاسٹل میں کافی ٹائم گزار چکا تھا مگر اس طرح گھر سے دوری مجھے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

''میں ساتھ چلوں؟'' راشد نے پرخلوص لہجے میں آفر کی۔

''نہیں یار!......جب تمھاری ضرورت ہوئی تو ضرور بتاؤں گا؟''

''اپنا خیال رکھنا......'' اس نے مجھ سے الوداعی مصافحہ کیا......میں نے برآمدے کی طرف نگاہ دوڑائی وہاں حنا کرسی پر بیٹھی بظاہر صحن میں لگے درخت کی طرف متوجہ تھی، مگر مجھے معلوم تھا حقیقت میں وہ مجھے دیکھ رہی تھی

۔افسردہ انداز میں سرہلاتے ہوئے میں جیپ میں بیٹھ گیا۔
ظہر کے وقت میں اپنے گاؤں پہنچ گیا۔امی جان نے مجھے دیکھتے ہی اپنے ساتھ لپٹایا اور ماتھے پر بوسہ دیتی ہوئے پوچھنے لگیں۔
”شیر دل اتنے دن سے کہاں غائب تھے...... پتا ہے تیرے بابا جان بہت پریشان تھے تیرے لیے۔“
”یہ نہیں ہوسکتا مور جان !......“میں نے نفی میں سرہلایا۔”اگر وہ پریشان تھے تو کال کرکے میرا پوچھ سکتے تھے......میں چند گھنٹوں کی مسافت پر ہی تو تھا۔“
زرغونہ بولی۔”لالہ!......مور جان ٹھیک کہہ رہی ہیں......بابا جان آپ کے جانے کے بعد بہت خفا تھے مگر بظاہر انجان بنے رہے۔“
”زرغونہ!......میں جانتا ہوں بابا جان ہمیں بہت چاہتے ہیں......مگر میری طبیعت ایسی بزدلانہ تھی کہ وہ مجھ سے ہمیشہ خفا رہے۔“
”لالہ!......یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں......آج تک آپ خود کو امن پسند کہتے رہے آج ایک دم بزدل کہنا شروع کردیا۔“زرغونہ کے لہجے میں حیرانی تھی۔
”صحیح کہہ رہا ہوں زرغونہ!......میں اپنی بزدلی پر امن پسندی کا پردہ ڈالتا رہا ورنہ فائر کی آواز سن کر کوئی امن پسند بے ہوش نہیں ہوسکتا اور نہ امن پسند اپنی مردانگی کو چوڑیاں پہناتا ہے؟“میرے لہجے میں دکھ کی آمیزش تھی۔
”چوڑیاں......؟“زرغونہ نے حیرانی سے پوچھا جبکہ مور جان سر جھٹکتی کچن کی طرف بڑھ گئیں میری اور زرغونہ کی گفتگو میں وہ کم ہی حصہ لیتی تھیں۔
”تم نہیں سمجھو گی زرغونہ......یہ بتاؤ بابا جان کہاں ہیں؟“میں اسے اپنی بزدلی کے قصے تو نہیں سنا سکتا تھا ناں؟
”وہ حجرے میں ہیں،کل پھر اس خبیث آدمی کے چمچوں سے فائرنگ کا تبادلہ ہوا ہے......“زرغونہ کا اشارہ صمد یار خان کے آدمیوں طرف تھا۔”آج بابا جان نے علاقے کے سرکردہ افراد کا جرگہ بلایا ہوا ہے۔“
”ٹھیک ہے۔“میں سرہلاتا ہوا بابا جان کے کمرے کی طرف بڑھا جہاں اس کی چارپائی کے اوپر ایک نئی

رشین کلاشنکوف لٹکی ہوئی تھی۔ یہ کلاشن کوف باباجان نے میری تعلیم مکمل ہونے کے بعد مجھے تحفہ دینے کے لیے خریدی تھی اور میں نے باباجان کا یہ تحفہ قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔اس کلاشن کوف کے ہمراہ ایک خوبصورت بریٹا پسٹل بھی تھا جو باباجان نے بڑی چاہت سے افغانستان سے منگوایا تھا...... یہ وہ پسٹل تھا جو کسی امریکی فوجی کو جہنم واصل کر کے چھینا گیا تھا...... چونکہ اس کی قیمت کلاشن کوف سے بھی تین چار گنا زیادہ تھی اس لیے جس کے ہاتھ بھی ایسی چیز لگتی وہ بیچ کر دام کھرے کرنے کی کوشش کرتا...... جبکہ دولت مند اور شوقین افراد ہاتھوں ہاتھوں خرید لیتے۔ باباجان نے یہ بھی میرے لیے ہی منگوایا تھا۔پسٹل اور کلاشن کوف کے بارے میں یہ معلومات مہردل نے میرے گوش گزار کی تھیں...... مہردل اپنے اکھڑ مزاج کے باعث باباجان کو پسند ضرور تھا مگر جتنی محبت باباجان کے دل میں میرے لیے تھی وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آئی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ میری بزدلی کے باعث ان کے دل کی گہرائیوں میں پنہاں رہتی تھی۔

کمرے میں باباجان کے وجود کی خوشبو پھیلی تھی...... میں نے سب سے پہلے باباجان کا ذاتی ٹرنک کھول کر بریٹا پسٹل باہر نکالا اسے ہولسٹر سے نکالتے ہی میرا دل عجیب سے انداز میں دھڑکنے لگا لکڑی کا دستہ اور ٹھنڈی فولادی نال...... وزن میں ہلکا مگر کارکردگی میں بے مثال...... جبکہ اس کی شکل مخالف کا پتا پانی کرنے والی تھی۔اس کے ہولسٹر میں دو میگزینوں کی جگہ تھی ایک میگزین کافی لمبی تھی یقیناً اس میں عام میگزین کی نسبت زیادہ گولیاں آتی ہوں گی جبکہ دوسری میگزین پسٹل میں لگی میگزین جتنی تھی۔تینوں میگزینیں راؤنڈز سے فل تھیں۔ ہولسٹر کمر سے باندھ کر میں نے دیوار سے لٹکی کلاشن کوف اتاری اور کندھے سے لٹکا کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ زرغونہ صحن میں مرغیوں کو دانہ ڈال رہی تھی، مجھے دیکھ کر اس کی بڑی بڑی آنکھیں حیرت پھٹنے کے قریب ہو گئیں۔

''لالہ!......'' وہ چیخ پڑی تھی۔

''گڑیا!......آپ لوگ مجھے اسی روپ میں دیکھنے کے خواہش مند تھے ناں؟''

وہ بھاگ کر میرے قریب آئی اور مجھ سے لپٹتے ہوئے بولی......''بھائی بہنوں کو ہر حالت میں پیارے ہوتے ہیں......مگر جب وہ محافظ کی شکل میں نظر آئیں تو بہنیں زیادہ تحفظ محسوس کرتی ہیں۔''

''پگلی ہے تو!......'' میں نے مسکرا کر اس کے سر پر ہلکی سے چپت لگائی اور گھر سے باہر نکل آیا۔رستے میں میرا

سامنا کسی سے نہیں ہوا تھا۔حجرے کے قریب پہنچا تو میری سماعتوں میں مختلف قسم کی اونچی نیچی آوازوں کا شور گونجنے لگا۔میں چند لمحوں کے لیے حجرے کے دروازے پر رک گیا......اس حالت میں اندر جانا مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔بابا جان بڑے زوروشور سے صمد یار خان کی بدمعاشیوں کا ذکر رہے تھے......

''وہ صمد یار خان جو کبھی ایک تھرڈ کلاس چور اور اٹھائی گیرا ہوا کرتا تھا آج ایم پی اے بن کر علاقے کے سرداروں کے گلے پڑ رہا ہے۔ایسا شخص جو اپنے سگے بھائی تک کو قتل کر سکتا ہو وہ کسی اور کا کیا لحاظ کرے گا......ایسے نیچ اور کمینے شخص سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔''

بابا جان کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ جو کہانی مجھے لالہ داؤد خان نے سنائی ہے اس میں شک کی گنجائش بالکل نہیں ہے۔اور بابا جان کو پہلے سے صمد یار خان کے کرتوتوں کا علم ہے......البتہ میں اسے بطور ایم این اے اور بدمعاش کے تو جانتا تھا۔یہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ اپنے بھائی کا بھی قاتل ہے۔

''خان جی!......جرگے کی کارروائی کافی دیر سے شروع ہوئی ہے اور اب تک آپ کا بڑا بیٹا نظر نہیں آ رہا؟......حالانکہ اس کی یہاں موجودگی لازمی ہے۔'' یہ سوال ساتھ والے گاؤں کے مشر (سردار) نے کیا تھا۔اس کا نام سردار بسل جان تھا۔اور اس سے دو تین بار بابا جان کی تلخ کلامی بھی ہو چکی تھی......لازماً میری بزدلی کے قصے اس تک پہنچ چکے تھے اور وہ بابا جان کی سرعام ہتک کرنا چاہتا تھا۔یوں بھی کسی سردار زادے کی بزدلی صیغہ راز میں نہیں رہ سکتی۔بابا جان ایک دم خاموش ہو گئے۔میں جانتا تھا کہ بابا جان کبھی جھوٹ نہیں بولتے اور اس وقت سچ بولنا گویا اپنی عزت کا جنازہ نکلنے کے مترادف تھا۔میں اس حسین اتفاق پر حیران رہ گیا کہ......یہ سوال وہ چند لمحے پہلے بھی پوچھ سکتا تھا مگر یقیناً رب تعالیٰ کو بابا جان کی عزت رکھنا مقصود تھا اس لیے اس نے یہ سوال اس وقت کیا جب میں دروازے پر گومگو کی کیفیت میں کھڑا اندر جانے اور نہ جانے کی سوچوں میں غلطاں تھا۔

میں زیادہ دیر تک بابا جان کو اذیت بھری سوچوں کے حوالے نہیں کر سکتا تھا شاید وہ اس وقت یہی سوچ رہے ہوں گے کہ اگر میرا بڑا بیٹا یہاں موجود ہوتا تب بھی وہ اس جرگے میں شامل نہ ہوتا۔دروازہ کھول کر میں ایک دم اندر داخل ہوا۔

''اسلام علیکم!......'' میں نے زوردار لہجے میں سلام کرتے ہوئے کہا۔''معافی چاہتا ہوں بابا جان مجھے

تھوڑی سی دیر ہوگئی ہے۔"

☆......☆......☆

بابا جان کا منہ کھلا رہ گیا تھا۔وہ میری جانب یوں حیرانی سے دیکھ رہے تھے گویا میں ان کا بیٹا نہیں، دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہوں......حاضرین محفل میں بھی زیادہ تر کے چہرے پر تعجب کے آثار ہویدا تھے......اوراس کی وجہ میرے کندھے سے لٹکی ہوئی کلاشن کوف تھی جس کی بیرل کسی قلم کی طرح ترشی ہوئی تھی......گو اس گن سے میں صحیح طریقے سے فائر کرنا بھی نہیں جانتا تھا لیکن میرا لمبا تڑنگا قد اور صحت مند جسم کلاشن کوف کے ساتھ بہت بارعب نظر آرہا تھا۔بچپن میں بابا جان مجھے رائفل اور پستول سے کئی بار فائر کرا چکے تھے مگر جب سے میں ہاسٹل گیا تھا مجھے ہتھیار کو چھونا تو کیا دیکھنا بھی گوارا نہیں تھا۔

"شیر دل!......تو آگیا ہے۔"بابا جان ایک جھٹکے سے اٹھے اور دونوں بازو پھیلا کر میری جانب بڑھے ......فرط مسرت سے ان کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔

"ہاں بابا جان!......ابھی ابھی پہنچا ہوں۔"میں ان کی پرشفقت آغوش میں سماتے ہوئے بولا۔

"آؤ بیٹھو......"انھوں نے میرے ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے مجھے اپنی نشست کی طرف کھینچا......ان کے لہجے میں اب بھی حیرانی جھلک رہی تھی......مگراس محفل میں وہ کوئی ایسا سوال کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے جس سے ان کی حیرانی دور ہوسکتی۔

میں نے ان کی بغل میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"بابا جان!......ایک چھوٹے سے مسئلے کے لیے اتنے معزز سرداروں کو زحمت دینے کی کیا ضرورت تھی؟"

"بابا کی جان!......یہ کوئی چھوٹا مسئلہ نہیں ہے؟"بابا جان کے لہجے میں شامل محبت میرے لیے ایک انوکھا تجربہ تھا۔

"بابا جان!......ایک تھرڈ کلاس اچکے کے لیے ہم دونوں بھائی اور آپ کی دعائیں کافی ہیں۔"میرے لہجے میں شامل اعتماد محفل میں موجود غیروں کے ساتھ میرے اپنوں کے لیے بھی حیران کن تھا۔"بہر حال اگر آپ نے ان معزز سرداروں کو مشورے کے لیے بلایا ہے تو بہت بہتر کیا ہے......ان کی وجہ سے باقیوں کو بھی پتا چل جائے گا

کہ اس سارے فساد کی جڑ ایک نام نہاد ایم پی اے ہے۔"

بابا جان مسکرائے۔ "شیر دل خانا!......تم نہیں تھے ناں......؟ ایک تمھاری کمی پوری کرنے کے ان تمام کو اکٹھا کیا تھا......اب تم آ گئے ہو تو انھیں احترام سے رخصت کیے دیتا ہوں یوں بھی میں اپنا مسئلہ انھیں بیان کر چکا ہوں ......اب تو بس فیصلہ سنانا تھا۔ اور بخدا ان سرداروں کو اپنی مدد کے لیے نہیں بلایا......انھیں بس یہ اطلاع دینے کے لیے زحمت دی ہے کہ صمد خان نے تین بار جارحیت کا مظاہرہ کیا ہے اور ہم نے صرف دفاعی حکمت عملی اپنائی ہے......چوتھی بار ہم اسے ایسا موقع دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔"

"نہیں بابا جان!......ہم اس کی پہلی غلطی بھی معاف کرنے کے لیے تیار نہیں بس کھانا شروع کرنے کا حکم دیں تاکہ اس کے بعد معززین کو رخصت کیا جا سکے۔"

"ٹھیک ہے بیٹا......" بابا جان میری کسی بات سے اختلاف نہیں کر رہے تھے ان کے لیے میرا اعتماد سے پر بہادرانہ لہجہ کسی سپنے جیسا تھا۔

"سردار زادے شیر دل خان!......اتنی جلدی یوں بے لچک فیصلہ سنا دینا میرے نزدیک مناسب نہیں ہوگا؟" سردار بسم جان مدبرانہ لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوا۔

"محترم چچا جان!......آپ جانتے ہیں ہم قبائلیوں کے قاعدے اور قوانین پتھر پر لکیر ہوتے ہیں، ہم اصولوں پر سودا بازی نہیں کر سکتے......کسی کی بڑی سے بڑی خطا معاف کرنا ہمارے لیے مشکل نہیں مگر جب کوئی غیر ہم سے مدد کی درخواست کرے تو پھر معاملہ اس غیر کے ہاتھ میں ہوتا ہماری حیثیت دشمن سے مقابلہ کر کے اس آدمی کو انصاف دلانے والی ہوتی ہے۔ صمد یار خان کے معاملہ میں بھی یہی بات ہوئی ہے بابا جان نے آپ لوگوں کو زحمت دی تھی تاکہ علاقے کا امن وامان ہماری وجہ سے تباہ نہ ہو، کیونکہ صمد یار خان تین بار پہل کر چکا ہے اور بخدا بات یہیں تک محدود ہوتی تو کچھ نہ ہوتا، ہم اس کی یہ تمام غلطیاں ٹھنڈے دل سے برداشت کر لیتے کہ وہ کوئی خاندانی وقار نہیں رکھتا ایک تھرڈ کلاس شخص ہے، پنچ سوچ کا مالک۔ ایسے آدمی کی دشمنی بھی سردار دلاور کے وقار پر دھبہ ہے......مگر اب بات ہمارے ہاتھ سے نکل گئی ہے......میں ابھی پشاور سے آ رہا ہوں گل داؤد خان جو کہ صمد یار خان کا بھتیجا ہے، اس سے بڑی تفصیلی بات چیت ہوئی ہے......اس نے صمد یار خان کے خلاف ہماری

مدد مانگی ہے اور سردار دلاور خان کا جانشین ہونے کے ناتے میں نے حامی بھر لی ہے، اس لیے اب بات ہمارے ہاتھ میں نہیں رہی۔"

بسمل جان اوچھا وار کرتے ہوئے بولا۔"سردار زادے شیر دل خان! آپ جانشین ہیں، مگر ابھی تک وارث زندہ بیٹھا ہے......بغیر اس کی اجازت کے آپ کو کسی کی مدد کرنے کی حامی نہیں بھرنی چاہیے تھی؟"

"چچا جان! جانشین وہی ہوتا ہے جو وارث کی غیر موجودگی میں فیصلہ کرے۔ جب داؤد خان نے مدد کی درخواست کی تو وہاں بابا جان حاضر نہیں تھے......اور بالفرض موجود ہوتے تب بھی دلاور خان کا فیصلہ یہی ہوتا ......کیوں بابا جان؟" بسمل جان کو جواب دے کر میں نے بابا جان سے پوچھا۔

"بسمل جان! شیر دل خان کا فیصلہ ہم قبائلیوں کی ثقافت و مزاج کے حسبِ منشاء ہے میرا نہیں خیال کہ آپ کے پاس کوئی سوالی آئے اور آپ اسے خالی لوٹا دیں؟" بابا جان پر رعب لہجے میں بسمل خان سے مخاطب ہوئے۔

بسمل جان نے پینترا بدلتے ہوئے کہا۔"صحیح کہا دلاور خان!......میں بس سردار زادے شیر دل خان کا امتحان لے رہا تھا؟"

"مہر دل خان!......کھانا لگواؤ۔" میں چھوٹے بھائی سے مخاطب ہوا۔

مہر دل خان جو کافی دیر سے ششدر سا میری گفتگو سن رہا تھا۔"جی لالہ!......" کہہ کر اٹھ گیا۔

پرتکلف دعوت کے بعد ہم نے تمام مہمانوں کو رخصت کیا۔ مسکراہٹ بابا جان کے ہونٹوں سے چپکی ہوئی تھی ......وہ ہر چند منٹ بعد میرے کندھے کے گرد بازو پھیر کر مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیتے......آخری مہمان کے رخصت ہوتے ہی وہ بولے۔

"شیر دل خانا! دل خوش کر دیا......آج تم نے میرے دل سے موت کا خوف نکال دیا۔"

میں مسکرایا۔"بابا جان!......مرنے سے تو آپ پہلے بھی نہیں ڈرتے تھے؟"

"نہیں یار!......تیرے ڈراموں نے ڈرا دیا تھا۔"

"بابا جان!......میرا خیال تھا، لوگ محبت کی زبان سمجھ جائیں گے......؟"

مہر دل مسکرایا۔"سمجھ تو جاتے ہیں لالہ......مگر ڈنڈے کی زبان عام فہم ہے ذرا جلدی سمجھ میں آتی ہے۔"

باباجان قہقہہ لگاتے ہوئے بولے۔ ''شیر دل خان! سن لیا...... مہر دل کیا کہہ رہا ہے؟''

''جی باباجان!......سن بھی لیا اور سمجھ بھی گیا ہوں؟''

''میرا دل چاہتا ہے میں پورے علاقے کی دعوت کروں؟''

میں نے پوچھا۔ ''وہ کیوں باباجان؟''

''شیر دل خان!......تم نہیں جانتے آج میں کتنا خوش ہوں......آج سارے علاقے کے سردار مجھے اتنے حقیر نظر آ رہے تھے کہ لگتا تھا میں انھیں چٹکی میں مسل سکتا ہوں آج میرے دونوں بازو مکمل ہو گئے ہیں، بس آج میں بہت خوش ہوں۔''

مہر دل خان چہکا۔ ''باباجان!......میں بھی بہت خوش ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''باباجان!......آپ گھر چلیں......میں اور مہر دل ذرا پہاڑ کے دامن سے ہو کر آتے ہیں۔''

''بعد میں چلے جانا۔'' شاید باباجان مجھے نظروں سے دور نہیں کرنا چاہتے تھے۔

میں مصر ہوا۔ ''نہیں باباجان ابھی ضروری ہے؟''

''ایسی بھی کیا ضرورت ہے یار!......؟''

''باباجان! اصل میں کافی وقت گزر گیا ہے کہ میں نے ہتھیار کو ہاتھ نہیں لگایا آج ذرا مہر دل خان کے ساتھ پریکٹس کرنا چاہتا ہوں؟''

''واہ!......دل خوش کر دیا شیر دل خانا!......ضرور جاؤ......'' باباجان نے جھٹ سے اجازت دے دی۔

ہم دونوں بھائی وہیں سے پہاڑ کے دامن کی طرف چل پڑے۔ تھوڑی دیر بعد ہی ہم پہاڑ کے دامن میں پہنچ گئے۔ مہر دل خان نے کسی ماہر اتالیق کی طرح مجھے کلاشنکوف کے بارے میں بریف کرنا شروع کر دیا، میری رگوں میں بھی ایک قبائلی پٹھان کا خون دوڑ رہا تھا، گن کے بارے میں سمجھتے ہوئے مجھے چنداں دشواری پیش نہ آئی۔ اور پھر اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد ہم نے نشانہ بازی کا مقابلہ کیا تینوں دفعہ مہر دل خان جیت گیا تھا مگر مجھے کلاشن کوف کے استعمال کی اچھی طرح سمجھ آ گئی کہ کیسے شست باندھوں اور کس طرح فائر کروں۔

باباجان کی طرح مہر دل خان بھی میری اس کایا پلٹ پر بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ اس کے انداز میں میرے

لیے احترام اور عقیدت در آئی تھی ...... گھر پلٹنے سے پہلے میں نے مہر دل کو کہا کہ آخری بار پلاسٹک کی بوتل پر نشانہ لگاتے ہیں ...... وہ مان گیا، وہاں پڑی دو پرانی کولڈ ڈرنکس کی بوتلیں ہم نے بطور ٹارگٹ زمین میں گاڑیں اور پھر سو گز کے فاصلے سے اپنے اپنے ٹارگٹ سے فائر کرنے لگے۔ پانچ پانچ فائر کر کے ہم بھاگتے ہوئے ٹارگٹ کے قریب پہنچے ...... مہر دل خان کے ٹارگٹ میں پانچوں گولیں کے سوراخ بنے تھے جبکہ میرے ٹارگٹ پر چار سوراخ بنے ہوئے تھے اور پانچویں گولی پلاسٹک کی بوتل سے رگڑ کھاتے ہوئے گزری تھی۔

''یہ دیکھو پانچویں گولی بھی ہٹ ہے۔'' میں نے مہر دل کو گولی کی رگڑ کی طرف متوجہ کیا۔

''نہیں جناب! یہ گولی ٹارگٹ سے چھو کر ضرور گزری ہے، مگر اسے ہٹ نہیں کہہ سکتے۔''

''ہٹ کیوں نہیں ہے ...... تمھاری یہ گولی بھی تو بس بمشکل سے ہی ٹارگٹ کو ہٹ کر پائی ہے۔'' میں نے اس کی ایک گولی پر اعتراض کیا۔ ''اگر میری گولی ایک سنٹی میٹر بھی دائیں ہوتی تو ٹارگٹ میں ضرور سوراخ کر دیتی۔''

''بات سنٹی میٹر یا ملی میٹر کی نہیں ہوتی لالہ۔'' وہ مسکرایا۔ ''گولی کے رگڑ کھا کر گزرنے سے دشمن کا کوئی نقصان نہیں ہوتا۔''

''اس حساب سے تو تمھاری گولی نے بھی بس دشمن کے بازو ہی کو زخمی کیا ہے۔''

''بازو ہی سہی ...... دشمن کا نقصان تو ہوا ہے ناں؟''

''اگر گولی بازو سے رگڑ کھا کر گزرے تب بھی خراش تو لگ ہی جاتی ہے ...... اور گولی سے لگنے والی خراش بھی لازماً باعث تکلیف ہوتی ہے ...... حساب برابر۔'' میں ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''نہیں لالہ! ...... اپنی شکست تسلیم کر لو۔''

''پہلے تین مقابلوں کی ہار میں نے تسلیم کر لی تھی ...... یہ برابر رہا۔''

''گولیاں ختم ہو گئی ہیں ورنہ ایک اور مقابلہ ضرور کرتے۔'' مہر دل خان نے جواب دیا اور ہم گھر کی جانب چل پڑے۔ گھر میں بھی ہمارے ہی متعلق بحث جاری رہی زرغونہ میری طرف داری کر رہی تھی جبکہ مور جان کا ووٹ مہر دل کی طرف تھا ...... بابا جان بس مسکرا کر ہماری بحث سنتے رہے۔ جب ہم دونوں نے بابا جان سے ثالثی کرانا چاہی تو وہ کہنے لگے۔

"بھئی!......اگلے ہفتے سلیم جان کی شادی ہے......اور اس بات کا فیصلہ وہیں شادی پر ہوگا۔"

سلیم جان ہمارا خالہ زاد تھا۔اور ہمارے ہاں شادیوں پر کچھ اور ہو نہ ہو نشانہ بازی کا مقابلہ ضرور ہوتا ہے۔

"ٹھیک ہے بابا جان۔" ہم دونوں ایک ساتھ بولے تھے۔

☆......☆......☆

منظر میرا دیکھا بھالا تھا......وہی خوش نما پھول، خوش رنگ سبزہ، پھل دار درخت، بہتے جھرنے، چہچہاتے پرندے......آسمان پر تیرتی دودھیا بدلیاں......ہلکی ہلکی چلنے والی خوشگوار ہوا......اور پھر وہ سبک قدموں سے چلتی ہوئی پھولوں کے کنج سے نمودار ہوئی......آج اس کے ہونٹوں پر دھیمی دھیمی مسکراہٹ کھل رہی تھی......اس کی مسکراتی آنکھیں دیکھ کر میرے دل کو کچھ ہونے لگا، مگر میرے ہونٹ حسب سابق سلے رہے۔وہ مجھ سے دو تین گز دور رک گئی......چند لمحے میری جانب دیکھنے کے بعد اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے پانچ انگلیاں دکھائیں اور پھر نفی میں سر ہلا کر انگوٹھا ہتھیلی کی جانب موڑ کر چار انگلیاں کھلی رہنے دیں۔

ایک جھماکے سے میرے ذہن میں مہر دل کے ساتھ ہونے والی بحث تازہ ہوگئی۔وہ مجھے اشارے سے بتا رہی تھی کہ ٹارگٹ پر میری چار گولیاں لگی تھیں، اس کے ہونٹوں پر مچلنے والی ہنسی سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ میری نشانہ بازی کی پریکٹس سے اسے خوشی ہوئی تھی۔اور پھر وہ جس سمت سے آئی تھی اسی طرف واپس چل دی، میں نہ تو اسے آواز دے سکا اور نہ اس کا تعاقب کر سکا۔

اس کے نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہی میری آنکھ کھل گئی تھی......بقیہ رات میں اس کے خیالوں میں کھویا رہا......اس کا نام سائرہ تھا......خاندانی لحاظ سے وہ میری ہم پلہ تھی۔ایف اے کی طالبہ تھی اور اسے بھی میرے خواب آتے تھے......جبکہ صمد خان اسے اپنی بہو بنانا چاہتا تھا......زبردستی اسے اغوا کیا ہوا تھا......جانے قید میں اس کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا تھا؟ گو کہ صمد یار خان کا ارادہ اسے بہو بنانے کا تھا اس لحاظ سے امید کی جا سکتی تھی کہ اس کے ساتھ کوئی ناروا سلوک نہیں ہو رہا ہوگا، مگر پھر بھی قید تو قید ہوتی ہے......اور یوں اپنے کم عمر بیٹے سے زبردستی اس کی شادی کرنا میرا دماغ کھولنے لگا، میں صمد یار خان کی ساری غلطیاں معاف کر سکتا تھا لیکن سائرہ کو اغوا کرنے کی خطا معاف ہونے کے قابل نہیں تھی، میری ذہنی رو صمد یار خان سے انتقام لینے کے طریقوں کی

طرف بہنے لگی......اور انھی خیالات میں مجھے صبح کی اذان سنائی دی۔

وضو کر کے میں محلے کی مسجد کی طرف بڑھ گیا......نماز پڑھ کر میں گھر آیا مور جان کچن میں مصروف تھیں ، کیونکہ بابا جان نماز پڑھتے ہی قہوہ پیتے اور پھر زمینوں کی طرف نکل جاتے تھے۔ میں کچن ہی میں گھس گیا، زرغونہ بھی اسی وقت کچن میں داخل ہوئی اس نے سفید دوپٹا نماز کے انداز میں اوڑھا ہوا تھا......گھر میں کسی کو بھی نماز چھوڑنے کی اجازت نہیں تھی......البتہ میں عموماً نماز پڑھ کر دوبارہ سو جایا کرتا تھا......آج خلاف توقع مجھے صبح صبح کچن میں گھستا دیکھ کر زرغونہ نے پوچھا۔

''لالہ!......خیر تو ہے؟''

''ہاں خیر ہی ہے......بس بھوک لگی تھی سوچا گڑیا کے ہاتھ کا بنا پراٹھا ہی کھالوں؟''

''آپ بیٹھیں......بس دو منٹ میں تیار ہو جاتا ہے۔'' وہ فرج کھول کر گوندھا ہوا آٹا باہر نکالنے لگی۔ میں وہیں چوکی پر بیٹھ گیا۔

''مور جان! بابا جان کو چائے کا عادی کرو ناں؟ یہ کیا صبح صبح اتنا کڑوا قہوہ پیتے ہیں۔''

وہ مسکرائی۔ ''تم خود کہو نا اسے میں اب اس عمر میں اس سے جھگڑتی اچھی لگوں؟''

''اچھا ایسا ہے تو پھر آج میں ان کے لیے چائے لے جاتا ہوں دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے؟''

''مذاق مذاق میں مارے جاؤ گے ان کے ہاتھ سے۔'' مور جان قہوے کی کیتلی اٹھاتے ہوئے بابا جان کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

''لالہ! ایک بات پوچھوں؟'' زرغونہ توے پر کپڑا پھیر کر اُسے صاف کرتے ہوئے بولی۔

''اگر میں ناں کہوں پھر بھی تم نے پوچھنا تو ہے......پھر اجازت مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟''

زرغونہ نے ہنستے ہوئے پوچھا ''لالہ!......مجھے، بلکہ ہم سب کو سمجھ نہیں آ رہی آپ ایک دم بدل کیسے گئے؟''

''خود نہیں بدلا......مجھے بدلنے پہ مجبور کیا گیا ہے؟''

''کس نے بابا جان کی باتوں اور مہر دل کے رویے نے؟''

''نہیں صرف ان باتوں سے شاید میں نہ بدلتا......اس کے علاوہ بھی کافی وجوہات ہیں۔''

''اس میں خوابوں والی بھابی کا ہاتھ تو نہیں ہے؟'' زرغونہ کے چہرے پر شرارتی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''ہاں......وہ بھی اس کارِ خیر میں شامل ہے......صمد یار خان کا حقارت بھرا سلوک، بابا جان کا درشت رویہ ،مہردل خان کا بدتمیزانہ انداز اور بھی کچھ باتیں ایسی ہوئیں ہیں کہ مجھے اپنے اطوار بدلنے پڑے......اور یقیناً یہ بہتر ہوا ہے......میں جس ڈھنگ سے زندگی گزارنا چاہتا تھا ایسا شاید کہانیوں ہی میں ممکن ہے، حقیقی زندگی میں تلخیاں بھری ہوئی ہیں...... ہر موڑ پر ایسے مفاد پرستوں سے واسطہ پڑتا ہے جنھوں نے مکروفریب کے لبادے اوڑھ رکھے ہیں۔ کچھ ایسے ظالم ہیں جنھیں کمزوروں پر ظلم کرتے ہوئے لذت ملتی ہے......مجبوروں اور بے کسوں پر ظلم ڈھانا ان کا مشغلہ ہے......ایسے حالات میں اگر میں نہ بدلتا تو مارا جاتا......اور جانتی ہو میرے مرنے پر بابا جان کو یقیناً خوشی ہوتی......ان کے نزدیک، بزدل بیٹے کی زندگی سے، موت بہتر ہے۔''

''خیر اب ایسا بھی نہیں تھا......'' زرغونہ نے میرے سامنے رکھی چھوٹی سی میز پر پراٹھا اور ہاف فرائی انڈا رکھتے ہوئے کہا۔'' بابا جان کو آپ کی عادات ناپسند سہی، مگر وہ آپ کی موت کسی صورت گوارا نہیں کر سکتے تھے، وہ اپنی ساری اولاد میں سب سے زیادہ آپ کو چاہتے ہیں۔''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو مگر یقینی طور پر اسے میری بزدلی سے نفرت تھی۔''

''وہ تو مجھے بھی تھی۔'' زرغونہ ابلتے دودھ میں پتی اور شکر ڈالنے لگی۔

''ہاں گڑیا!......کسی بھی چیز کی افراط کو لوگ عموماً پسند نہیں کرتے......میں کچھ زیادہ ہی ڈرپوک ہو گیا تھا ......اور پتا ہے ایک بار تو جھگڑے کی آوازیں اور فائرن کر میں بے ہوش ہو گیا تھا۔''

''اچھا لالہ!......یہ حنا کیسی لڑکی ہے؟'' اس نے اچانک ایک غیر متعلق سوال پوچھا۔

''تمھاری مراد راشد کی بہن حنا سے ہے تو وہ نہایت خوب صورت اور خوش اخلاق لڑکی ہے۔''

''مطلب مجھے بھابی ڈھونڈنے کے لیے زیادہ تگ و دو نہیں کرنی پڑے گی؟''

''ہاں......اس کی اور مہردل کی جوڑی خوب جچے گی۔''

''لالہ!......یہ کیا......؟ بات تو آپ کی ہو رہی تھی۔'' وہ شکوہ کناں ہوئی۔

''زرغونہ!......ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے ایک بات کہی تھی؟''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''کون سی لالہ؟''

''یہی کہ......کیا میرے بدلنے میں خوابوں والی بھابی کا ہاتھ تو نہیں ہے؟''

''تو لالہ!.........؟'' وہ ابھی تک میرا اشارہ نہیں سمجھی تھی۔

''تو یہ کہ میری دو شادیاں کرانا چاہتی ہو؟ کبھی خوابوں والی کو بھابی کہتی ہو اور کبھی حنا کا تعلق مجھ سے جوڑتی ہو؟''

زرغونہ جلدی سے بولی۔ ''وہ تو میں نے مذاق کیا تھا۔''

''مگر میں نے مذاق نہیں کیا زرغونہ بی بی! وہ خوابوں والی گزشتہ کل بھی تمھاری بھابی کے عہدے پر فائز تھی اور آنے والے کل بھی وہی اس نشست پر براجمان رہے گی۔''

''لالہ!......خواب بھی کبھی حقیقت ہوئے ہیں۔''

''بہنا!......وہ خواب نہیں حقیقت ہے......اس کا نام سائرہ ہے، فرسٹ ائیر کی طالبہ ہے، گجرات کے چودھری فرمان حیدر کی بیٹی ہے۔''

''سچ لالہ!......'' زرغونہ قریباً چیختے ہوئے میرے کندھے سے لپٹ گئی تھی۔

''ہاں گڑیا!......'' میں نے اس کا سر تھپتھپایا۔ ''یہ سچ ہے......اور جانتی ہو وہ اس وقت کہاں ہے؟''

زرغونہ نفی میں سر ہلا کر میری طرف دیکھنے لگی۔

''وہ اس خبیث شخص کی قید میں ہے جس کا نام صدیار خان ہے اور جو میرے نزدیک اس کائنات کا بدترین شخص ہے۔''

''لالہ!......اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ کے اندر ایک دم آنے والی تبدیلی میں سائرہ بھابی کا کردار نمایاں ہے۔''

''تم ایسا سمجھنے میں حق بجانب ہو؟......مگر حقیقت یہی ہے کہ سائرہ کی کہانی معلوم ہونے سے پہلے میں ایک شخص کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا ایک ایسے آدمی کو جس نے بابا جان کو گالی بکنے کی جسارت کی تھی۔''

''مطلب آپ بابا جان کو اپنی سائرہ سے بھی زیادہ چاہتے ہیں؟''

''زرغونہ!......یہ تمھیں کس نے کہا کہ پیار کو ناپا تولا جا سکتا ہے......کیا تم بتا سکتی ہو کہ تمھیں بابا جان زیادہ

پیارے ہیں، مور جان یا میں؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''تو پھر میں کیا بتاؤں کہ بابا جان مجھے زیادہ عزیز ہیں یا سائرہ......دل میں ہر ایک کا اپنا مقام ہوتا ہے اور یاد رکھو احساس سے تعلق رکھنے والی بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو بیان نہیں کی جاسکتیں......مثلاً اگر کسی آدمی نے کبھی کھجور نہ کھائی ہو تو تم اس کے سامنے الفاظ میں کھجور کی مٹھاس کی وضاحت نہیں کر سکتے، سوائے اس کے کہ کھجور میٹھی ہوتی ہے......اور بس۔''

وہ ہنسی۔''تو یہی وضاحت ہوئی ناں لالہ!......کہ کھجور میٹھی ہوتی ہے۔''

''وضاحت کیسے ہوئی اگر وہ پوچھے کیا کھجور سیب کی طرح میٹھی ہوتی ہے تو تم کیا کہو گی؟ نہیں ناں؟ وہ پوچھے آلو بخارے، ناشپاتی، انار کی طرح میٹھی ہوتی ہے؟ تب بھی تمھارا جواب ''ناں'' ہی ہوگا۔ بتاؤ بھلا کیا کہو گی؟''

زرغونہ نے منہ بنایا۔''لالہ! پتا نہیں آپ نے مجھے کن باتوں میں الجھا دیا۔ آپ مجھے سائرہ بھابی کے بارے بتا رہے تھے......آپ نے اسے کہاں ڈھونڈا اور پھر چودھریوں کی لڑکی کو اس خبیث نے کیسے اغوا کر لیا؟''

''لمبی کہانی ہے محترمہ!......بعد میں سناؤں گا......فی الحال تو میں فائر کی پریکٹس کے لیے جا رہا ہوں کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ چھوٹے بھائی کے ہاتھوں تماشا بن جاؤں۔''

''فائر پریکٹس؟......تماشا؟......میں سمجھی نہیں لالہ......؟''

''بھلکو!......کل بابا جان کیا کہہ رہے تھے کہ سلیم جان کی شادی پر ہونے والی نشانہ بازی میں میرا اور مہر دل خان کا بھی مقابلہ ہوگا۔''

''ٹھیک ہے لالہ!......مگر یاد رکھنا رات کو اس وقت تک سونے نہیں دوں گی جب تک ساری کہانی تفصیل سے سن نہ لوں گی۔''

''ٹھیک ہے محترمہ!......سن لینا۔'' میں مسکراتے ہوئے گھر سے باہر نکل آیا۔

آدھا گھنٹا پیدل چلنے کے بعد میں پہاڑ کے دامن میں پہنچ گیا تھا۔ دو چھوٹے چھوٹے پتھر بطور ٹارگٹ ایک بڑی چٹان پر رکھ کر میں نشانہ بازی کی پریکٹس کرنے لگا اور جب تک گولیاں ختم نہ ہوگئیں میں پریکٹس میں مگن رہا

۔آخری گولی فائر کرنے کے بعد میرے قدم گھر کی طرف اٹھ گئے۔آج فائر کرتے ہوئے میری ساری جھجک دور ہوگئی تھی اس کے ساتھ نشانہ بھی پہلے سے زیادہ بہتر ہوگیا تھا......یوں بھی نشانہ بازی کے لیے ایک بار فائر کے طریقہ کار کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے اس کے بعد سارا کام آسان ہو جاتا ہے۔اور نشانے کا اچھا برا ہونے کا تعلق پریکٹس سے زیادہ قدرتی مہارت پر ہوتا ہے۔گو کہ پریکٹس ہی ایک انسان کو مکمل کرتی ہے مگر کچھ چیزیں پریکٹس کے ساتھ ساتھ قدرتی مہارت کی بھی متقاضی ہوتی ہیں اور نشانہ بازی بھی ان میں سے ایک ہے۔

بابا جان صحن میں بچھی چارپائی پر براجمان دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔

''آؤ شیر دل خانا!......کھانا کھالو۔'' مجھے دیکھتے ہی انھوں نے خوش دلی سے پکارا۔

اور میں سر ہلاتے ہوئے ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔

''کہاں سے آرہے ہو؟'' بابا جان نے نوالہ توڑتے ہوئے پوچھا۔

''نشانہ بازی کی مشق کر رہا تھا بابا جان۔''

''بہت خوب......شیر دل خانا!......لگتا ہے تجھے اب پتا چل گیا ہے کہ ہتھیار کی ایک پٹھان کی زندگی میں کیا اہمیت ہوتی ہے؟''

''ہاں بابا جان!اور دیکھ لینا مقابلے میں آپ کے بیٹے سے کون جیتتا ہے؟''

''ہا......ہا......ہا......'' بابا جان نے قہقہہ لگایا۔''خیال رکھنا پتر!......مہر دل خان اتنی آسانی سے ہار ماننے والوں میں سے نہیں ہے؟''

''اسے بھی دیکھ لوں گا بابا جان۔''

''وہ صمد یار خان کے بھتیجے کے متعلق تم کل کچھ کہہ رہے تھے؟''

''بابا جان!پرسوں وہ ملا تھا اور اس نے مجھے کافی تفصیل سے صمد یار خان کے متعلق بتایا ہے،وہ صمد یار خان کا جانی دشمن ہے......اس کے علاوہ گجرات کا ایک جاگیر دار خاندان بھی صمد یار خان کا دشمن ہے۔اس خاندان کے ایک جوان سے بھی تفصیلی بات چیت ہوئی ہے۔''میں نے جزئیات حذف کرتے ہوئے اہم تفصیل بابا جان کے گوش گزار کردی۔

بات مکمل ہونے تک ہم دونوں کھانے سے بھی فارغ ہو گئے تھے۔ زرغونہ بابا جان کے لیے قہوہ اور میرے لیے چائے لے آئی تھی۔

قہوے کی چسکی لیتے ہوئے بابا جان نے کہا...... ''شیر دل خان!...... صمد یار خان بہت گھٹیا اور نیچ شخص ہے ...... جو شخص اپنے سگے بھائی کو دولت کے لیے قتل کر دے، نفسانی خواہشات کے لیے اپنے خالہ، خالو کا گلا کاٹ دے، ایسے شخص میں بھلا کب انسانیت ہو سکتی ہے۔ اور یقین مانو ایسے آدمی کا زیرِ زمین چلے جانا زمین کے اوپر رہنے سے کئی گنا بہتر اور مفید ہے۔''

''ٹھیک کہتے ہو بابا جان۔'' میں نے ان کی تائید میں سر ہلایا۔

''کیا گپ شپ ہو رہی ہے بھئی......؟'' مہر دل خان گھر میں داخل ہوتے ہی چہکا۔

''بابا جان سے نشانہ بازی کے گر پوچھ رہا تھا یار۔''

''پھر کیا بتایا بابا جان نے؟'' مہر دل خان موڑھا لے کر وہیں بیٹھ گیا۔ اپنی کلاشن کوف اس نے گود میں رکھ لی تھی۔

میں مسکرایا۔ ''تمھیں کیوں بتاؤں......؟''

''لالہ!...... کھانا لے آؤں؟'' زرغونہ نے مہر دل کو ہمارے ساتھ بیٹھے دیکھ کر دور سے ہانک لگائی۔

''ہاں لے آؤ......'' وہ ہماری جانب متوجہ ہوا۔ ''اور آپ............؟''

''ہم نے کھا لیا ہے۔'' میں نے قطع کلامی کی۔

''شیر دل خان!...... داؤد خان اور چودھریوں کو بھی سلیم جان کی شادی کا دعوت نامہ بھیج دیا ہوتا۔ اسی بہانے ان سے گپ شپ بھی ہو جائے گی اور صمد یار خان کے خلاف کوئی لائحہ عمل بھی تیار کر لیتے...... اب اس خبیث کو مزید مہلت دینا مناسب نہیں لگتا...... اس کے آدمی دو بار مہر دل خان پر قاتلانہ حملہ کر چکے ہیں...... گو کہ اس کا نقصان خود انھی کو پہنچا مگر انھوں نے ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش تو کی ہے ناں؟''

''ٹھیک ہے بابا جان!...... میں ابھی انھیں فون کر دیتا ہوں۔'' میں موبائل فون نکال کر داؤد خان کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ اسے شادی سے زیادہ بابا جان سے ملاقات کا شوق تھا۔ بغیر کسی حجت کے وہ جھٹ تیار ہو گیا ...... اس کے بعد میں نے عدنان حیدر چودھری سے بات کی۔ عدنان نے بھی حامی بھرنے میں دیر نہیں لگائی تھی

۔اس کے ساتھ اس نے اپنے والد صاحب کو بھی ساتھ لانے کا وعدہ کیا تھا۔

رابطہ منقطع کر کے میں بابا جان سے مخاطب ہوا۔

''بابا جان! ہفتے کے دن انشاء اللہ داؤد خان اور عدنان حیدر ہمارے مہمان ہوں گے۔''

مہردل خان نے پوچھا۔''یہ داؤد خان، صمد یار خان کا بھتیجا ہے ناں؟''

''ہاں وہی ہے۔''میں نے جواب دیا۔اور مہردل خان سر ہلاتے ہوئے کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☆......☆......☆

رات کو زرغونہ نے پوری کہانی سنے بغیر مجھے سونے نہیں دیا تھا۔اگلے دن میں نشانہ بازی کی پریکٹس میں مشغول تھا جب تین ہتھیار بردار مجھے دور سے اپنی جانب آتے دکھائی دیے یہ کوئی ایسی انہونی بات نہیں تھی کہ میں اپنی پریکٹس چھوڑنے کی سوچتا۔البتہ جب وہ بالکل میرے قریب پہنچ گئے تو مجھے ان کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ان میں سے ایک کے چہرے پر اگی گھنی مونچھیں بہت بری لگ رہی تھیں۔باقی دو کی مونچھیں تو چھوٹی چھوٹی تھیں لیکن شکل پر چھائی نحوست مونچھوں والے سے کم نہیں تھی۔

''تم!......شیر دل خان ہو؟''مونچھوں والے کی آواز شکل سے بھی بھیانک تھی۔

''لوگ تو اسی نام سے پکارتے ہیں۔''میں ان کی طرف متوجہ تھا لیکن میری کلاشنکوف کی بیرل ٹارگٹ کی طرف اٹھی ہوئی تھی......تینوں کے پاس ہتھیار موجود تھے مگر انھوں نے اپنے ہتھیار کندھوں سے لٹکائے ہوئے تھے۔

''ہم سردار صمد یار خان کے آدمی ہیں اور............؟''الفاظ مونچھوں والے کے ہونٹوں پر تھے کہ ایک دم میری گن کا رخ، ٹارگٹ سے ہٹ کر ان کی طرف ہو گیا اور اس کی بات ادھوری رہ گئی کلاشن کوف کی بیرل کا رخ اپنی جانب دیکھ کر ان تینوں کے ہاتھ اپنی کلاشنکوفوں کی جانب بڑھے، مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنے ہتھیار کندھوں سے اتارتے میں دھاڑا۔

''خبردار!......اگر کسی نے ہتھیار کو چھونے کی کوشش کی......؟......تم جتنے بھی چست ہو گولی کی رفتار سے تیز نہیں ہو سکتے؟''میں نے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے سیفٹی لیور کو برسٹ پر سیٹ کر دیا کیونکہ اس سے پہلے نشانہ بازی کے لیے میں سنگل راؤنڈ فائر کر رہا تھا۔ان کے حرکت کرتے ہاتھ ایک دم ساکت ہو گئے تھے۔

''شیر دل خان! ......تم بہت غلط کر رہے ہو؟'' اس مرتبہ بھی مونچھوں والے نے منہ کھولا تھا۔

میں نے اس کی دھمکی نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔''اپنے ہتھیار زمین پر پھینک دو۔ دوسرا ہاتھ استعمال نہ کرنا ......اور یاد رہے میں نے بھری ہوئی میگزین سے صرف تین گولیاں فائر کی ہیں، ستائیس گولیاں ابھی تک باقی ہیں ......گویا فی آدمی نو گولیاں......''

وہ تینوں ہونٹ کاٹتے ہوئے میری جانب غصے سے گھورتے رہے۔ ہتھیار ابھی تک ان کے کندھوں سے لٹکے ہوئے تھے۔ میں نے بیرل کا رخ تھوڑا سا نیچے کرتے ہوئے ٹریگر پریس کیا ''تڑتڑتڑ'' کی آواز کے ساتھ گولیاں ان کے پیروں کے سامنے لگیں پتھریلی زمین سے کوئی گولی اچٹ کر انھیں نقصان بھی پہنچا سکتی تھی مگر ان کی زندگی میرے نزدیک کسی خارش زدہ کتے کی زندگی سے بدتر تھی۔

فائر کی آواز نے ایک لمحے میں تمام کی اکڑ ختم کر دی تھی ......انھوں نے فی الفور اپنے ہتھیار زمین پر پھینک دیے تھے۔

''اب تین قدم پیچھے ہٹ جاؤ''۔ میں نے اگلا حکم سنایا۔

اس مرتبہ انھوں نے بے چون و چراں عمل کیا۔

''شاباش! ......اب اپنی اپنی قمیص اتار دو۔''

''دیکھو! ....''

''دیکھ رہا ہوں بھئی دیکھ رہا ہوں۔'' میں نے اسے بولنے کا موقع نہیں دیا تھا۔

''مم ...... میرا مطلب ہے......'' اس نے دوبارہ مجھے سمجھانے کی کوشش کی مگر اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے میں نے دوبارہ ٹریگر پریس کیا......اس مرتبہ میں نے بیرل کا رخ تھوڑا اوپر اٹھایا تھا گولیاں ان کے سر کے اوپر سے گزر گئیں۔ تینوں کے چہرے پر زردی چھا گئی تھی اور وہ جلدی سے اپنی اپنی قمیص اتارنے لگے۔

مونچھوں والے نے اپنی موٹی توند کے ساتھ ہولسٹر باندھا ہوا تھا جس میں اڑسا پستول صاف نظر آ رہا تھا۔

میں نے کہا۔''ہولسٹر بھی اتار کر میری طرف پھینکو۔''

اس نے ہولسٹر اتار کر نیچے پھینک دیا۔

''اب بھونکو!......کیا پیغام لائے ہو؟''

''شیر دل خان! کسی پیغام لانے والے کے ساتھ یہ سلوک کسی سردار کو زیب نہیں دیتا۔'' اس مرتبہ دوسرے آدمی نے زبان کھولی تھی۔ اس کے لہجے میں شامل عاجزی اس کے ڈر کو ظاہر رہی تھی۔

''یہ بات تمھیں اس خبیث سے پوچھنی چاہیے جس کا پیغام لے کر آئے ہو؟''

''اس کی کسی غلطی کے جواب دہ ہم کیسے ہو سکتے ہیں؟''

''تم اس کے نمائندے ہو......اور تمھارے ساتھ جو سلوک بھی ہو گا وہ براہ راست نہ سہی بالواسطہ اس کے ساتھ ہو رہا ہے۔''

وہ عاجزی سے بولا۔'' ہمارا قصور صرف اتنا ہے کہ ہم اس کا پیغام لائے ہیں پلیز ہمارے ساتھ زیادتی نہ کرو۔''

''مجھے اس خبیث کا پیغام بتاؤ؟''

''سردار کہہ رہے تھے، آپ کو بتا دیں کہ ان تک آپ کے جرگے کی ساری کارروائی پہنچ گئی ہے اور بہتر یہی ہو گا کہ آپ داؤد خان اور چودھری قربان حیدر سے علیحدہ رہیں۔ سردار آپ کے والد کے ساتھ مزید لڑائی نہیں چاہتا......وہ آپ کی وڈیو بھی واپس کر دے گا ورنہ دوسری صورت میں آپ کی وڈیو تمام علاقے میں پھیلا دی جائے گی۔'' مونچھوں والے نے سلجھے الفاظ میں صدیار خان کا پیغام دہرایا۔ اگر سچویشن یہ نہ ہوتی تو لازماً اس کے ہونٹوں سے ادا ہونے والے الفاظ کچھ اور ہوتے۔

''اس اٹھائی گیرے کو کہہ دینا، کہ سردار جب مدد کا وعدہ کرتے ہیں تو کسی کی دھمکی کی پرواہ نہیں کرتے۔ اور جہاں تک اس بے ہودہ وڈیو کا تعلق ہے تو میری طرف سے وہ سینما میں چلا دے۔ مرد کون ہے؟ اس کا فیصلہ میدان کرے گا......باقی گن پوائنٹ پر کسی نہتے سے اپنی بات منوانا کون سا مشکل ہے، بالکل اسی طرح جیسے اب تم تینوں یہاں سے بغیر کپڑوں کے جانے والے ہو۔''

ان کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمودار ہوئے۔ مونچھوں والا بے چارگی سے بولا۔

''سردارزادے شیر دل خان!......ہماری آپ سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔''

''خاموش!......'' میں دھاڑا۔'' اب جلدی سے شلواریں اتار دو۔

''بخ...... خدا...... کے لیے...... سردار!...... ہمارا تماشا نہ بناؤ؟''

اسی وقت گاؤں کی طرف سے ایک جیپ نمودار ہوئی...... مجھے اپنی جیپ پہچاننے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ دو تین منٹ کے بعد جیپ نزدیک آ گئی۔ جیپ مہر دل ڈرائیو کر رہا تھا جبکہ بابا جان ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں سرسری نظر جیپ پر ڈال کر ان کی طرف متوجہ رہا۔

بابا جان جیپ سے اترتے ہی بولے۔

''شیر دل خانا!...... مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس خنزیر کے تین آدمی تمھارے متعلق پوچھتے پھر رہے ہیں ......میں نے سوچا کہیں یہ بے خبری میں تمھیں نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کریں۔''

''بابا جان زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ بہر حال آپ لوگوں نے اچھا کیا۔''

''لالہ! ان غریبوں کی کیا حالت بنا دی ہے؟'' مہر دل خان ان لوگوں کی حالت پر ہنسا۔

میں نے کہا۔ ''یہ مجھے دھمکانے آئے تھے۔''

بابا جان نے پوچھا۔ ''کیا...... دھمکی دی ہے صدیار خان نے؟''

''محترم سردار فرما رہے ہیں، کہ ہم لوگ داؤد خان اور چودھریوں کا ساتھ نہ دیں اور جو کچھ ہمارے اور اس کے درمیان ہو چکا ہے، اسے فراموش کر دیں۔''

''تم نے کیا جواب دیا؟''

''یہی کہ سردار وعدہ خلافی نہیں کیا کرتے۔''

''خوش کر دیا شیر خانا!......'' بابا جان مسکرائے۔ ''اب انھیں جانے دو۔''

''مسٹر مونچھوں والے!......'' میں ان کے سرغنے سے مخاطب ہوا۔ ''میرا ارادہ تو کچھ اور تھا، مگر اب جب بزرگ پہنچ گئے ہیں تو تم یہاں سے پھوٹنے کی کرو۔''

وہ قمیصیں لینے کے لیے جھکے تو میں چلایا۔

''میں نے کہا ہے پھوٹنے کی کرو...... اور شکر ادا کرو کہ ابھی تک نصف لباس تمھارے بدن پر ہے ...... ورنہ میرا ارادہ تو تم پر ظاہر ہو چکا ہے...... بھاگو یہاں سے۔''

میرا لہجہ ایسا نہیں تھا کہ وہ کسی قسم کی حجت بازی کرتے۔ وہ کان دبائے وہاں سے رخصت ہو گئے۔

"چلیں بابا جان!" ان کے دفع ہوتے ہی میں نے بابا جان سے اجازت چاہی۔

"ہاں چلو......" بابا جان نے اثبات میں سر ہلایا۔ ان کے ہتھیار میں نے جیپ میں رکھے اور کپڑوں کی سرسری تلاشی لے کر وہیں پھاڑ کر پھینک دیئے۔ اگر وہ لباس لینے کے لیے واپس بھی لوٹ آتے تو وہ ان کے استعمال کے قابل نہیں رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہم گھر کا رخ کر رہے تھے۔

"شیر دل خانا! آج کل تو ویسا ہی ہو گیا ہے جیسا کہ میں تجھے دیکھنے کا خواہش مند تھا۔" بابا جان میری پیٹھ تھپکتے ہوئے بولا۔

"بابا جان میں تو شروع سے ہی ایسا تھا، بس سکول کی تعلیم نے مجھے انسانیت اور ایثار و قربانی کا سبق سکھایا، مگر میں یہ نہیں جان پایا تھا کہ ایثار ان کے لیے ہوتا ہے جو اس کے قابل ہوں صمد یار خان جیسے متکبروں کے ساتھ تکبر سے پیش آنا صدقہ ہے، ایسے لوگ صرف ہمارے نہیں دین اور معاشرے کے بھی دشمن ہوتے ہیں۔"

مہر دل خان بولا۔ "بابا جان! ......پتا ہے؟...... لالہ کے خوابوں میں آنے والی لڑکی کو بھی صمد یار خان نے زبردستی اغوا کر لیا ہے...... وہ اسے اپنی بہو بنانا چاہتا ہے۔"

"تمھیں کیسے پتا چلا؟"

"مجھے زرغونہ نے بتایا ہے۔ کل رات لالہ نے اسے ساری کہانی سنائی ہے۔"

"ساری کہانی تو خیر ہمیں بھی سنائی تھی مگر یہ ذکر درمیان سے گول کر گئے تھے برخوردار۔" بابا جان معنی خیز لہجے میں مسکرائے۔

"بابا جان! بتا دیتا تو آپ نے پھر میرا مذاق اڑانا تھا۔"

"وہ تو خیر اب بھی اڑائیں گے......اور وہ کیا کہتے ہیں عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے، تم ہم سے یہ بات کیسے صیغہ راز میں رکھ سکتے تھے؟"

"اس زرغونہ کی بچی کی تو میں اچھی طرح خبر لوں گا۔" میں تپتا ہوا بولا۔ اور وہ دونوں قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔



اور پھر سلیم جان کی شادی کا دن بھی آن پہنچا......اس دوران کوئی دوسرا قابلِ ذکر واقعہ ظہور پذیر نہیں ہوا تھا ۔دوپہر کے قریب داؤد خان، عدنان حیدر اور اس کے والد کے ہمراہ پہنچ گیا۔اس وقت نشانہ بازی کا مقابلہ زور وشور سے جاری تھا۔ان کی آمد تک میدان میں صرف پانچ فریق بچ گئے تھے، مہر دل خان، دولھا کا بھائی اختر خان، چچا بہرام گل کا بیٹا منور گل، بسمل جان کا سب سے چھوٹا بھائی دولت خان اور میں ۔وہ مقابلہ جو شیشے کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کو سو گز کے فاصلے سے نشانہ بنانے کا تھا۔اس مقصد کے لیے ہر فائرر کو پانچ گولیاں ملی تھیں۔اس مرحلے میں چالیس فائرر سے صرف پندرہ فائر کامیاب ہو سکے تھے۔اگلے مرحلے میں فاصلہ سو گز سے بڑھا کر دو سو گز کر دیا گیا تھا اور گولیوں کی تعداد پانچ سے کم کر کے تین کر دی گئی تھی۔اس مرتبہ مزید دس فائرر ڈس کوالی فائی کر گئے تھے اور بچنے والے پانچ وہی تھے جن کا ذکر میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔اب فاصلہ دو سو گز سے بڑھا کر تین سو گز کرتے ہوئے گولیاں تین سے گھٹا کر دو کر دی گئی تھیں۔اس مرتبہ ہم دونوں بھائیوں کے علاوہ دولت خان ٹارگٹ کو ہٹ کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ہر مرتبہ جب شیشے کے ٹکڑے کو گولی لگتی تو اس کی جگہ اس سائز کا نیا ٹکڑا لگا دیا جاتا۔

چونکہ ہمارے پاس سنائپر رائفلوں کے بجائے عام کلاشن کوفیں تھیں اس لیے مزید فاصلہ بڑھانے کے بجائے گولیوں کی تعداد کم کر دی گئی اور اب صرف ایک گولی سے نشانہ لگانا تھا۔مزید یہ کیا گیا کہ چھ مربع انچ سائز کے شیشے کی جگہ تین مربع انچ کا شیشہ لگا دیا گیا۔سب سے پہلے دولت خان کی باری تھی، اس نے شست لے کر نشانہ باندھا گولی فائر ہوئی مگر شیشہ ہٹ نہ ہوا۔اس کے بعد مہر دل خان تھا وہ بھی ناکام رہا، آخر میں میری باری تھی اگر میں بھی ناکام رہتا تو ہم تینوں کو برابر قرار دے کر مقابلہ ختم کر دیا جاتا، مگر میں اتنی آسانی سے ہار نہیں مان سکتا تھا۔میں نے شست باندھی ٹریگر پر انگلی رکھی اور پچھلی سائیٹ سے دیکھتے ہوئے میں نے اگلی سائیٹ کی ٹپ شیشے کے نیچے والے کونے سے ملائی اور سانس روک کر بالکل ساکت ہو گیا۔فائر کرتے وقت اکثر لوگ اس لیے ٹارگٹ کو نشانہ نہیں بنا سکتے کہ ان کا بایاں ہاتھ جو رائفل کو سہارا دیئے ہوتا ہے اس کی ہلکی سی لرزش فائر ہونے والی گولی کو دائیں بائیں لے جاتی ہے۔ٹریگر کو مکمل پریس کرتے وقت میں نے بڑے دھیان سے دائیں بازو کی ہلکی لرزش کو روک لیا تھا اور آنکھیں بند کر لی تھیں، میرے تصور میں صمد یار کا چہرہ تھا۔دھماکا ہوا، اور پھر۔

”واہ......شاباش جوانا۔“ کا شور مجھے یہ باور کرانے لگا کہ میں بازی لے گیا تھا۔

مہردل نے مجھے چھاتی سے لگا کر مبارک باد دی۔ باباجان کا چہرہ بھی جوش سے کھلا ہوا تھا۔

چچا بہرام گل نے میری پیٹھ تھپکتے ہوئے باباجان سے کہا...... ”دلاور خان!...... دیکھا میرے بھتیجے کو، تم یونہی ہر وقت گلہ کرتے رہتے ہو؟“

اسی وقت عدنان حیدر میرے قریب آیا اور بولا۔

”واہ کیا بات ہے تمھارے نشانے کی بھائی۔“

”کیسے ہو عدنان!......“ میں اس سے بغلگیر ہوا۔ ”تم کس وقت پہنچے؟“

”جب مقابلہ پورے عروج پر تھا۔ داؤد لالہ اور ابو جان بھی میرے ہمراہ ہیں۔“

وہ چونکہ مقابلہ کے درمیان میں پہنچے تھے اس لیے اس وقت میں ان سے مل نہیں پایا تھا۔

”چلو آؤ!...... میں اسے اندر کمرے میں لے گیا، داؤد خان اور فرمان حیدر چودھری کا تعارف میں نے باباجان سے کرایا...... پھر ہم سب کمرے ہی میں بیٹھ گئے۔ باہر شادی کے ہنگامے اپنے عروج پر تھے لیکن ہم سب ان ہنگاموں سے بے نیاز صمد یار خان کے خلاف منصوبہ بندی میں مصروف ہو گئے۔

باباجان اردو صحیح طریقے سے نہیں بول سکتے تھے، جبکہ عدنان حیدر اور اس کا باپ پشتو سے نابلد تھے...... ہم چونکہ پہلے سے آپس میں مل چکے تھے اس لیے داؤد خان باباجان سے پشتو میں محو گفتگو ہو گیا جبکہ میں فرمان حیدر سے بات کرنے لگا جو میرے تئیں میرا ہونے والا سسر تھا۔ داؤد خان نے باباجان کے سامنے وہ ساری باتیں دہرا دیں جو میں پہلے ہی باباجان کے گوش گزار کر چکا تھا۔

باباجان نے کہا...... ”داؤد خان!...... میرا بیٹا آپ کا ساتھ دینے کا وعدہ کر چکا ہے...... اور سچ تو یہ ہے کہ صمد یار خان ہمارا بھی دشمن ہے...... وہ تین بار ہم پہ حملہ کرنے میں پہل کر چکا ہے...... اور پھر اس نے میری ہونے والی بہو کو بھی حبس بے جا میں رکھا ہوا ہے ایسے شخص کے خلاف آپ مجھے ہر میدان میں اپنے ہمراہ پائیں گے۔“ باباجان کی بہو والی بات نے میرے دل کی دھڑکن تیز کر دی تھی، داؤد خان بھی معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگا مگر سائرہ کا باپ اور بھائی باباجان کی بات نہیں سمجھ سکے تھے۔

''شکریہ چچا جان!......میں جانتا تھا کہ آپ ایک ظالم کے خلاف ضرور میرا ساتھ دیں گے......بلکہ یہ تو ایک متعین بات تھی......میرے یہاں آنے کا مقصد آپ کے ساتھ بیٹھ کر صمد یار خان کے خلاف کوئی متفقہ لائحہ عمل طے کرنے کا ہے۔''

''بھتیجے!......ہم پٹھان کسی لمبے چوڑے منصوبے میں نہیں پڑتے......مارتے ہیں یا مر جاتے ہیں......صمد یار خان نے ہمیں مارنے کی کوشش کی، ناکام ہوا......اب ہم کوشش کر کے دیکھتے ہیں، آگے اللہ مالک ہے شاید اس موذی کا انجام ہمارے ہاتھوں لکھا ہو؟''

''چچا جان!......بجا فرمایا مگر آپ کی ہونے والی بہو اس کے قبضے میں ہے، اس لحاظ سے اس کا پلہ بھاری ہے......جب تک اس بچی کو رہا نہیں کرا لیتے ہم کیسے اس کے خلاف کوئی کارروائی کر سکتے ہیں؟''

عدنان اور اس کے باپ کی سہولت کی خاطر میں بابا جان کی بات کو اردو میں ترجمہ کرتا جا رہا تھا۔البتہ بابا جان کی بہو والی بات میں گول کر گیا تھا۔

''اس کی بھی تو کوئی ایسی کمزوری ہوگی کہ جس کے سہارے ہم بہو کو آزاد کر لیں؟''

بابا جان کی بات سن کر میں اچھل پڑا تھا۔

''پس ہم اس کے بیٹے کو اغوا کر کے سائرہ کو آزاد کرا سکتے ہیں؟'' یہ بات میں نے اردو میں کہی تھی۔

''وہ پشاور کے ایک پرائیویٹ سکول میں دسویں کلاس کا طالب علم ہے۔اسے سکول لانے اور لے جانے کے لیے چار مسلح باڈی گارڈ ساتھ ہوتے ہیں۔'' یہ معلومات داؤد خان نے ہمارے گوش گزار کی تھی۔

میں نے کہا۔''تو پھر کیا؟......کلاشن کوف کی ایک میگزین میں تیس گولیاں آتی ہیں۔وہ تو صرف چار ہوتے ہیں......چوبیس بھی ہوتے تو مجھے میگزین بدلنے کی ضرورت نہ پڑتی......ایک ہی میگزین سے ان کا صفایا ہو جاتا۔''

''کتنے بندے اسے اغوا کرنے جائیں گے؟'' یہ سوال داؤد خان نے کیا تھا۔

میں اطمینان سے بولا۔''اکیلا شیر دل کافی ہے۔''

بابا جان نے فوراً پشتو میں کہا۔''نہیں بیٹا!......مہر دل بھی تمہارے ساتھ جائے گا۔''

"چچا جان!......ہم سب ایک گروپ ہیں...... یہ نہیں کہ صرف سردار دلاور خان کے بیٹے ہی قربانی کا بکرا بنے رہیں۔" داؤد کی پشتو میں کہی بات میں نے اردو میں دہرا دی تھی۔

چودھری فرمان نے کہا۔"بالکل جی!...... میری عزت کو اس خبیث نے حبسِ بے جا میں رکھا ہوا ہے، اس پر پہلی گولی چلانے والا چودھریوں کے خاندان سے ہوگا۔"

بابا جان نے گلابی اردو میں کہا۔"او صرپ تمارا نئیں امارا بی بیٹی اے...... بلکہ امارا بہو اے، اس لیے امارا حق زیادہ اے۔"

بابا جان کی بات نے چودھری فرمان کو حیرت سے گنگ کر دیا تھا۔اس نے حیرانی سے میری جانب دیکھا، میں جھینپ کر نیچے دیکھنے لگا...... چند سیکنڈ بعد چودھری فرمان بے اختیار بازو پھیلا کر اٹھا اور بابا جان کی طرف بڑھا۔

"دلاور صاحب!......دل جیت لیا آپ نے......وہ آپ کی بیٹی ہوئی سائرہ آپ کی ہوئی۔"

بابا جان نے ہنستے ہوئے بڑی گرم جوشی سے فرمان حیدر کو چھاتی سے لگا لیا تھا۔میرا دل خوشی سے نہال ہو گیا تھا۔چند لمحے بابا جان اور چودھری فرمان ایک دوسرے کو بھینچتے رہے اور پھر جیسے ہی جدا ہوئے بابا جان نے اپنے سر سے پگڑی اتار کر چودھری فرمان کے سر پر رکھ دی۔

"خان صاحب!...... یہ پگڑی نہیں عزت کا وہ نشان ہے جو مجھے کسی بادشاہ کے تاج سے بھی زیادہ عزیز رہے گا۔" یہ کہہ کر وہ اپنے کندھے پر پڑی قیمتی چادر اتار کر بابا جان کے سر پہ پگڑی کی طرح لپیٹنے لگا۔

داؤد خان اور عدنان کے چہرے بھی خوشی سے کھلے پڑے تھے۔کمرے سے باہر ڈھول اور شہنائیوں کا شور گونج رہا تھا...... سلیم جان کی شادی حقیقت میں ہمارے لیے خوشی کا پیغام لائی تھی۔

بابا جان اور چودھری فرمان اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو داؤد خان نے کہا۔

"یہ دو خاندانوں کا نہیں دو تہذیبوں کا ملاپ ہے...... سائرہ بیٹی کی ماں کا خمیر اسی مٹی سے اٹھا تھا اور اب اس کی بیٹی اسی علاقے میں واپس لوٹ کر آ رہی ہے...... اللہ تعالیٰ اس ملاپ کو بابرکت بنائے...... یوں بھی شیر دل اور سائرہ کی روح نے تو کافی عرصہ پہلے سے ایک دوسرے کو ڈھونڈ لیا تھا...... شکر ہے کہ آج رسمی طور پر بھی

دونوں کے بڑوں نے انھیں اکٹھا کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے......اس سلسلے میں دلاور خان کی روشن خیالی اور وسیع قلبی لائق تحسین ہے کہ انھوں نے سائرہ کو بغیر کسی جھجک کے اپنی بہو منتخب کرلیا ورنہ اس ملک کے لوگوں کا مزاج ایسا ہے کہ قریباً ہر مجبور اور بے بس لڑکی کو جو کسی کے ظلم کا نشانہ بنی ہو دھتکار دیا جاتا ہے۔''

''بھتیجے!......کسی لڑکی کی پارسائی کو اس کا اغوا ہونا یا عصمت دری زائل نہیں کرسکتی؟''

''بجا فرمایا چچا جان!......'' داؤد خان نے اثبات میں سر ہلایا۔''اسی کو وسیع القلبی اور روشن خیالی کہتے ہیں ......عورت کو ننگے سر گھومنے کی اجازت دینا روشن خیالی نہیں بے غیرتی کہلاتا ہے۔''

''ہم منصوبہ ترتیب دے رہے تھے؟''میں نے انھیں اصل موضوع کی طرف متوجہ کیا۔

''وہ تو طے ہوگیا ......؟اب ہم صمد یار خان کے بیٹے حشمت یار خان کو اغوا کریں گے اور اُس کے بدلے میں سائرہ کو آزاد کرائیں گے......اس کے بعد صمد یار خان سے نمٹیں گے۔''یہ باتیں داؤد خان نے اردو میں کہی تھیں۔

فرمان حیدر چودھری اور عدنان حیدر نے بھی اسی بات کی تائید کردی تھی۔یہ سب طے کرنے کے بعد وہیں دسترخوان بچھا کر کھانا کھایا گیا۔کھانے کے بعد ہم کمرے سے باہر نکل کر شادی کے ہنگاموں سے لطف اندوز ہونے لگے۔



اگلے دن جب مہمانوں کی واپسی ہوئی تو میں ان کے ہمراہ تھا،چھوٹے بھائی مہر دل خان کو میں نے بصد اصرار وہیں رکنے پر مجبور کردیا تھا۔وہ یقیناً نہ رکتا،مگر جب میں نے بابا جان کے اکیلے رہنے کی بات کی تو اسے میری بات ماننا پڑی۔

گاڑی میں ڈرائیو کر رہا تھا اور میرے ساتھ عدنان بیٹھا تھا۔داؤد خان اور فرمان چودھری عقبی نشست پر بیٹھے تھے۔میرے ذہن میں کافی دیر سے ایک سوال مچل رہا تھا جو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''یار عدنان!......آپ کی امی جان تو خالص پٹھان ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ اس نے آپ کو پشتو نہیں سکھائی؟''

انھوں نے تو بہت کوشش کی مجھے خود ہی شوق نہیں تھا......یوں بھی لڑکے عموماً کھیلنے کودنے میں لگے رہتے

ہیں، ماں کے ساتھ کم ہی وقت گزارتے ہیں ...... البتہ تیری ہونے والی بیگم اچھی خاصی پشتو بول لیتی ہے۔“
عدنان کا لہجہ معنی خیز ہو گیا تھا۔

میں ہولے سے مسکرا دیا۔ داؤد خان نے عقبی نشست سے مجھے آواز دی۔

”شیر دل خان! ...... ہمارے پاس وقت بہت کم ہے ...... ہم اپنی کارروائی کو جتنا لیٹ کریں گے سائرہ کے لیے اتنا ہی خطرہ بڑھتا جائے گا ...... صمد یار تک ہمارے گٹھ جوڑ کی خبر پہنچ گئی ہوگی۔ اور مجھے اندیشہ ہے کہ وہ اپنے ناپاک ارادوں کو عملی شکل دینے میں جلدی نہ کرلے؟“

داؤد لالہ! ہم کل ہی حشمت خان کو اغوا کرنے کی کوشش کریں گے۔ تمہاری اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ اس خبیث تک ہماری دوستی کی خبر پہنچ چکی ہے۔ اس سلسلے میں اس نے اپنے تین آدمی میرے پاس بھجوائے تھے۔ تینوں آئے تو دھمکی دینے تھے مگر اپنی بڑھی ہوئی خود اعتمادی نے انھیں پھنسا دیا۔ اپنی قمیصیں اور ہتھیار چھوڑ کے بے چاروں کو بھاگنا پڑا۔“

میری بات پر وہ تینوں قہقہہ لگا کے ہنس پڑے۔

”اس نے لازماً تیری وڈیو کے ذریعے تجھے بلیک میل کرنا چاہا ہوگا؟“ داؤد خان کا اندازہ غضب کا تھا۔

”صحیح کہا لالہ! ...... لیکن تم تو جانتے ہی ہو کہ اس وڈیو کی اتنی اہمیت نہیں ہے کہ مجھے صمد یار خان کے سامنے جھکنے پر مجبور کر سکے۔“

عدنان بولا۔ ”یوں بھی اس کا بیٹا ہمارے ہاتھ آ گیا تو اسے ہمارے سامنے جھکنا پڑے گا۔“

میں نے پوچھا۔ ”لالہ داؤد! تم بتا رہے تھے کہ اس کے ساتھ چار مسلح باڈی گارڈز ہوتے ہیں؟“

”بالکل ایسا ہی ہے؟“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”وہ چاروں صمد یار کے بیٹے کی گاڑی میں بیٹھتے ہیں یا اُن کے پاس اپنی گاڑی ہوتی ہے؟“

وہ بولا۔ ”وہ ایک کھلی چھت کی جیپ میں ہوتے ہیں، جبکہ صمد یار کا بیٹا ڈرائیور کے ساتھ مرسڈیز میں ہوتا ہے۔“

میں نے جوش سے کہا۔ ”میرا خیال ہے اس طرح کام آسان ہو جائے گا۔“

”بھلا وہ کیسے؟“ یہ سوال میرے ہونے والے سسر نے کیا تھا۔ میرے لیے اس کے چہرے پر شفقت اور

محبت کا ملا جلا تاثر تھا۔

میں نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ''انکل! ...... ایسا ہے کہ ہم دو گاڑیوں میں سوار ہوں گے ...... ایک گاڑی اس کے بیٹے کی مرسڈیز سے آگے ہو گی اور دوسری محافظوں کی جیپ سے پیچھے ...... ہم قدرے سنسان روڈ یا ایسا روڈ جس پر رش کم ہو محافظوں کی جیپ کا ٹائر پنکچر کر دیں گے ...... امید ہے ان کی جیپ الٹ جائے گی ...... اگر نہ بھی الٹی ہوئی تب بھی ہمیں اتنا ٹائم بہر حال مل جائے گا کہ ہم حشمت خان کی مرسڈیز میں داخل ہو کر اسے یرغمال بنا سکیں۔ کیونکہ گارڈز کی جیپ کو الٹتے دیکھ کر یقیناً مرسیڈیز کا ڈرائیور گاڑی روکے گا ...... اگر اس نے گاڑی نہ روکی تو ہماری ایک گاڑی تو بہر حال اس کی مرسڈیز سے آگے جا رہی ہو گی اور اس کی مدد سے مرسڈیز کو رکوانا کوئی مشکل نہ ہو گا۔''

''ونڈر فل آئیڈیا ......'' داؤد خان خوش سے چہکا۔ چودھر فرمان کے چہرے پر بھی تحسین آمیز تاثرات نمودار ہو گئے تھے۔



سکول کی چھٹی سے نصف گھنٹا قبل ہی ہم نے اپنی پوزیشن سنبھال لی تھی۔ صمد یار خان کے بیٹے حشمت خان کے سکول آنے اور گھر واپس جانے کا ایک ہی رستا تھا۔ داؤد خان اپنے چار ساتھیوں کے ساتھ اپنی نئی ٹویوٹا کار میں موجود تھا جبکہ میں اور عدنان سکول سے ایک فرلانگ آگے ایک درخت کے نیچے موجود تھے۔ ہمارے پاس نئے ماڈل کی ایک سپورٹس کار تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر عدنان بیٹھا تھا۔ صمد یار خان کے محافظوں کی جیپ کا ٹائر پنکچر کرنے کی ذمہ داری میرے سر تھی۔ اس مقصد کے لیے میں نے سنائپر رائفل ڈریگنو وکا انتخاب کیا تھا۔ چونکہ اس سے پہلے مجھے کبھی سنائپر رائفل سے فائر کرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اس لیے ایک دن پہلے میں نے ڈریگنو و رائفل سے کافی راؤنڈ فائر کر لیے تھے۔ گو ہر ہتھیار سے فائر کرنے کا طریقہ کار ایک ہی ہوتا ہے مگر پھر بھی درست نشانہ لگانے کے لیے نئے ہتھیار کا جانچنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ کلاشن کوف اور سنائپر رائفل میں ٹیلی سکوپ سائیٹ کا بھی فرق ہوتا ہے۔ ٹیلی سکوپ سائیٹ والی رائفل سے شست لینا عام رائفل کی نسبت آسان ہوتا ہے اور نشانے کی درستی زیادہ ہوتی ہے۔

چھٹی کا ٹائم ہوتے ہی عدنان نے کار سٹارٹ کی اور تیار ہو کر بیٹھ گیا...... میں نے بھی رائفل اپنے گھٹنوں پر رکھ لی تھی۔ میں نے گرم چادر اوڑھی ہوئی تھی اس لیے کسی کا باہر سے رائفل کو دیکھ لینا ممکن نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی حشمت یار خان کی نئی مرسڈیز زن کرتے ہوئے ہمارے پاس سے گزری، اس سے چند قدم پیچھے طاقتور انجن والی ایک جیپ تھی جس میں بیٹھے چاروں افراد نے ہاتھوں میں کلاشن کوفیں تھامی ہوئی تھیں۔ دونوں گاڑیوں کے آگے بڑھتے ہی عدنان نے اپنی خوبصورت سپورٹس کار آگے بڑھا دی۔ تھوڑی دیر بعد ہی ہم حشمت یار خان کے محافظوں والی جیپ سے چند گز کی دوری پر پہنچ چکے تھے۔ اور پھر یہی فاصلہ رکھ کر ہم آخر تک چلتے رہے۔ داؤد خان سے ہمارا رابطہ موبائل فون کے ذریعے قائم تھا اور میں اسے ایک ایک پل کی رپورٹ دے رہا تھا۔ حشمت یار خان کی مرسڈیز پہنچنے سے پہلے وہ روڈ پر آ گئے تھے اور پھر وہ مرسڈیز سے آگے آگے چلنے لگے۔ اب ان کی دونوں گاڑیاں آگے پیچھے سے ہمارے گھیرے میں تھیں۔

جلد ہی ہم مطلوبہ روڈ پر چڑھ گئے۔ داؤد خان مسلسل رابطے میں تھا۔

"شیر دل خان!...... تیرے پاس پانچ منٹ رہ گئے ہیں۔" اس کی آواز ہینڈ فری کے ذریعے میرے کانوں میں گونجی۔

"میں تیار ہوں لالہ جی!......" میں نے رائفل کی نال کھڑکی کے شیشے پر رکھ کر شست باندھ لی...... گو متحرک ٹارگٹ کو نشانہ بنانا نہایت ہی مشکل ہوتا ہے اور اس وقت یہ مشکل دگنی ہو جاتی ہے جب آدمی خود بھی کسی چلتی گاڑی میں ہو، لیکن مجھے یہ سہولت تھی کہ فاصلہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ چند گز سے سنائپر رائفل کی گولی کے خطا جانے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ فائرر، نشانہ بازی کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہے...... جبکہ میں نے ایک دن پہلے ہی نشانہ بازی کا مقابلہ جیتا تھا۔ مہر دل خان جیسے ماہر نشانہ باز کو شکست دینا اتنا سہل نہیں تھا۔

میں نے شست باندھی پندرہ بیس میٹر کا فاصلہ ٹیلی سکوپ سائیٹ میں سمٹ کر چند فٹ نظر آ رہا تھا۔ میں نے دس سے الٹی گنتی شروع کر دی۔ "دس، نو، آٹھ، سات، چھ، پانچ، چار، تین، دو، ایک......" ٹائر کے پھٹنے کا زوردار دھماکا ہوا، جیپ لہرائی۔ ڈرائیور نے سٹیرنگ موڑ کر جیپ کو الٹنے سے بچانے کی کوشش کی، گو اس کی کوشش مکمل کامیاب تو نہیں ہوئی، البتہ اتنا ضرور ہوا، کہ جیپ بالکل الٹی نہیں ہوئی اور سائیڈ کے بل گر گئی تھی۔

چاروں محافظ جیپ کے اندر ہی تھے۔ اردگرد موجود لوگوں نے پہلے تو یہ سمجھا کہ شاید کوئی خودکش دھماکا ہوگیا ہے، اس لیے سب لوگ دائیں بائیں بھاگنے لگے، مگر بعد میں دھویں کے بادل نہ اٹھتے دیکھ کر تمام جیپ کی طرف متوجہ ہوگئے۔

حشمت خان کی مرسڈیز کی رفتار بھی کم ہوئی اور پھر گاڑی روک کر ڈرائیور نیچے اترا، حشمت خان بھی جیپ سے باہر نکل آیا۔ وہ ایک کم سن لڑکا تھا، ابھی تک اس کی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں۔ عدنان نے عین مرسڈیز کے پیچھے کار روکی، میں نے سنائپر رائفل سپورٹس کار میں چھوڑ دی اور ہولسٹر سے بریٹا پسٹل نکال کر باہر نکلا۔ ڈرائیور کی توجہ الٹی ہوئی جیپ کی طرف تھی وہ اس طرف دوڑا، حشمت خان بھی اس کے پیچھے لپکا مگر جیسے ہی وہ میرے پاس سے گزرا میں نے ایک دم اسے اپنی گرفت میں لیا اور سپورٹس کار کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر منتقل ہوگیا۔ وہ شاک کی سی کیفیت میں تھا۔ جیسے ہی اسے خطرے کا احساس ہوا اس نے منہ کھولنے کی کوشش کی مگر میں نے بریٹا پسٹل کی نال اس کے منہ میں گھسیڑتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

''اگر ذرا بھی آواز نکالی تو بھیجا اڑا دوں گا؟''

اس کا چہرہ ایک دم خوف سے پیلا پڑ گیا اور وہ تھر تھر کانپنے لگا تھا۔

عدنان نے کار تھوڑی سی ریورس کر کے آگے بڑھا دی، ہم زن سے داؤد خان کی ٹویوٹا کے قریب سے گزرتے چلے گئے۔ اب انھیں ہمارے پیچھے پیچھے آنا تھا، اور کسی بھی قسم کے تعاقب وغیرہ کو روکنے کی ذمہ داری ان کی تھی۔ مگر ہم بغیر کسی حادثے کے داؤد خان کی وسیع وعریض کوٹھی تک پہنچ گئے تھے۔ حشمت یار خان کا خوف سے برا حال تھا۔ اپنے والد کی نحوست کا کچھ اثر اس کے چہرے پر بھی نظر آ رہا تھا۔ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے ملازموں وغیرہ کے ساتھ نہایت برا، برتاؤ کرتا ہوگا۔ جب تک ہم کار سے باہر نکلتے داؤد خان کی ٹویوٹا بھی اندر داخل ہوگئی تھی۔

''بہت اعلیٰ شیر دل خان!......'' گاڑی سے باہر آتے ہی داؤد خان تحسین آمیز لہجے میں بولا۔

''لگتا ہے کسی خفیہ ایجنسی کے ایجنٹ رہے ہو؟'' عدنان نے میری پیٹھ تھپکی۔

''اچھا پہلے اس سنپولیے کی تلاشی لے کر اسے قید کر دو؟'' میں نے حشمت خان کو داؤد خان کے آدمیوں کی

طرف دھکیلا۔ وہ لڑکھڑایا مگر گرنے سے بچ گیا۔ داؤد خان کے آدمیوں نے اس کی جامہ تلاشی لی اور اس کی جیبوں سے نکلنے والا سامان ہمارے حوالے کر کے اسے داؤد خان کے کسی خفیہ ٹھکانے میں منتقل کرنے کے لیے لے گئے۔ ہم اسے داؤد خان کی کوٹھی میں قید کرنے کا رسک نہیں لے سکتے تھے۔

مجھے خواہ مخواہ اس لڑکے سے نفرت ہو رہی تھی، حالانکہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے دل میں سائرہ سے شادی کرنے کا کوئی خیال نہیں ہوگا مگر پھر بھی کوئی سائرہ کے ساتھ منسوب کیا جائے مجھے یہ منظور نہیں تھا، وہ صرف اور صرف میری تھی۔ اس کی خاطر میں صدیار خان تو کیا کسی بھی طاقت سے ٹکرا سکتا تھا۔

میں نے حسرت سے سوچا۔ ''جانے اس کے دل میں بھی میری اتنی ہی محبت ہوگی؟''

''شاید ہاں......؟ ....شاید نہیں......؟'' بہر حال اس کے دل میں کچھ بھی ہوتا وہ میری محبت تھی، اور آئندہ بھی اسی نے میری محبت رہنا تھا۔

داؤد خان کے آدمیوں کے جاتے ہی ہم کوٹھی کے خوبصورت سبزہ زار پر بچھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ داؤد خان حشمت خان کے موبائل فون سے اس کے باپ صدیار خان کو کال کرنے لگا۔ پہلی گھنٹی پر کال رسیو کر لی گئی تھی ۔ داؤد خان نے موبائل فون کا سپیکر آن کر دیا تھا۔

''ہیلو!......؟'' صدیار کے لہجے میں کچھ جاننے کی بے تابی تھی۔

''کمینے تجھے پتا تو چل گیا ہوگا......؟'' دوؤد خان بغیر کسی تمہید کے اس پر چڑھ دوڑا۔

''تم نے اچھا نہیں کیا داؤد خان! بڑوں کی لڑائی میں بچوں کو گھسیٹ لائے؟''

''ہا......ہا......ہا'' داؤد خان کا استہزائی قہقہہ گونجا۔ ''وہ کہاوت تو سنی ہوگی کہ کوزے کو چھلنی کہتی ہے تم میں دو سوراخ ہیں۔''

''میں نے کب بچوں کو اس جنگ میں گھسیٹا ہے؟''

''محترم چچا جان! ...... تیرے مقابلے میں، میں بچہ ہی ہوں، تیرے اس بھائی کا بیٹا جو تیرے ہاتھوں قتل ہوا ، میری زندگی بھی بس اللہ تعالیٰ کو عزیز تھی ورنہ تم نے تو کسر نہیں چھوڑی تھی ......اس کے علاوہ چودھری فرمان حیدر کی بیٹی کو کس نے اغوا کر کے حبسِ بے جا میں رکھا ہوا ہے؟ تم! وہ نامرد ہو جو ہمیشہ عورتوں اور بچوں کا سہارا لے کر

دشمنی پالتے ہیں؟“

”ایک فرنگی میرا بھتیجا نہیں ہو سکتا؟......“ صمد یار خان زہر خند لہجے میں بولا۔

”صحیح کہا!...... بھتیجے انسانوں کے ہوتے ہیں اور تمھاری درندگی نے کب کی یہ صفت تم سے چھین لی ہے۔“

”داؤد خان!...... تم بڑھ چڑھ کر باتیں اس لیے کر رہے ہو کہ میرا بیٹا تمھارے قبضے میں ہے...... ورنہ میں دیکھتا کہ تم کتنے پانی میں ہو؟“

داؤد خان اطمینان سے بولا۔”ٹھیک ہے...... عورتوں، بچوں کو درمیان سے ہٹا دیتے ہیں...... تم سائرہ کو باعزت واپس کرو، اور اس کے علاوہ شیر دل خان کی وڈیو بھی واپس کر دو۔“

”مجھے منظور ہے۔“

”اور ہاں...... کوئی چالاکی نہیں...... ورنہ یاد رکھنا حشمت خان نے لڑکیوں کے کپڑے پہن کر بہت اچھا ڈانس کیا ہے، فیس بک پر کافی پسند کیا جائے گا اس وڈیو کو۔“

”داؤد خان............!“ صمد یار خان حلق کے بل دھاڑا۔

”بڑی تکلیف ہوئی...... یہ تو تیری کرنی کا پھل...... بقول نظیر اکبر آبادی......

یہ دنیا ہے جس کا نام میاں، یہ اور طرح کی بستی ہے

یہ مہنگوں کو تو مہنگی ہے اور سستوں کو یہ سستی ہے

اس ہاتھ کرو، اس ہاتھ ملے یاں سودا دست بدستی ہے

اسی طرح کی اور بھی کافی کہاوتیں مشہور ہیں...... ادے کا بدلہ، جیسا کرو گے ویسا بھرو گے، جو بوؤ گے وہی کاٹو گے...... وغیرہ وغیرہ۔“

”کیا کیا ہے میں نے؟“ صمد یار خان کی آواز میں غم و غصہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

”اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا...... جناب!...... شیر دل خان بھی کسی کا بچہ ہی تھا، جسے گن پوائنٹ پر چوڑیاں پہنا رہے تھے...... حالانکہ وہ تو تجھ سے صلح کرنے کے لیے آیا تھا...... وہ بزدلی کی حد تک امن پسند نوجوان تھا جو آج تمھاری گھٹیا حرکتوں کے باعث آتش فشاں کی شکل اختیار کر گیا ہے، تم نے جو تین آدمی اس

کے پاس بھیجے تھے انھوں نے تجھے بتا تو دیا ہوگا کہ شیر دل خان نے ان کے ساتھ کیا کیا؟ تمھارے بیٹے کو بھی اس اکیلے ہی نے اغوا کیا ہے۔‘‘

’’میں تمام سے نبٹ لوں گا داؤد خان......صمد یار خان اتنا کمزور نہیں ہے کہ تم جیسے چند چھوکروں کے آگے گھٹنے ٹیک دے۔‘‘

’’وہ بعد کا مسئلہ ہے۔تمھاری طاقت کو ناپنے کے لیے ہمارے پاس بڑا وقت پڑا ہے فی الحال تو سودے بازی کی بات کرو۔‘‘

’’مقام اور جگہ کا تعین تم کرو......میں سائرہ چودھری کو وہیں لے آؤں گا۔‘‘

’’مقام کون سا؟......سائرہ اور وڈیو ابھی میری کوٹھی پر پہنچا دو......صبح تمھارا بیٹا سکول پہنچ جائے گا،اور یہ ڈن ہوگیا......مزید آئیں بائیں کرنے کی ضرورت نہیں۔‘‘

’’واہ!......تاکہ تم مجھے بعد میں بلیک میل کرتے رہو۔‘‘

’’مسٹر صمد یار خان!......یہ ایک مرد کی زبان ہے......میں اگر بچوں کو نشانہ بنا کر دشمنی پالتا تو آج سے دو سال پہلے تیرا بیٹا اغوا کرالیا ہوتا۔ابھی تو وہ غریب تیرا بویا کاٹ رہا ہے؟......تم اطمینان رکھو......میرا انتقام تیرا سر لے کے پورا ہوگا۔‘‘

صمد یار خان خاموش ہوگیا۔چند لمحوں کے بعد اس کی آواز فون کے ریسور سے برآمد ہوئی۔

’’ٹھیک ہے داؤد خان!میں سائرہ چودھری کو تمھاری کوٹھی پر بھجوا رہا ہوں۔اور شیر دل خان کی وڈیو میں نے پہلے ہی ضائع کردی تھی کیونکہ وہ میرے کسی کام کی نہیں تھی۔‘‘

’’ٹھیک ہے ہم بھی تمھارے بیٹے کی وڈیو نہیں بناتے مگر یاد رکھنا آئندہ اس طرح کا اوچھا وار کرنے سے پہلے ایک نظر اپنے اہل وعیال پر ڈال لینا کیونکہ ہر عمل کا ردعمل ضرور ہوا کرتا ہے۔‘‘

’’دو گھنٹے کے اندر سائرہ تمھارے پاس پہنچ جائے گی......اور میں چاہتا ہوں میرا بیٹا بھی مجھے آج ہی مل جائے۔‘‘

’’اوکے مل جائے گا......سائرہ کے یہاں پہنچتے ہی اسے تمھارے پاس پہنچا دیا جائے گا۔‘‘ یہ کہتے ہی داؤد

خان نے رابطہ منقطع کر دیا۔

''لو جی یہ مسئلہ تو حل ہو گیا۔'' وہ مسکرایا اور پھر بلند آواز سے اپنے ملازم کو پکارا۔''بشارت! کھانا لگا دو، کافی بھوک لگ رہی ہے۔''

تھوڑی دیر کے بعد ہم ڈائننگ ٹیبل کے گرد بیٹھے تھے...... مگر میری بھوک اڑ چکی تھی دو گھنٹوں کے اندر میرے خوابوں کی شہزادی یہاں آنے والی تھی...... ایسے عالم میں کھانے پینے کو کس کا دل کرتا ہے، میں بھی بے دلی سے عدنان اور داؤد کا ساتھ دے رہا تھا...... داؤد خان میری کیفیت سے اچھی طرح آگاہ تھا، مجھے بے دلی سے لنچ کرتے دیکھ کر وہ پشتو میں بولا۔

''شیر دل خان!...... پریشان نہ ہو، وہ آجائے گی......''

میں نے پھیکے لہجے میں کہا۔''میں پریشان تو نہیں ہوں......''

کھانے کے بعد داؤد خان نے اپنے آدمیوں کو کال کر کے بتا دیا تھا کہ وہ حشمت خان کو تیار کر دیں جیسے ہی سائرہ ہمارے پاس پہنچی ہم اسے صمدیار خان کے حوالے کر دیں گے۔

وقت جیسے تھم سا گیا تھا...... عدنان اور داؤد خان ہنستے کھلکھلاتے گپ شپ میں مصروف تھے۔ عدنان نے اپنے گھر کال کر کے انھیں سائرہ کی واپسی کا مژدہ سنا دیا تھا، لیکن میں ابھی تک امید و بیم کی حالت میں تھا...... کیا واقعی میں تھوڑی دیر بعد اپنے سپنوں کی تعبیر پانے والا تھا یا سائرہ بھی وہ نہیں تھی جس کے خواب میں دیکھتا آرہا تھا۔ کہیں یہ عدنان چودھری اور داؤد خان کا کوئی خفیہ منصوبہ تو نہیں تھا مجھے اپنے ساتھ ملانے کا مجھے اس سوچ پر شرمندگی بھی ہوئی مگر میری اس وقت کی کیفیت میرے بس میں نہیں تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ سائرہ میرے خوابوں کی شہزادی کی معمولی شباہت رکھتی ہو اور عدنان پارٹی نے اسے میرے خوابوں میں آنے والی سمجھ لیا ہو؟...... اچانک میرے ذہن میں یہ لرزا خیز خیال گزرا کہ بابا جان، میری اور سائرہ کی منگنی کا حکم سنا چکے ہیں اگر وہ میرے خوابوں والی نہ نکلی تو میں کیا کروں گا؟

ان خوفناک سوچوں نے اس وقت تک میرا پیچھا نہ چھوڑا جب تک مین گیٹ کی اطلاعی گھنٹی نہ بجی...... چوکیدار نے چھوٹی کھڑکی کھول کر باہر جھانکا...... اور پھر سر اندر کر کے مین گیٹ کھولنے لگا داؤد خان اسے پہلے ہی

سے سب کچھ بتا چکا تھا۔ ہم تمام کھڑے ہو گئے تھے۔ دروازہ کھلا ایک سوزوکی کار اندر داخل ہوئی، عقبی نشست پر کالا نقاب اوڑھے بیٹھی ایک لڑکی صاف نظر آ رہی تھی۔ میرے دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہو گئی تھی۔

اندر داخل ہوتے ہی سوزوکی کار رک گئی۔ فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر صمد یار خان کے دونوں آدمی باہر آئے ڈرائیور کے علاوہ اس نے صرف ایک گن مین بھیجنے کی ضرورت محسوس کی تھی۔ میری نظریں عقبی نشست پر بیٹھے وجود پر گڑی تھیں...... عدنان نے جلدی سے آگے بڑھ کر عقبی نشست کا دروازہ کھولا...... وہ باہر آتے ہی اپنے بھائی سے لپٹ گئی عدنان نے جانے اس کے کان میں کیا کہا کہ ایک جھٹکے سے اس نے میری جانب دیکھا...... اس کی سیاہ غزالی آنکھیں شدت حیرت سے مزید پھیل گئیں تھیں۔ میرا سارا جسم بھی جیسے شل ہو گیا تھا، میں نے اسے پہچان لیا تھا وہ وہی تھی ...... میرے سپنوں کی تعبیر مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر تھی۔ عدنان اسے لے کر کمرے کی طرف بڑھا کمرے میں داخل ہونے تک اس کی نگاہیں مجھ پر گڑی رہیں، میری آنکھیں بھی اسی کے ملیح چہرے پر چپکی تھیں...... صمد یار خان کے آدمی کس وقت رخصت ہوئے مجھے علم نہیں تھا۔ میں وہیں ہکا بکا کھڑا کمرے کے خالی دروازے کو تک رہا تھا جہاں سے گزر کر وہ اندر داخل ہوئی تھی۔

داؤد خان نے قریب آ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”کہاں کھو گئے ہو میاں؟“

”لالہ!...... وہ...... وہ...... وہی ہے۔“ میں گڑبڑا گیا تھا۔

اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ”کون وہی ہے یار!......“

”سائرہ وہی ہے...... لالہ!...... میرے خوابوں میں آنے والی۔“

”اچھا............ نئی بات بتائی ہے۔“

”سوری داؤد لالہ...... لیکن مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا...... تم نہیں جانتے وہ میرے لیے کیا ہے؟“ میں جذباتی ہو گیا تھا۔

”شاید تم بھی نہیں جانتے کہ تم اس کے لیے کیا ہو؟...... لڑکی ہونے کے باوجود وہ اپنے حواس سے باہر ہو گئی ہے...... دیکھا نہیں کمرے تک جانے کے لیے اسے اپنے بھائی کا سہارا لینا پڑا۔“

”اندر جائیں لالہ!......؟ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں......“

اس نے کہا۔"ہاں چلو......"اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ ڈرائینگ روم خالی پڑا ہوا تھا۔ اسی وقت اندرونی کمرے سے عدنان باہر نکلا۔

"شیر دل خان! جاؤ اس سے مل لو...... یوں بھی اب وہ تیری منگیتر ہے۔"

میں نے داؤد لالہ کی طرف دیکھا تو اس نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ہاں یار!......اسے مل لو......اب تم ایک دوسرے کے لیے غیر نہیں ہو کہ عدنان کو شرمندگی محسوس کرنے کی ضرورت پڑے۔"

"میں من من وزنی قدموں سے اندرونی کمرے کی طرف بڑھا......دروازہ ہلکے سے ناک کرتے ہوئے میں اندر داخل ہوا۔ وہ بیڈ پر بیٹھی تھی۔ اس نے اپنے چہرے سے نقاب ہٹا دیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی ایک دم کھڑی ہو گئی۔ میرے قدم ایک بار پھر زمین میں گڑ گئے خواب گاہ کی نیل گوں دیواریں مجھے پھولوں کے کنج کی طرح لگ رہی تھیں، شاید میں پھر خواب دیکھ رہا تھا، میرا حلق خشک تھا۔ جانے کتنی دیر میں دیدے پھاڑے اسے گھورتا رہا۔ اس کی سیاہ غزالی آنکھیں بھی میری جانب متوجہ تھیں۔

میں نے تھوک نگلتے ہوئے ہونٹوں کو حرکت دی......ایک سرگوشی سی میرے ہونٹوں سے برآمد ہوئی، گہری خاموشی میں یہ سرگوشی بھی کسی چیخ کی مانند تھی۔ میں نے فقط اس کا نام پکارا تھا۔

"دسس......سائرہ۔"اس ایک نام کی ادائی نے مجھے یقین دلا دیا تھا کہ وہ سپنا نہیں تعبیر تھی۔

"جی......"اس کا لہجہ شہد میں ڈوبا ہوا تھا۔

میرے قدموں میں حرکت ہوئی اور میں اس کی جانب بڑھا......اس نے حیا سے سر کو نیچے جھکا لیا تھا، میں جیسے ہی اس کے قریب پہنچا اس نے غزالی آنکھوں کی جھالر اٹھائی مگر اس کا سر اسی طرح حیا کے بار سے جھکا رہا......وہ ایسا نظارہ تھا جو اس دن کے بعد کبھی بھی میری نظروں سے اوجھل نہ ہو سکا۔

"کیا یہ حقیقت ہے؟"میں نے اس کا ملائم ہاتھ تھامتے ہوئے سرسراتی آواز میں پوچھا۔

"شاید۔"اس کی شہد بھری آواز نے میرے کانوں میں رس گھولا۔

"میرا نام شیر دل خان ہے۔"

"ہاں...... بھیا نے بتادیا تھا۔" اس کی آواز گویا کسی مدھر ساز کی مانند تھی۔

"قید میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟" میں اس کا ملائم ہاتھ سہلاتے ہوئے پوچھا۔

"میں بس ڈری ہوئی تھی۔"

"اچھا بیٹھو......" بیڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے کرسی سنبھال لی۔

"مجھے یقین نہیں آرہا...... آپ میرے سامنے ہیں۔"

"میں نے بھی تمھیں اتنی مرتبہ خواب میں دیکھا ہے کہ آج حقیقت بھی خواب محسوس ہورہی ہے۔"

"بھیا بتارہے تھے کہ انکل اور ابو جان نے............؟ سوال پوچھتے پوچھتے وہ شرما کر نیچے دیکھنے لگی۔

"ہاں یہ سچ ہے...... میں دنیا کا خوش قسمت ترین مرد ہوں۔"

"شاید!...... مجھ سے زیادہ خوش قسمت نہیں ہیں آپ؟" وہ حیا سے بوجھل آواز میں بولی۔

"اچھا پتا ہے......؟ دن بھر میرے ساتھ جو واقعات بھی پیش آتے تھے، ان کا اثر میرے سپنے میں بھی تمھارے چہرے پر نظر آتا تھا...... میرے اچھے کام پر تم خوش نظر آتیں اور غلط کام پر خفا خفا سی لگتیں۔"

وہ حیرانی سے بولی۔"میرے ساتھ بھی بالکل یہی ہوتا تھا...... شاید قدرت نے ہمیں بنایا ہی ایک دوسرے کے لیے ہے؟"

"یقیناً" میں چاہت بھرے لہجے میں بولا۔ اور اس کا چہرہ خوشی سے گلنار ہوگیا۔

اس نے دلچسپی سے پوچھا۔"اچھا میں کس بات پر آپ سے خفا ہوتی تھی؟"

"سائرہ!...... اس کے لیے مجھے اپنی پوری زندگی سے پردہ اٹھانا ہوگا...... کیا اتنا ٹائم ہوگا تمھارے پاس کہ میری بور کہانی سن سکو؟"

"آپ کی آواز سننا میرے لیے سپنے جیسا ہے ایسا سپنا جو میں دیکھ کر نہیں تھکتی۔"

میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ چند لمحوں میں وہ میرے اتنے قریب آجائے گی مجھے اتنی توجہ دینا شروع کردے گی، مگر شاید میں غلط کہہ رہا ہوں یہ چند لمحوں کی بات نہیں بلکہ پچھلے کئی ماہ سے وہ میرے سپنوں کو زینت بنی ہوئی تھی ...... ہم بظاہر پہلی بار مل رہے تھے ورنہ حقیقت میں ہماری روحوں نے جانے کب سے ایک دوسرے کو چن لیا تھا۔

میں اسے اپنی کہانی سنانے لگا......وہ ہمہ تن گوش ہو گئی اور پھر میں بمشکل اپنی بات ختم کر پایا تھا کہ ملازمہ ڈنر کے لیے بلانے آ گئی۔ کھانے کی ٹیبل پر عدنان اور داؤد لالہ ہمارے منتظر تھے۔ سائرہ عدنان کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ ڈنر میں ہلکی پھلکی گپ شپ ہوتی رہی۔ ڈنر کے بعد ہم کافی دیر ڈرائینگ روم میں بیٹھے رہے......البتہ سائرہ چائے پی کر سونے چلی گئی تھی۔ ہم صمد یار خان کے خلاف حکمت عملی ترتیب دینے لگے۔

☆......☆......☆

اس رات بھی وہ میرے سپنے میں آئی مگر نہ تو چپ تھی اور نہ پریشان......اپنے نقرئی قہقہوں کے نغمے میرے کانوں میں بکھیرتی وہ کوئل جیسی آواز کا جادو جگاتی رہی اور پھر پلک جھپکنے میں رات بیت گئی......صبح اذان کے ساتھ ہی میری آنکھ کھلی اور میں اٹھ بیٹھا ہاتھ لے کر میں نے نماز پڑھی اور راشد کو کال کرنے لگا، کافی دنوں سے اس کے ساتھ بات نہیں ہوئی تھی۔ بڑی کوششوں کے بعد موبائل فون کے سپیکر سے اس کی نیند میں ڈوبی ہوئی ''ہیلو'' برآمد ہوئی۔

میں نے اطمینان سے پوچھا۔''سو تو نہیں رہے تھے یار!......؟''

وہ ترکی بہ ترکی بولا۔''نہیں......لنچ کر رہا تھا۔'' اور مجھے ہنسی آ گئی۔

وہ غصے سے دھاڑا۔''کم بخت پٹھان!......میرے لیے یہ آدھی رات کا ٹائم ہے۔''

''تو پھر کیا......؟ کال تو میں نے کی ہے؟ اور میرے لیے یہ صبح کا سہانا ٹائم ہے۔''

''اچھا بکو!......تمھارے پیٹ میں درد کیوں ہو رہا ہے؟''

''سنو گے تو!......شاید خوشی سے جھوم اٹھو۔''

''بھئی!......فی الحال میرا ارادہ، چند گھنٹے مزید سونے کا ہے اس لیے تیری بکواس بعد میں سنوں گا تا کہ اطمینان سے ناچ سکوں۔''

''اوکے AS you wish......ویسے اتنا بتا دوں کہ مجھے میرے سپنوں کی تعبیر مل گئی ہے۔''

''سپنوں کی تعبیر......؟ میں سمجھا نہیں؟'' اس کے لہجے میں حیرانی تھی۔

''مجھے میری سائرہ مل گئی ہے......وہی جو ہمیشہ میرے خوابوں میں آیا کرتی تھی۔''

وہ ہکلایا۔ ”تت...... تم قسم کھاؤ کہ اس وقت نشے میں نہیں ہو؟“

”یہ حقیقت ہے جناب!...... ساری کہانی میں تمھیں بتا چکا ہوں...... اس دن لالہ داؤد، عدنان حیدر اور اس کا باپ بابا جان سے ملنے آئے تھے۔ ہم سب نے مل کر صدیار خان کے خلاف منصوبہ ترتیب دیا اور پھر یہاں پشاور آ کر ہم نے سب سے پہلے صدیار خان کا بیٹا اغوا کر لیا یہ وہی لڑکا ہے جس سے وہ سائرہ کی شادی کرنا چاہ رہا تھا...... بس بیٹے کے اغوا نے اس کی ساری اکڑفوں نکال دی اور وہ نہ صرف سائرہ کو واپس کرنے کے لیے تیار ہو گیا بلکہ اس نے میری واہیات وڈیو بھی ضائع کر دی۔ کل اس کے آدمی سائرہ کو واپس کر گئے تھے۔ وہ بالکل وہی ہے یار گو کہ اس سے پہلے عدنان بھائی مجھے سب بتا چکا تھا، جو میں نے تجھے بھی تفصیل سے بتا دیا تھا، مگر اس کے باوجود مجھے یقین نہیں تھا، یہاں تک کہ کل میں نے اسے بنفس نفیس دیکھ لیا...... وہ بھی مجھے دیکھتے ہی پہچان گئی تھی...... وہ بہت اچھی ہے یار!...... وہی سپنوں والی۔“

”اتنا کچھ ہو گیا اور تم مجھے اب بتا رہے ہو......؟ کم از کم صدیار کے خلاف کام کرنے کا موقع مجھے بھی دیا ہوتا۔“

”یار!...... اگر ضرورت ہوتی تو تمھیں ضرور زحمت دیتا۔“

”شیر دل!...... آئی نو...... کہ تمھیں میری ضرورت نہیں ہے، تمھارے ساتھ کافی مددگار ہیں جو ہر لحاظ سے مجھ سے برتر ہیں، لیکن میری خواہش ہے کہ میں اپنے دوست کے کسی کام آؤں۔“ اس کے لہجے میں دکھ کی آمیزش تھی۔

”یقیناً!...... یہ مجھے شرمندہ کرنے کی کامیاب کوشش ہے...... مگر بخدا میں تمھیں ان کانٹوں میں گھسیٹنا نہیں چاہتا...... دشمنی پالنا ہم پٹھانوں کا دل پسند مشغلہ ہے ہمارے مقابلے میں تمھاری قوم ذرا مہذب ہے، تم شاید ہر وقت کلاشن کوف کندھے سے لٹکا کر نہ گھوم سکو، مگر ہمارا کندھا اگر گن سے خالی ہو تو ہمیں بے چینی ہوتی ہے، ہماری قوم کا ہیرو وہی ہوتا ہے جو ہتھیار کا استعمال اچھا جانتا ہو۔ اس سے پہلے میں نے غلطی کی تھی کہ صدیار خان کے گھر تجھے لے گیا تھا۔ خدانخواستہ اگر اس دن تمھیں کچھ ہو گیا ہوتا تو میں انکل، آنٹی کو کیا منہ دکھاتا...... یہ ساری زندگی کا پچھتاوا تھا...... اللہ پاک کا شکر ہے کہ اس دن ایسا کچھ نہ ہوا......؟ اور آئندہ میں ایسا رسک نہیں لے سکوں گا۔“

”تم نے کبھی میرے قدموں کو ڈگمگاتے محسوس کیا؟“

”نہیں ...... لیکن اپنے دل کو لرزتے ضرور محسوس کیا ہے...... میں پہلے ہی تیرے اتنے احسان لے چکا ہوں جن کا بدلہ چکاتے شاید میری عمر بیت جائے؟ سوری یار! مزید بوجھ اٹھانے کی طاقت نہیں ہے مجھ میں۔“

”تم اس وقت کہاں ہو؟“ اس نے موضوع بدلا۔

”لالہ داود کی کوٹھی پر ہوں۔“

”ذرا ایڈریس دہراؤ...... کافی دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی ہے؟...... تیرا تھوبڑا تو دیکھ لوں۔“

میں اسے ایڈریس بتانے لگا اسی وقت میرے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔

”یس......؟ آ جائیں بھائی؟“

”کون ہے؟“ راشد مستفسر ہوا۔

”شاید ملازمہ ہوگی، ضرور ناشتے کے لیے بلانے............“

دروزاہ ہولے سے وا ہوا اور سائرہ نے اندر جھانکا، الفاظ میرے ہونٹوں پر منجمد گئے تھے۔

”تت...... تم!......؟“ میں ایک دم اٹھ بیٹھا۔

کوئل کی چہکار میرے کانوں میں گونجی۔ ”اندر آ سکتی ہوں؟“

”خوش قسمتی ہوگی اس کمرے کی۔“ میں مسکرایا۔

وہ دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتی اندر داخل ہوئی۔

”ارے بدبخت پٹھان!...... کیا وہی آئی ہے۔“ موبائل فون کے ریسور سے راشد کی چیختی آواز برآمد ہوئی۔

”جی ہاں...... اینڈ گڈ بائی۔“ میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

”کون تھا؟“ وہ بیڈ کے ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”راشد!...... دوست ہے میرا۔“

”ہاں...... آپ ان کا ذکر کر چکے ہیں۔“

”ویسے صبح سویرے یہ بخت کیسے مہربان ہو گیا کہ اتنی من موہنی صورت کے درشن مل گئے؟“

”صبح کہاں ہے جناب!...... ٹائم دیکھو آٹھ بجنے والے ہیں...... نماز پڑھ کر میں نے تھوڑی دیر تلاوت کی

،پھر سوچا آپ سے گپ شپ کر لوں...... کیونکہ بھیا بتا رہے تھے آج مجھے گھر چھوڑنے جائیں گے۔“

”گھر......؟“ میں نے ایک لمحے کو سوچا پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ہاں ایسا کرنا ضروری ہے ۔یہاں ہم اچھی طرح تمہارا خیال نہیں رکھ پائیں گے۔“

وہ ذو معنی لہجے میں بولی۔ ”اگر آپ میرا خیال نہیں رکھ پائیں گے تو پھر کون رکھے گا؟“

”میرا مطلب یہ نہیں ہے جو تم سمجھ رہی ہو؟“

”آپ خود ہی وضاحت کر دیں؟“

”پاگل!...... ابھی ہم نے صدیار خان کے خلاف میدان میں اترنا ہے۔ یہ خبیث نہ صرف تمہاری نانی اور نانا کا قاتل ہے بلکہ یہ میرا اور داؤد لالہ کا بھی جانی دشمن ہے۔ جب تک ہم دھرتی کو اس کے بوجھ سے چھٹکارا نہیں دلا دیتے ہمیں سکون نہیں آئے گا۔“

وہ مسکرائی۔ ”تو کیا، صدیار خان نے منع کیا ہے میرا خیال رکھنے سے؟“

”مذاق اڑا رہی ہو؟“

”نہیں......“ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ ”مجھ سے زیادہ کسی بھی چیز کو اہمیت دو گے تو یقیناً میں برداشت نہیں کر پاؤں گی...... چاہے وہ دشمن کے خلاف لڑائی ہی کیوں نہ ہو؟“

”ایسا ہو سکتا ہے بھلا؟...... تم سے زیادہ اہمیت میں اپنی زندگی کو بھی نہ دوں۔“

”پھر ایسا کیوں کہا؟“

”سوری غلطی ہو گئی......؟“ میں نے کہا اور اس کے نقرئی قہقہے سے کمرے کی فضا جھوم اٹھی۔

”ڈر گئے ناں؟“

”ہاں...... یقیناً تمہاری خفگی سب بلاؤں سے بڑی بلا ہے۔“

”چلو اچھی بات ہے وقت پہ پتا چل گیا...... کم از کم آپ کو بلیک میل کرنے کا گر تو ہاتھ لگ گیا؟“

میں مسکرایا۔ ”چالاک بلی۔“

وہ معصومیت سے بولی۔ ”ویسے مجھے بلیاں بہت پیاری لگتی ہیں؟“

"مگر مجھے صرف تم پیاری لگتی ہو......؟" میں نے کہا اور وہ شرما گئی۔

"اچھا میں آپ کے لیے ناشتا لے کر آتی ہوں۔"

میں نے جلدی سے پوچھا۔ "عدنان بھائی اور لالہ داؤد کہاں ہیں؟"

"وہ سب سوئے ہوئے ہیں۔ عدنان بھائی تو دس گیارہ بجے اٹھتے ہیں۔ اور ملازمہ بتا رہی تھی کہ لالہ داؤد بھی دیر سے جاگتے ہیں۔"

"اچھا سنو میرے لیے ناشتا تم خود بنا کر لاؤ گی۔"

وہ معصومیت سے بولی۔ "مم...... میں پراٹھا بنا تو لیتی ہوں، لیکن وہ کیا ہے کہ گول نہیں بنتا تھوڑا سا ٹیڑھا میڑھا ہو جاتا ہے۔ البتہ انڈا ہاف فرائی کر لیتی ہوں اور چائے، کیک بھی بنا لیتی ہوں۔"

میں نے شرارتی لہجے میں پوچھا۔ "اچھا کیک بنانے میں کتنی دیر لگے گی؟"

"تین گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے۔"

"اچھی بات ہے...... دوپہر کے کھانے کے بعد ناشتا کر لیں گے۔"

وہ جلدی سے بولی۔ "نن...... نہیں...... ناشتے کے لیے تازہ کیک تو نہیں بنایا جا سکتا ناں؟ یہ تو میں نے آپ کو آگاہ کرنے کے لیے کہا ہے...... ابھی آپ ناشتے میں پراٹھا اور ہاف فرائی انڈہ لے لیں ناں؟"

"ٹھیک ہے...... دے دو۔"

"اچھا میں بنا کر لاتی ہوں...... لیکن ہنسنا نہیں ہاں......"

میں ہنسا...... "ناشتے سے پہلے تو ہنس سکتا ہوں ناں؟"

اور وہ شرماتے ہوئے باہر نکل گئی...... اس کے واپس آنے تک میں اسی کے خیالوں میں کھویا رہا...... وہ اتنی جلدی مجھے مل جائے گی یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا اس کی ہر ادا، ہر انداز میں میرے لیے کوٹ کوٹ کر محبت بھری ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ ناشتے کی ٹرے تھامے اندر آ گئی...... وہ ٹیڑھا میڑھا پراٹھا مجھے اتنا لذیز لگا کہ بیان سے باہر ہے۔ میرے ناشتا کرنے تک وہ سامنے بیٹھی پر اشتیاق نظروں سے مجھے گھورتی رہی۔

"آپ نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی کنٹرول کی ہوگی...... ہے ناں؟"

میں نے چائے کا کپ تھاما تو اس نے بے اختیار پوچھا۔

"سچ کہوں تو اتنا لذیذ اور پر لطف ناشتا زندگی میں پہلی بار نصیب ہوا ہے۔"

"جھوٹا۔" وہ ناز سے اٹھلائی۔

"اللہ کی قسم۔" میں نے اس کا ملائم ہاتھ تھامتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

اسی وقت دروازہ پہ ہلکی سی ناک ہوئی۔

"یس......؟" اس کا ہاتھ چھوڑ کر میں ذرا پیچھے ہو گیا۔

"صاحب جی! کوئی راشد صاحب آپ سے ملنے کے لیے آئے ہیں ایک خاتون بھی ان کے ہمراہ ہے۔" ملازم نے اطلاع دی۔

"کہاں ہیں وہ؟"

"ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔"

"ٹھیک ہے......تم چائے لے آؤ۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ بھی میری تقلید میں اُٹھتے ہوتے ہوئے بولی۔"یہ آپ کے دوست ہیں ناں؟"

"ہاں اور ساتھ شاید حنا ہوگی۔" میں نے باہر کی طرف قدم بڑھائے۔

"کون حنا؟" اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ مجھے اپنے قدم روکنے پڑے۔

"راشد کی بہن اور زرغونہ کی دوست ہے، تمھارے بارے میں سب جانتی ہے اب جب اسے پتا چلا کہ میں نے تمھیں ڈھونڈ لیا ہے تو یقیناً تمھیں دیکھنے کا شوق اسے یہاں تک کھینچ لایا ہے۔"

"آپ یقیناً میرے استفسار سے خفا ہوئے ہیں؟" اس کا دمکتا چہرہ ایک دم بجھ گیا۔

"ایسا ہو سکتا ہے بھلا......" میں اسے کندھوں سے تھام کر جذباتی لہجے میں بولا"سائرہ ایک بات یاد رکھنا ......میں صرف تمھارا ہوں......صرف تمھارا۔"

وہ بے ساختہ بولی۔"اور میں صرف آپ کی ہوں۔" یہ کہتے ہی اس نے شرما کر نگاہیں جھکا لی تھیں۔

''مجھے معلوم ہے۔'' میں ایک بار پھر باہر کی جانب بڑھ گیا...... میں جانتا تھا کہ حنا کے نام نے سائرہ کی نسوانی حس کو چونکا دیا تھا، اگر میں فی الفور اس کے ذہن سے یہ غلط فہمی دور نہ کرتا تو بعد میں یہ غلط فہمی کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ یوں بھی میرے نزدیک حنا کی اہمیت اتنی زیادہ نہیں تھی کہ میں سائرہ کو خفا کر دیتا...... وہ سائرہ جو میرے دل کی دھڑکن تھی۔ جس کے لیے میں نے اپنی فطرت کے خلاف چلنا شروع کر دیا تھا، اس سائرہ کے لیے، حنا کے اظہار محبت کو بھلا دینا اتنا مشکل نہیں تھا۔ دونوں بہن، بھائی شدت سے میرے منتظر تھے۔ مجھے دیکھتے ہی راشد بازو پھیلاتے ہوئے میری جانب بڑھا۔

سائرہ نے بھی ''اسلام علیکم!......'' کہہ کر حنا کی جانب مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا حنا صحیح معنوں میں پنجابی کڑی تھی...... گوری، چٹی، اونچی لمبی اور صحت مند وہ کسی بھی مرد کی راتوں کی نینداور دن کا سکون اڑا سکتی تھی لیکن سائرہ دودھاری تلوار تھی۔ اس کا باپ پنجاب کا گھبرو تھا تو ماں خالص پٹھان، خود اس میں دونوں قوموں کی خصوصیات جمع تھیں، پنجابن کڑیوں کی طرح اونچی، گوری اور پٹھانیوں کی طرح سرخ وسفید،...... اس کی موجودگی میں حنا کی ساری دلکشی ماند پڑ گئی تھی۔

حنا نے سائرہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''تو آپ ہیں سائرہ چودھری؟''

''جی باجی!'' سائرہ کے لہجے میں خلوص کی مہک تھی۔

''کیسی ہو مس حنا؟'' راشد سے علیحدہ ہو کر میں حنا سے مخاطب ہوا۔

''فائن۔'' وہ پھیکی مسکراہٹ سے بولی۔

''بیٹھیں۔'' میں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

''تھینکس۔'' حنا بولی۔ جب کہ راشد گہری نظروں سے سائرہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''شیر دل !...... ویسے اپنے یا سر نے بھابی کی تصویر تو ہو بہو بنائی تھی؟''

اس کی بات سن کر سائرہ شرما کر نیچے دیکھنے لگی۔

''صحیح کہا یار!...... اور وہ تصویر میرے لیے نیک شگون بھی ثابت ہوئی کہ اس کے بعد اتنی جلدی مجھے سائرہ

مل گئی۔"

"میرا خیال ہے ایک لڑکی نکاح کے بعد ہی کسی مرد کی ملکیت تصور کی جاتی ہے؟" حنا نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"بجا فرمایا باجی!......" میں نے نہلے پہ دہلا مارا۔ "لیکن ہمارے بزرگوں نے فیصلہ سنا دیا ہے اور بزرگوں کی منظوری نکاح ہی کے برابر ہوتی ہے۔"

حنا کو باجی کہنے پر سائرہ کا چہرہ کھل گیا تھا جبکہ حنا ہونٹ بھینچے اپنے ہاتھوں کو گھورنے لگی۔

"انکل آنٹی کیسے ہیں؟" میں نے موضوع بدلتے ہوئے راشد سے پوچھا۔

"ٹھیک ہیں......تم سناؤ داؤد خان کو اب تو کوئی گلہ باقی نہیں رہا ہوگا؟"

"ہاں یار!......بہت خوش ہیں......اصل میں وہ مجھے بہت چاہتے ہیں لیکن میری نرم دلی جسے آسانی سے بزدلی کہا جا سکتا ہے انھیں سخت ناپسند تھی۔"

"اسلام علیکم!......" لالہ داؤد ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔

"وعلیکم اسلام!" کہہ کر میں اور راشد اس کے استقبال کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"غالباً آپ شیر دل کے دوست راشد ہیں؟"

میں نے کہا۔ "صحیح پہچانا۔"

"اور یہ......؟" اس نے حنا کے جھکے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"میری بہن ہے۔" راشد جلدی سے بولا۔

"بیٹھیں پلیز۔" لالہ داؤد بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گیا۔

"کیسے تشریف آوری ہوئی جناب؟" لالہ داؤد نے راشد سے پوچھا۔

راشد نے ہنستے ہوئے کہا۔ "شیر دل کو مبارک باد دینی تھی۔"

"واقعی جناب!......آپ کا دوست مبارک باد کے قابل ہے......یہ سارا منصوبہ اسی کا تھا اور پھر خالی منصوبہ بنانے سے کچھ نہیں ہوتا اصل کام ہوتا ہے منصوبے پر عمل کرنا اور یقین کرو ساری کارروائی میں شیر دل کا کردار بہت نمایاں ہے۔ چلتی گاڑی سے متحرک ٹارگٹ کو نشانہ بنانا بہت مشکل کام ہے۔ شیر دل نے نہ صرف یہ کیا بلکہ

اس تخمِ خنزیر کو بھی پکڑ کر اپنی کار میں ڈالا اور بڑی صفائی سے یہاں سے لے آیا۔“

”صحیح کہا داؤد صاحب!......شیر دل، نام کا نہیں حقیقی شیر ہے۔“ راشد کے لہجے میں فخر کی جھلک تھی۔

”گویا تم مجھے جانور سمجھتے ہو......؟“ میں نے راشد کو گھورا۔

”ہا......ہا......ہا......“ لالہ داؤد کا قہقہہ سب سے بلند تھا۔ سائرہ کے چہرے پر بھی شوخ سی مسکراہٹ ابھری تھی، جبکہ حنا ہنسی روکنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

”میرے پاس جواب تو بہت اچھا ہے مگر افسوس یہاں اور پٹھان بھی موجود ہیں۔“

”یارا!......چھوڑو پٹھانوں کو۔“ لالہ داؤد نے اسے شہ دی۔

راشد نے کہا۔ ”عقل بھی یہی کہتی ہے۔“

”کیا............؟“ لالہ داؤد نے بے ساختہ پوچھا۔

”یہی......کہ چھوڑو پٹھانوں کو۔“

اس مرتبہ ہنسنے والوں میں، میں بھی شامل تھا۔ اسی گپ شپ کے دوران عدنان حیدر بھی وہاں پہنچ گیا۔ مہمانوں سے ملنے کے بعد وہ بھی ایک سائیڈ پر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر اسی گپ شپ میں گزری، پھر لنچ کا ٹائم ہو گیا۔ کھانے کے دوران عدنان حیدر نے کہا۔ ”لنچ کے بعد سائرہ کو گھر چھوڑنے جانا ہے۔“

”کیوں؟“ میں نے بے ساختہ پوچھا۔

”عدنان صحیح کہہ رہا ہے یہ وہاں محفوظ رہے گی۔“ لالہ داؤد نے تائید میں سر ہلایا۔

بات میری عقل میں بھی آ گئی تھی۔ میں نے کھانے سے ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔ ”جیسے آپ لوگوں کی مرضی۔“ اور کولڈ ڈرنک کا گلاس بھر کر اٹھا لیا تاکہ انھیں محسوس نہ ہوا اچانک مجھے احساس ہوا کہ کوئی مجھے گھور رہا ہے۔ میں نے سرسری انداز میں سب کی طرف نگاہ دوڑائی، وہ سائرہ تھی اور آنکھ کے اشارے سے مجھے کھانے کی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے دوبارہ اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہونا پڑا ...... کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس نے بھی کھانا نہیں کھانا تھا۔ حنا کے سوا کسی نے بھی یہ بات محسوس نہیں کی تھی مگر وہ کنکھیوں سے ہم دونوں پر نگاہ

رکھے ہوئے تھی۔

دوبارہ میں اس وقت تک پلیٹ سے جڑا رہا جب تک کہ سائرہ کھانے فارغ نہیں ہو گئی تھی۔

"اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟" میں نے راشد سے پوچھا۔

وہ اطمینان سے بولا۔" حنا کو گھر چھوڑ کر آپ لوگوں کے ساتھ چلوں گا۔"

لالہ داؤد نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔"نہیں فی الحال آپ آرام کریں کل ہماری واپسی ہو گی گجرات سے پھر یہیں آجانا۔"

عدنان جلدی سے بولا۔" میرا تو خیال ہے آپ تمام کے آنے کی ضرورت نہیں ہے میں سائرہ کو چھوڑ آتا ہوں۔"

لالہ داؤد نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔"تمہارا خیال غلط ہے۔ان حالات میں ہم میں سے کسی کا بھی اکیلے سفر کرنا جان گنوانے کے مترادف ہے،خاص کر جب ساتھ میں کوئی عورت ہو؟ کیونکہ اس کی موجودگی مرد کو بے بس کر دیتی ہے۔صمد یار خان کے آدمی ہماری تاک میں ہوں گے،اسے ہم نے جو چوٹ پہنچائی ہے وہ اتنی آسانی سے نہیں بھلا پائے گا۔"

راشد نے کہا......"ٹھیک ہے جناب!......آپ لوگ جانے کی ترتیب بنائیں اور ہمیں اجازت دیں۔"اس کی بات سن کر حنا بھی کھڑی ہو گئی تھی۔

میں انھیں رخصت کرنے گیٹ تک آیا۔کار میں بیٹھنے سے پہلے راشد مجھ سے معانقہ کرتے ہوئے بولا۔"خان صاحب!......اپنا خیال رکھنا......اور یاد رکھنا مبالغہ ہر حالت میں غلط ہوتا ہے انسان کو معتدل رہنا چاہیے۔پہلے تم حد درجہ امن پسند تھے۔اتنے کہ بزدل کہلائے گئے اب یہ نہ ہو بہادری کے ہاتھوں بے وقوف بن جاؤ احتیاط کا دامن ہاتھ سے کبھی نہ چھوڑنا۔"

میں مسکرایا۔"ٹھیک ہے انکل!......"

وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا،حنا نے دوسری طرف جا کر فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا اور بیٹھنے سے پہلے بولی۔"شیر دل! آئی ایم سوری......شاید آپ کو میری بات بری لگی؟"

"ہاں بہت بری لگی ......"میں نے بغیر کوئی لگی لپٹی رکھے جواب دیا۔"سائرہ میری ہے اور میری

رہے گی، چاہے دنیا کو اچھا لگے یا برا......اور جو کوئی بھی ایسی بات کرے گا جس سے ہم الگ الگ نظر آئیں مجھے برا لگے گا۔“

”اگین سوری شیر دل صاحب!......“ حنا کی آنکھوں میں نمی جھلکی۔

”اٹس اوکے......“ میں نے گہری سانس لیا۔ ”تم میرے لیے اتنی ہی محترم ہو جتنی زرغونہ یا سائرہ ہے......“ میں نے تھوڑا سا وقفہ لیا اور پھر کہا۔ ”کاش وہ سب ممکن ہوتا جو تم چاہتی ہو۔“ یہ کہتے ہی میں اس کا جواب سنے بغیر پیچھے مڑ گیا۔ وہ بہت خوبصورت، بہت اچھی اور دلکش تھی......اس قابل تھی کہ اسے ہمیشہ کے لیے جیون ساتھی چنا جاتا، مگر میں مجبور تھا۔ سائرہ کے بغیر مجھے زندہ رہنا بھی دشوار لگتا تھا۔

وہ تمام میرا انتظار کر رہے تھے۔

”تو کیا فیصلہ ہوا ہے؟“ میں نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

لالہ داؤد نے جواب دیا۔ ”ہم دس منٹ میں گجرات کے لیے نکلنے والے ہیں۔“

میں سر ہلا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم راولپنڈی کی طرف رواں دواں تھے۔ ہم دو گاڑیوں میں سوار تھے۔ سب سے آگے میں عدنان، لالہ داداور سائرہ تھے پچھلی گاڑی میں لالہ داؤد کے چار آدمی سوار تھے۔ محافظوں کی وجہ سے ہم نے اپنے پاس پسٹل رکھنے پر اکتفا کیا تھا۔ میرے پاس اپنا ذاتی بریٹا پسٹل موجود تھا۔ عدنان حیدر کو بھی داؤد نے ایک تیس بور پسٹل دے دیا تھا جلدی ہی ہم پشاور سے نکل آئے تھے اور پھر جیسے ہی ہم نوشہرہ کراس کر کے آگے بڑھے۔ میری سماعتوں میں ایک زوردار دھماکے کی آواز آئی۔ ڈرائیونگ عدنان کر رہا تھا، سائرہ اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی......اس نے بے اختیار بریک لگائی، میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، لالہ داؤد کے محافظوں کی جیپ قلابازیاں کھاتی ہوئی روڈ سے نیچے جا رہی تھی۔ میری نظر جیپ پر ہی تھی ،ان آدمیوں کا بچنا ناممکن لگ رہا تھا۔ اچانک گولی چلنے کا دھماکا ہوا، کار کا عقبی شیشہ چھناکے سے ٹوٹ گیا تھا ۔اس کے ساتھ ایک کار زن سے ہمارے قریب سے گزری اور آگے روڈ پر ترچھی کھڑی ہو گئی، یقیناً وہ ہمارا رستا بند کر رہے تھے،اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ ہمارے پیچھے بھی ان کی گاڑی موجود ہے اور انھوں نے ہمیں وہیں گھیرنے کا پروگرام بنایا ہوا ہے۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی میں ہوا تھا کہ ہم تمام جیسے سن ہو گئے تھے۔

سامنے والی کار کی کھڑکی سے کلاشن کوف کی نال برآمد ہوئی اور گولیوں کا برسٹ ہماری کار پر فائر ہوا، نال کو دیکھتے ہی میں چیخا۔

''سب نیچے جھک جاؤ......'' میرا بروقت چیخنا کام آ گیا تھا۔

کلاشن کوف کے برسٹ نے ونڈ سکرین کو کرچیوں میں بدل دیا تھا۔ میرا ہاتھ جیب میں رینگا اور اگلے لمحے بریٹا پسٹل میرے ہاتھ میں تھا...... میں نے ذرا سا سر اٹھا کر سامنے دیکھا ایک آدمی کار سے اتر کر دوڑتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا...... کلاشن کوف اس نے دونوں ہاتھوں میں تھامی تھی اور وہ فائر کرنے کے لیے تیار تھا۔

اگر وہ قریب پہنچ جاتا تو ہمارا بچنا ناممکن تھا...... میں نے ایک دم پسٹل سیدھا کیا، اگلے ہی لمحے۔ ''ٹھائیں ٹھائیں۔'' کی آواز سے فضا گونج اٹھی۔

دونوں گولیاں آنے والے حملہ آور کی چھاتی میں لگی تھیں۔ وہ الٹ کر پیچھے گرا فائر کرتے ہی میں چیخا

''عدنان گاڑی دائیں طرف نیچے اتار لو...... تیز......''

کار سٹارٹ تھی عدنان نے جلدی سے گیئر لگایا اور کار روڈ سے نیچے اتار لی۔ آگے صاف میدان تھا۔

میں نے ہدایت جاری کی۔ ''ناک کی سیدھ میں چلتے رہو...... اپنے بائیں ہاتھ دیکھو تمھیں لنک روڈ نظر آ رہا ہوگا تھوڑا آگے جا کر اسی لنک روڈ پر چڑھ جانا ہے۔''

عدنان نے فقط اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔ اسی وقت مخالفین کی جانب سے گولیوں کی تڑتڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ انھوں نے ہماری کار کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔

''سیدھے چلنے کے بجائے کار کو زگ زیگ کے انداز میں چلاؤ۔'' میں نے چیخ کر عدنان کو ہدایت کی اور پھر عقب کا جائزہ لینے لگا۔ وہ تین گاڑیوں میں سوار تھے اور تینوں اس وقت ہمارے تعاقب میں مین روڈ چھوڑ کر نیچے اتر آئی تھیں، عدنان کار کو آندھی وطوفان کی طرح لنک روڈ کی طرف بھگائے جا رہا تھا۔

میں نے کھڑکی سے باہر سر نکالا تا کہ انھیں نشانہ بنا سکوں، اسی وقت تڑتڑاہٹ کی آواز گونجی ایک ساتھ تین گنوں سے فائر ہوا تھا۔ میں نے ایک دم سر اندر کھینچا اور نیچے جھک گیا۔ لالہ داؤد اور سارہ بھی نیچے ہو گئے تھے۔ عدنان کو اسٹیرنگ پر جھکنا پڑا۔ عقبی شیشہ ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا اور کئی گولیاں کار کی ڈگی میں گھس گئی تھیں،

خوش قسمتی سے ٹائر محفوظ رہے تھے۔لیکن کب تک؟؟؟......کوئی بھی بھولی بھٹکی گولی ہماری کار کو لنگڑا کر سکتی تھی اور اس کے بعد پستولوں کے سہارے خود سے دگنی، تگنی تعداد کے کلاشنکوف برداروں سے مقابلہ کرنا یقیناً ناممکن ہو جاتا۔

میں نے پیچھے مڑ کر ذرا سا سر اٹھا کر دیکھا،ان کی دو گاڑیاں ہماری کار سے بیس پچیس قدم دور تھیں جبکہ تیسری گاڑی ان سے پیچھے تھی۔میں نے ایک کار کے ٹائر کا نشانہ لینے کی کوشش کی مگر ہماری کار مسلسل لہرا کر چل رہی تھی ایسی صورت میں، دشمنوں کی کار کے ٹائر کو نشانہ بنانا ناممکن نہیں تو نہایت مشکل ضرور تھا۔سب سے بڑا مسئلہ ہتھیار کا تھا،پسٹل سے یوں بھی نشانہ لگانا بہت مشکل ہوتا ہے۔چند گولیاں ٹائر پر ضائع کرنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ فقط گولیوں کا ضیاع ہے۔

''ٹرچ ٹرچ۔'' کی آواز نے مجھے میگزین کے خالی ہونے کی خبر دی۔میگزین بدل کر میں ڈرائیور کو نشانہ بنانے کی کوشش کرنے لگا۔قسمت نے ساتھ دیا اور تیسری گولی ڈرائیور کے سر میں پیوست ہو گئی۔ان کی کار بڑی طرح لہراتے ہوئے دائیں طرف مڑی اور پھر ایک پتھر سے ٹکرا کر قلابازیاں کھاتے ہوئے الٹ گئی۔دوسری گاڑیوں نے ڈر کر تھوڑا سا فاصلہ بڑھا دیا تھا۔

''شاباش شیر دل خانا!......'' لالہ داؤد نے تحسین آمیز نعرہ بلند کیا۔اس کے چہرے پر ذرا بھر بھی خوف نہیں تھا

عدنان نے کار لنک روڈ پر چڑھائی اور سپیڈ بڑھا دی۔چند لمحوں بعد دشمنوں کی دونوں کاریں بھی روڈ پر تھیں۔لیکن اس وقت تک عدنان مزید فاصلہ بڑھانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔چند فرلانگ دور ایک پہاڑی نظر آ رہی تھی جس کے ساتھ سے ہو کر روڈ بائیں طرف مڑ رہا تھا۔

میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی اور میں نے فی الفور اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ اتنا ٹائم نہیں تھا کہ میں تمام سے مشورہ لے سکتا۔''عدنان!......سپیڈ تھوڑی اور بڑھاؤ لیکن موڑ مڑتے ہی کار روڈ کے درمیان میں روک لینی ہے اور جتنی جلدی ہو سکے تمام نے اتر کر پتھروں کی آڑ لے لینی ہے۔''

''مگر......؟'' لالہ داؤد نے اعتراض کرنا چاہا۔

''اگر مگر کا وقت نہیں ہے۔'' میں قطع کلامی کرتے ہوئے بولا اور لالہ داؤد نے چپ سادھ لی۔

عدنان نے فل ایکسی لیٹر دبا دیا۔ موڑ مڑنے سے پہلے ہی اس نے ایک دم سپیڈ کم کی اور پھر موڑ مڑتے ہی اس نے کار روڈ کے عین درمیان میں کھڑی کر دی، روڈ اتنا کھلا نہیں تھا کہ، اس کے دائیں بائیں سے کوئی دوسری گاڑی کراس کر سکتی۔ ہم تیزی سے باہر نکلے، خوش قسمتی سے قریب ہی دو تین بڑی بڑی چٹانیں نظر آ گئیں۔

میں چیخا...... "جلدی کرو چٹانوں کی آڑ لے لو۔"

عدنان نے سائرہ کا بازو پکڑا ہوا تھا، دونوں بہن بھائی خوفزدہ نظر آ رہے تھے۔ ہم بمشکل چٹانوں کے پیچھے لیٹ پائے تھے کہ دشمنوں کی پہلی کار نے زن سے موڑ کاٹا...... موڑ کاٹتے وقت اس نے سپیڈ کم کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اور وہی ہوا جیسا میں نے سوچا تھا ڈرائیور نے آخری وقت میں اسٹیئرنگ کاٹتے ہوئے بریک لگانے کی کوشش کی لیکن کار ایک دھماکے سے عدنان کی کار کی ڈگی کی دائیں سائیڈ سے ٹکرائی اور لڑھکیاں کھاتی روڈ سے نیچے اتر گئی۔ دوسری کار والے نے ایک دم بریک لگا کر سٹیئرنگ کاٹا، کار کا رخ بائیں ہوا اور کار کی دائیں سائیڈ عدنان کی کار سے ٹکرائی، مگر کار الٹنے سے بچ گئی تھی۔ کار میں موجود آدمی جب تک سنبھلتے میں اور لالہ داؤد ان کے سر پر پہنچ گئے تھے ہمارے پسٹل ایک ساتھ گرجے اور کار میں موجود تینوں آدمی خون میں نہلا گئے تھے۔ انھیں موت کے گھاٹ اتارتے ہوئے ہمیں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ ہمیں قتل کرنے آئے تھے اس لیے ہمارے دلوں میں ان کے لیے ذرا بھر بھی ترس نہیں تھا۔

ان تینوں کی طرف سے بے فکر ہوتے ہی ہم نیچے گری کار کی طرف بڑھ گئے۔ اُس کار میں صرف دو آدمی تھے، ڈرائیور کی چھاتی اسٹیئرنگ کے دباؤ سے پچک گئی تھی۔ البتہ عقبی نشست پر موجود آدمی زندہ تھا۔ میں نے پسٹل اس کی طرف سیدھا کیا مگر لالہ داؤد نے میرے پسٹل کی نال نیچے جھکاتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں شیر دل!...... اس سے تو کافی کچھ پوچھنا ہے۔"

"ہم نے اسے کھینچ کر باہر نکالا اس کا ایک بازو ٹوٹ گیا تھا۔ وہ مسلسل کراہ رہا تھا۔ گاڑی کے قلابازیاں کھانے کے دوران اس کی کلاشن کوف گاڑی سے باہر گر گئی تھی۔

"کیا نام ہے تمھارا......؟" میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

لالہ داؤد جلدی سے بولا۔ "نہیں شیر دل!...... یہاں نہیں...... یہاں کوئی بھی آ سکتا ہے۔"

”چلو پھر......“میں نے بغیر کوئی سوال کیے صمد یار خان کے آدمی کو گریبان سے پکڑ کر کھڑا کیا اور اسے آگے کی طرف دھکا دیا۔

وہ لڑکھڑاتے ہوئے چل پڑا۔سائرہ اور عدنان چٹان کے پیچھے سے نکل کر روڈ پر آ گئے تھے۔سائرہ نے میری طرف دیکھ کر نظروں ہی نظروں میں میری خیریت دریافت کی ،اور میں نے مسکراتے ہوئے بالکل ٹھیک ہونے کا اشارہ کر دیا۔اس کے چہرے پر سے خوف کے سائے چھٹ گئے تھے۔عدنان بھی مطمئن نظر آ رہا تھا۔

میں نے دشمنوں کی کار کی کھڑکی کھول کر کار سٹارٹ کی اور روڈ سے نیچے اتار کر کھڑی کر دی۔عدنان کی کار کی ڈگی میں بہت بڑا ڈینٹ پڑ گیا تھا،مگر کار آسانی سے سٹارٹ ہو گئی تھی۔عدنان نے ایک مرتبہ پھر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی،سائرہ بھائی کے ساتھ بیٹھ گئی تھی۔صمد یار کے آدمی کو درمیان میں بیٹھا کر ہم واپس روانہ ہو گئے۔

”کہاں جائیں گے......؟“مین روڈ قریب آتے ہی عدنان نے پوچھا۔

لالہ داؤد نے کہا۔”واپس پشاور۔“اور عدنان نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کار واپسی کی راہ پر ڈال دی ۔اچانک کار کی اندرونی فضا موبائل فون کی ٹون سے گونج اٹھی۔قیدی کا موبائل فون بج رہا تھا۔

میں نے اسے ٹہوکا دیا۔”چیک کرو کس کا فون ہے؟“

وہ کراہتے ہوئے جیب سے موبائل فون نکالنے لگا۔

”خ......خان صاحب کا ہے؟“وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔

خان صاحب سے اس کی مراد یقیناً صمد یار خان تھا۔

”کال اٹینڈ کرو......اور اسے بتاؤ تم نے ہمیں گرفتار کر لیا ہے۔اسے اپنی تباہ ہونے والی دونوں کاروں کا بھی بتا دینا......کہنا کہ صرف تمھاری کار بچی ہے۔اور خبردار اگر اسے اصل بات بتانے کی کوشش کی ، یقین مانو ہمارا ساتھ دے کر ہی تم اپنی جان بچا سکتے ہو۔“

میری بات مکمل ہونے تک موبائل فون کی گھنٹی بند ہو چکی تھی۔اس نے سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھا۔میں نے کہا۔”کال بیک کرو۔“مگر اس سے پہلے ہی دوبارہ صمد یار خان کی کال آنے لگی۔

”جی خان جی......!“اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کال اٹینڈ کی۔میں نے ہاتھ بڑھا کر لاؤڈ سپیکر کا بٹن

آن کردیا۔ دوسری طرف سے صمدیار خان کی مکروہ آواز ہماری سماعتوں میں زہر گھولنے لگی۔

''یامین خان!......کال کیوں نہیں اٹینڈ کر رہے تھے؟''

''خان جی!......فائرنگ کے شور شرابے میں موبائل فون کی گھنٹی ہی سنائی نہیں دی۔''

''کیا ہوا ان خنزیر کے تخموں کا؟''

''خان جی!......تمام کو پکڑ لیا ہے......البتہ ہماری دو کاریں تباہ ہو گئی ہیں اور ان میں موجود تمام آدمی مر گئے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں......زندگی، موت تو دشمنی کا ثمر ہے۔'' صمدیار خان کے لہجے میں اپنے آدمیوں کی موت کے غم سے زیادہ دشمنوں کی گرفتاری کی خوشی تھی۔ ''یہ بتاؤ کہ وہ تمام بچ گئے ہیں؟''

یامین نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور میں نے تین انگلیاں اٹھا دیں وہ جلدی سے بولا۔

''نہیں خان جی!......ان میں سے بھی تین بچ پائے ہیں۔''

''لڑکی زندہ ہے؟''

وہ میری جانب ہی دیکھ رہا تھا......میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''نہیں خان جی!......وہ ماری گئی ہے۔''

''کوئی بات نہیں......تم ان تینوں کو گاؤں والی حویلی میں پہنچا دو۔''

یامین نے کہا۔ ''ٹھیک ہے خان جی۔'' اور صمدیار خان نے رابطہ منقطع کر دیا۔

''تم نے خود کو زندہ رہنے کا حق دار ٹھہرا لیا ہے۔'' میں نے اس کے ہاتھ سے موبائل فون لیتے ہوئے کہا۔

''اب کیا ارادہ ہے؟'' داود لالہ نے پوچھا۔

بغیر کسی مشورے کے سارے مجھے کمانڈر سمجھنے لگے تھے۔

''بابا جان کے پاس چلتے ہیں......سائرہ کو وہیں چھوڑیں گے، اور تیاری کر کے صمدیار خان کی حویلی پر حملہ بولیں گے۔''

''مطلب میں اپنے آدمیوں کو وہیں بلا لوں؟''

میں نے پوچھا۔ ''کتنے آدمی ہوں گے تمہارے پاس؟''

''چار تو آج چل بسے...... باقی دس ہو جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے انھیں کال کر کے بتا دو......'' اور داؤد لالہ موبائل فون نکال کر اپنے آدمیوں کو کال کرنے لگا۔

عدنان نے کہا۔ ''میں بھی ابو جان کو کہہ کر اپنے آدمی بلوا لیتا ہوں؟''

میں نے کہا۔ ''نہیں ......وہ لیٹ ہو جائیں گے۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ داؤد لالہ کے دس آدمیوں کے علاوہ تین آدمی ہم خود ہیں...... مہردل خان بھی ہے اور ضرورت پڑی تو چند آدمی گاؤں سے بھی لے لیں گے؟''

داؤد لالہ کال منقطع کرتے ہوئے بولا۔ ''گیارہ آدمی رستے میں ہمارے منتظر ہوں گے۔''

''کافی ہیں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

پشاور کراس کرتے ہی عدنان نے کار ہمارے گاؤں کے رستے پر ڈال دی پشاور کی حدود سے نکلنے سے پہلے ہی داؤد لالہ کے آدمی ہم سے آن ملے تھے۔ قیدی کو اپنے آدمیوں کے حوالے کر کے وہ دوبارہ میرے پاس آ بیٹھا ۔رات کے نو بج رہے تھے جب ہم گھر پہنچے۔ مہمانوں کو حجرے میں بٹھا کر میں عدنان اور سائرہ کو لے کر گھر کی طرف بڑھا، بابا جان نماز پڑھ کر سونے کی تیاری کر رہے تھے، مجھے دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھے۔

''شیر دل خانا!......تم کس وقت پہنچے؟''

''ابھی، بابا جان!......میرے ساتھ مہمان بھی ہیں۔'' میں نے عدنان اور سائرہ کو آگے بڑھنے کا موقع دیا۔

''عدنان بیٹا!'' بابا جان عدنان کو آواز دے رہے تھے کہ ان کی نظر سائرہ پر پڑی۔

''او امارا بیٹی آیا اے!......'' بابا جان فرط مسرت سے اٹھ کر سائرہ کی طرف بڑھے اور اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پیشانی کو چوم لیا۔

''کیسا اے امارا بیٹیا......؟''

''بابا جان! زہ پختو کے خبرے کولے شم۔'' (بابا جان میں پشتو میں بات کر سکتی ہوں)

اس کی پشتو اتنی صاف اور شستہ تھی کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ بابا جان بھی دنگ رہ گئے تھے۔

"آخر بیٹی کس کی ہے۔" بابا جان فخر سے بولے۔

اسی وقت زرغونہ اور مہر جان بابا جان کے کمرے میں داخل ہوئے۔اور بابا جان فخر سے سائرہ کا تعارف کرانے لگا۔پھر مور جان بھی وہیں پہنچ گئیں۔عورتوں کو آپس میں گفتگو کرتا چھوڑ کر میں نے بابا جان اور مہر دل سے کہا۔"حجرے میں اور مہمان بھی بیٹھے ہیں۔"

بابا جان نے کہا۔"چلو انھی کے پاس چلتے ہیں۔اور مہر دل خان تم جلدی سے مرغی ذبح کر دو مہمانوں نے کھانا بھی کھانا ہوگا؟"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔"ایک مرغی سے کام نہیں چلے گا بابا جان۔"

"تین،چار مرغیاں ذبح کر لے یار!......مرغیوں کی کوئی کمی ہے؟"

"قریباً پندرہ آدمی ہوں گے۔" میں نے مہر دل خان کو مہمانوں کی تعداد بتائی اور بابا جان کے ہمراہ حجرے کی طرف بڑھ گیا۔عدنان بھی ہمارے ساتھ تھا۔

تمام سے مصافحہ کر کے بابا جان بیٹھ گئے۔لالہ داؤد نے بابا جان کو ساری بات تفصیل سے بتائی،میرے کارنامے سن کر بابا جان کا سینہ فخر سے چوڑا ہو گیا تھا۔وہ یقیناً اول دن سے مجھے ایسا ہی دیکھنے کے خواہشمند تھے۔

"تو اب کیا کرنے کا ارادہ ہے؟" لالہ داؤد کی بات ختم ہوتے ہی بابا جان نے پوچھا۔

وہ بولا۔"شیر دل کا کہنا ہے کہ صمد یار خان کو مزید مہلت نہ دی جائے،ورنہ اس کی جارحیت جاری رہے گی اور کسی بھی وقت وہ ہمیں نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو سکتا ہے؟"

"گویا یہ آدمی اسی مقصد کے لیے ساتھ لائے ہو؟"

"جی چچا جان۔"

بابا جان نے پوچھا۔"یہ بات کنفرم ہے کہ وہ اپنی گاؤں والی حویلی میں ہے؟"

"جی ہاں اس کی اپنے آدمی سے اس موضوع پر بات ہو چکی ہے۔"

لالہ داؤد نے قیدی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔لالہ داؤد کے آدمیوں نے قیدی کا مضروب بازو ایک کپڑے کے ذریعے اس کی گردن سے لٹکا دیا تھا۔

"ٹھیک ہے کس وقت جانا ہے؟ مہردل خان اور میں بھی ساتھ چلیں گے۔"

"چچا جان! آپ کی تو بالکل ضرورت نہیں البتہ مہردل خان کو ضرور ساتھ لے جائیں گے۔"

بابا جان نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "صحیح کہتے ہوئے یار! ایسے موقع پر تو ہم بوڑھے بوجھ ہی بن جاتے ہیں؟"

داؤد لالہ نے جلدی سے بات سنبھالی۔ "نہیں چچا جان!...... گھر کی دیکھ بھال کے لیے بھی تو کوئی موجود ہونا چاہیے۔"

"یہ بھی خوب کہی۔" بابا جان بچے تو نہیں تھے کہ لالہ داؤد کی تسلی کو نہ سمجھ پاتے۔

"شیر دل خانا!...... کھانے کا پتا کرو مزید کتنی دیر لگے گی۔"

میں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ حجرے کے دروازے تک ہی پہنچا تھا کہ یامین کا موبائل فون بجنے لگا، صمد یار خان کی کال تھی۔ میں جلدی سے واپس مڑا اور یامین سے کہا۔ "صمد یار کی کال ہوگی۔ وہ دیر ہو جانے کا پوچھے تو بتا دینا کہ کار خراب تھی۔" یہ کہہ کر میں نے موبائل فون اس کی جانب بڑھا دیا۔ موبائل فون کی گھنٹی بجتا بند ہو گئی تھی، مگر مجھے معلوم تھا کہ صمد یار خان دوبارہ کال ضرور کرے گا، اور میرا اندازہ صحیح ثابت ہوا، موبائل فون دوبارہ بجنے لگا۔

"جی خان جی؟" یامین نے کال اٹینڈ کرتے ہی خود بخود سپیکر بھی آن کر دیا تھا۔

"یامین خان!...... تم ابھی تک کیوں نہیں پہنچے؟"

"خان صاحب!...... میں دشمنوں کی کار ہی میں انھیں لا رہا ہوں، لیکن کار کی حالت کوئی اتنی بہتر نہیں ہے کہ میں رفتار بڑھا سکوں۔"

"تمھاری اپنی گاڑیاں کہاں ہیں؟" صمد یار خان نے غصیلے انداز میں پوچھا۔

"ہماری دو کاریں تو الٹ گئیں تھیں اور ان میں موجود کوئی بھی آدمی نہیں بچا غصے میں آ کر میں نے اپنی کار دشمنوں کی کار سے ٹکرا دی تھی۔ گو کہ اس طرح میری کار بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئی مگر اسی وجہ سے انھیں پکڑنے میں کامیاب ہوا ہوں...... ان کی کار کا زیادہ نقصان نہیں ہوا تھا اس لیے انھی کی کار استعمال کرنا پڑی۔"

"مجھے پہلے ہی یہ مسئلہ بتا دیتے ...... میں دوسری کار بھیج دیتا۔"

"اس وقت تو ٹھیک چل رہی تھی ۔پشاور عبور کرنے کے بعد گڑ بڑ کرنے لگی۔ میں نے سوچا کہ چھوٹا موٹا مسئلہ ہے پہنچ ہی جائیں گے۔اس وجہ سے آپ کو زحمت نہیں دی۔"

"اچھا اب کہاں تک پہنچ گئے ہو؟"

میں نے اسے اشارے سے بتایا کہ میرے گاؤں کا نام بتا دے۔

اس نے جلدی سے کہا۔"اس وقت ہم دلاور خان کلے پہنچنے والے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے آدھے گھنٹے تک پہنچ جاؤ گے؟"

"جی خان جی۔" یامین نے اثبات میں جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، میں انتظار کر رہا ہوں۔" صمد یار خان نے رابطہ منقطع کر دیا۔

"میں مہر دل خان کو بلا لوں ...... کھانا بشرطِ زندگی واپسی پر کھائیں گے۔" میں حجرے سے نکل کر گھر کی طرف بڑھا۔

"بس دس منٹ تک کھانا لا رہا ہوں۔" مجھے دیکھتے ہی مہر دل خان بولا۔

"کھانے کا ٹائم نہیں ہے، واپسی پر کھائیں گے۔ فی الحال تم اپنی گن اٹھاؤ کہیں جانا ہے۔" میں نے اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے جواب دیا۔

"لالہ! ...... کہاں جا رہے ہو؟" زرغونہ نے باورچی خانے سے باہر نکلتے ہوئے پوچھا۔

"کہیں نہیں تم اپنا کام کرو۔" اسے جھڑکتا ہوا میں کمرے میں گھس گیا، کلاشن کوف سنبھال کر میں باہر نکلا تو وہ منہ بنائے باورچی خانے کے دروازے پر کھڑی تھی۔

میں نے قریب جا کر اس کی ناک کی پھننگ مروڑی اور ہنستے ہوئے بولا۔"گڑیا! ہم بس تھوڑی دیر میں واپس آ جائیں گے۔تم اپنی بھابی کا خیال رکھنا۔"

"نہیں ہوں تمھاری گڑیا۔" وہ واپس باورچی خانے میں گھس گئی اور میں ہنستا ہوا امی جان کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔سائرہ اور مور جان گپ شپ میں مصروف تھیں۔

''مور جان!......ہم ذرا کام کے لیے جا رہے ہیں......کھانا واپسی پر کھائیں گے۔''

مور جان معنی خیز مسکراہٹ سے بولیں۔ ''پہلے کبھی ایسی بات بتانے کے لیے تو تم میرے کمرے میں نہیں آئے؟''

''وہ میں......بس یونہی چلا آیا۔'' سائرہ کو مسکراتا دیکھ کر میں بوکھلا گیا تھا۔

''اچھا تم فکر نہ کرو......میں بہو کا خیال رکھوں گی۔'' مور جان نے کہا اور سائرہ حیا سے لال ہو گئی، جبکہ میں جلدی سے باہر آ گیا ورنہ مور جان کے حملے جاری رہتے۔

مہر دل خان مجھ سے پہلے ہی حجرے کی طرف جا چکا تھا۔ میں حجرے میں داخل ہوا تو تمام لوگ جانے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔

''لائحہ عمل کیا ہو گا؟'' میں جیسے ہی اندر داخل ہوا لالہ داؤد مجھ سے مخاطب ہوا مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس نے لاشعوری طور پر مجھے لیڈر تسلیم کر لیا ہے۔

''اس کے پاس یہاں کتنے محافظ ہو سکتے ہیں؟'' میں نے یامین سے پوچھا۔

''کچھ کہہ نہیں سکتا......شاید پندرہ سولہ یا اس سے دو تین کم یا زیادہ۔''

''میرا خیال ہے اس کے آدمیوں کو دو حصوں میں بانٹنا پڑے گا؟'' میں خود کلامی کے انداز میں بولا۔ ''اس طرح اس کی طاقت دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گی اور ہم آسانی سے ان پر قابو پا لیں گے۔''

''وہ کیسے......؟'' لالہ داؤد اور بابا جان نے بیک زبان پوچھا۔

''یامین فون کر کے اسے بتا دے گا کہ اس کی کار خراب ہو گئی ہے، اسے لینے کے لیے گاڑی بھیجی جائے اور چونکہ اس کی کار ہمارے گاؤں کے مضافات میں خراب ہوئی ہے اس لیے احتیاطاً وہ دو گاڑیاں تو بھیجے گا، ان دو کاروں کے ساتھ سات آٹھ بندے ہوں گے۔ ہم پہلے مرحلے میں ان بندوں پر قابو پا لیں گے اور پھر انھی کی گاڑیوں میں بیٹھ کر اس کی کوٹھی پر پہنچ جائیں گے۔ اندر گھسنے میں کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔''

''واہ......شاباش شیر دل خانا!......دل خوش کر دیا......'' بابا جان خوشی سے چہکتے ہوئے مہر دل خان کی طرف مڑے۔ ''دیکھا مہر دل خان! پڑھ لکھ کر تیرا بھائی کتنا عقل مند ہو گیا ہے؟''

میرے جی میں آیا کہ خوب کھلکھلا کر قہقہہ لگاؤں ...... مجھے بے عقل اور بیوقوف سمجھنے والے بابا جان آج میری عقل مندی کا اعتراف کر رہے تھے۔لیکن پھر مجھے حیا آ گئی ...... بابا جان یقیناً مجھے اپنے رنگ میں رنگا دیکھ کر ساری ناراضیاں بھلا بیٹھے تھے۔انھیں وہ القاب یاد نہیں رہے تھے جو وہ وقتاً فوقتاً مجھے دیتے رہے تھے۔

لالہ داود بولا۔''شیر دل خان !......یقین مانو تمھارا دماغ کسی سیکرٹ ایجنٹ کی طرح کام کرتا ہے، بہت زیادہ مشکل کام کو تم یوں سلجھا دیتے ہو کہ نہ چاہنے کے باوجود تمھیں کمانڈر بنانے کو جی چاہتا ہے۔''

''تھینکس لالا جی !......میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے ؟''

''بیٹا! خیال سے جانا اور اگر یہ آدمی کم ہیں تو میں چند منٹ میں مزید آدمی تیار کر سکتا ہوں ؟''

''بابا جان! آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔آپ بس مورجان کا خیال رکھنا آج ہم انشاء اللہ اس خبیث کا ٹنٹا مکا کر آئیں گے۔''

''داود بیٹا! خیال رکھنا کہ کوئی جوان جوش میں آ کر ہوش نہ کھو بیٹھے۔''اس مرتبہ بابا جان نے لالہ داود کو نصیحت کی۔میں ان کی بات پر حیران رہ گیا تھا۔جوانوں سے ان کا اشارہ ہم دونوں بھائیوں کی طرف ہی تھا ۔ان کی پدرانہ شفقت نے میری آنکھوں میں نمی بھر دی تھی۔

داود لالہ نے کہا۔''آپ بے فکر رہیں چچا جان۔''

حجرے سے نکل کر میں نے یامین سے کہا۔''صمد یار خان کو کال کر کے بتا دو کہ تمھاری کار رولاور خان کلے سے نکلتے ہی خراب ہو گئی ہے اور وہ تجھے وہاں سے آ کر لے جائے۔''

یامین موبائل فون نکال کر صمد یار خان کو کال کرنے لگا۔

''لیس......؟''صمد یار خان کی مکروہ آواز سپیکر سے برآمد ہوئی، یامین نے میرے کہے بغیر موبائل فون کا سپیکر آن کر دیا تھا۔

''خان جی !......کار جواب دے گئی ہے......ہم آدھے گھنٹے سے اسے ٹھیک کرنے میں لگے ہوئے ہیں مگر کامیاب نہیں ہوئے۔''

اس نے پوچھا۔''کس جگہ کھڑے ہو؟''

”دلاور خان کلے سے بمشکل چند فرلانگ آگے۔“یامین نے جواب دیتے وقت میری طرف تائیدی نظروں سے دیکھا اور میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”ٹھیک ہے......میں دو جیپیں بھیج رہا ہوں.....محتاط رہنا......تمھیں لینے ظہور خان آئے گا، وہ ابھی کال کر کے تمھاری جگہ کے بارے میں تم سے پوچھے گا، اس کے ساتھ رابطے میں رہنا۔“

”ٹھیک ہے خان جی۔“یامین نے کہا اور صدیار خان نے رابطہ منقطع کر دیا۔

”ہم گاڑیوں میں بیٹھ گئے سب سے اگلی کار میں، میں مہر دل خان، لالہ داؤد، عدنان اور یامین سوار تھے۔یامین کو عقبی نشست پر عدنان حیدر اور لالہ داؤد کے درمیان بٹھا دیا گیا تھا۔جبکہ مہر دل خان میرے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا۔

ہم تھوڑا سا ہی چل پائے تھے کہ یامین کا موبائل فون بجنے لگا۔

یامین خان مجھ سے مخاطب ہوا۔”ظہور خان کی کال ہے۔“

میں نے تیزی سے ہدایت جاری کرتے ہوئے کہا۔”اٹینڈ کرو......اور اسے بتاؤ تم دلاور کلے عبور کرنے کے بعد پہلے سنگ میل پر رکے ہوئے ہو۔“

”جی ظہور خان!......؟“اس نے کال اٹینڈ کرتے ہوئے کہا۔حسب سابق موبائل کا سپیکر اس نے خود بخود آن کر دیا تھا۔

”یامین خان! میں تمھارے پاس آرہا ہوں۔تم کس جگہ پر ہو؟“

”دلاور کلے کراس کر کے جو پہلا سنگ میل آتا ہے، اسی کے قریب ہوں۔“

”مطلب ہماری طرف موجود ہو اور ہمیں دلاور کلے کراس نہیں کرنا پڑے گا ٹھیک ہے ہم دو جیپوں میں سوار ہوں گے۔اور بیس منٹ تک تمھارے پاس پہنچ جائیں گے۔“

میں نے اسے اشارے سے بتایا کہ وہ آدمیوں کی تعداد معلوم کرے۔

اس نے پوچھا۔”آپ کے ساتھ کتنے آدمی آرہے ہیں؟“

”میرے علاوہ سات ہیں......ویسے کیوں پوچھا؟“ظہور نے اپنی تعداد بتاتے ہوئے چونک کر سوال کیا۔

"آپ دو جیپیں ساتھ لا رہے ہیں تو کیا سب دو جیپوں میں آ جائیں گے؟ ہم بھی چھ بندے تو بن رہے ہیں...... تین قیدی اور تین ہم خود...... کیا دو جیپوں میں چودہ آدمی آ جائیں گے؟" یامین خان نے حاضر دماغی کا مظاہرہ کیا۔ اس کے رویے سے کہیں بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ ہمارا قیدی ہے یا وہ مجبوراً ہمارے لیے کام کر رہا ہے۔

"ٹھیک ہے میں تیسری جیپ بھی ساتھ لیتا آؤں گا۔" ظہور خان نے جواب دے کر رابطہ منقطع کر دیا۔

اپنے گاؤں سے باہر نکل کر میں نے کار پہلے سنگ میل کے ساتھ روک دی اور لالہ داؤد سے کہا۔ "آپ اپنی دو گاڑیاں سامنے بھیج دیں۔ مہر دل خان بھی انھی کے ساتھ ہو گا، انھیں بتانا کہ وہ روڈ سے ہٹ کر اپنی گاڑیاں درختوں کے جھنڈ میں چھپا کر رکھیں اور ان کا رخ عدنان والی کار کی جانب ہو، تاکہ جب میں اشارہ کروں تو وہ گاڑیاں سٹارٹ کر کے ان کی ہیڈ لائیٹ اس طرف روشن کریں۔ اس کے علاوہ ان کا کام ایک تو بروقت دشمنوں کی آمد سے مطلع کرنا ہے، دوسرا دشمن کو اس رستے سے فرار ہونے سے روکنا ہے۔ اپنی تیسری گاڑی گاؤں کی طرف بھیج دیں تاکہ دشمن کسی بھی سمت فرار نہ ہو سکے، اس کا رخ بھی اسی سمت رکھنا تاکہ اس کی ہیڈ لائیٹ کو بھی اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا جا سکے...... باقی عدنان والی کار کا بونٹ کھول کر روڈ کے کنارے چھوڑ دیتے ہیں تاکہ انھیں پتا چل سکے کہ کار واقعی خراب ہے...... ہم خود یہاں درختوں کے جھنڈ میں رہیں گے دو بندے سامنے چٹان کے پیچھے بھجوا دیں تاکہ وہ کسی بھی طرف فرار نہ ہو سکیں...... اور ہاں سب کو بتا دیں کہ ایک سنگل فائر اشارہ ہو گا اس بات کا کہ تمام گاڑیوں کی ہیڈ لائیٹ روشن کر دی جائیں۔"

لالہ داؤد اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنے آدمیوں کی طرف بڑھ گیا مہر دل خان بھی اس کے ہمراہ تھا۔ میں اور عدنان یامین کو لے کر ایک بڑی سی چٹان کے پیچھے لیٹ گئے۔ حفظ ماتقدم کے طور پر میں نے یامین کا سلامت ہاتھ اور پاؤں رسی سے باندھ دیے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد لالہ داؤد بھی وہیں پہنچ گیا ان سارے انتظامات میں دس سے پندرہ منٹ لگے تھے۔ لالہ داؤد میرے ساتھ پوزیشن لیتے ہوئے بولا۔ "شیر دل خانا!...... آٹھ بندے تو ہماری طرف آ رہے ہیں، نجانے وہاں حویلی میں ان کے کتنے بندے اور ہوں گے؟"

''لالہ! پہلے آنے والوں سے نبٹ لیں پھر ان کی تعداد بھی معلوم کر لیں گے۔''

''لیکن کیسے؟''

۔''آنے والوں میں سے ایک بندہ بھی زندہ پکڑا گیا تو حویلی والوں کی تعداد کے بارے میں معلوم کرنا مشکل نہیں ہوگا۔''

''اوہ......واقعی۔'' داؤد لالہ مسکرایا۔''سامنے کی بات ہے میرا دھیان ہی اس طرف نہیں گیا۔''

عدنان نے کہا''شیر دل خان کا دماغ اس معاملے میں بہت تیزی سے کام کرتا ہے چند سیکنڈ میں جناب نے سارا سیٹ اپ ترتیب دے دیا ہے، یقین مانو یہ سب کچھ کرنے کے لیے جانے مجھے کتنا سوچنا پڑتا اور پھر بھی اتنا جامع منصوبہ نہ سوجھتا۔''

اسی وقت میرے موبائل پر مہر دل خان کی کال آنے لگی، میں نے اٹینڈنگ بٹن پریس کیا۔

''لالہ! وہ بس ہمارے قریب آنے والے ہیں تین گاڑیوں کی ہیڈ لائیٹ نظر آ رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے محتاط رہنا۔'' میں نے رابطہ منقطع کرتے ہوئے کہا۔''وہ پہنچنے والے ہیں۔''

عدنان نے اندیشہ ظاہر کیا۔''فائرنگ کی آواز سن کر کہیں صدیار خان چوکنا نہ ہو جائے؟''

میں مسکرایا۔''بیس کلومیٹر دور تک فائرنگ کی آواز جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بالفرض اگر پہنچ بھی جائے تو یہاں فائرنگ کی آواز معمول کی بات ہے۔''

لالہ داؤد کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ ہمیں گاڑیوں کی ہیڈ لائیٹ نظر آنے لگی۔گاڑیاں اسی وقت موڑ کاٹ کر سیدھی ہوئی تھیں۔مہر دل خان پارٹی اسی موڑ کے پاس چھپی ہوئی تھی۔لالہ داؤد خاموش رہا۔اگلے چند سیکنڈ میں وہ ہماری کار کے قریب پہنچ کر رک گئے تھے۔

''یامین خان!'' پہلی جیپ میں سے کسی نے زور سے پکارا۔اور پھر جواب نہ پا کر کھڑکی کھول کر دو آدمی نیچے اترے اور دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کار کے قریب پہنچ گئے۔

''کار تو انھی کی لگتی ہے۔مگر یہاں تو کوئی بھی موجود نہیں ہے؟'' کار کے قریب آنے والوں میں سے ایک اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔

''کہاں جاسکتے ہیں؟'' دوسری جیپ سے ایک پریشان کن آواز برآمد ہوئی اور پھر ایک آدمی نیچے اترا۔اسی وقت میں نے اپنی کلاشن کوف کا رخ اوپر کی طرف کرتے ہوئے ٹریگر پریس کیا۔زور دھماکے نے فضا میں ارتعاش سا پیدا کر دیا تھا۔وہ تمام سراسیمہ ہو کر دائیں بائیں دیکھنے لگے۔اگلے چند سیکنڈ میں ہمارے ساتھیوں نے تینوں گاڑیوں کی ہیڈ لائیٹ روشن کر دی تھیں۔ان کی اپنی جیپوں کی لائیٹس بھی آن تھیں مگر ہماری گاڑیوں کی لائیٹس نے بیچ بیچ انھیں روشنی میں نہلا دیا تھا۔میں زوردار آواز میں چلایا۔

''تم چاروں طرف سے ہمارے گھیرے میں ہو اگر کسی نے بھی کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش کی تو اسے گولی ماردی جائے گی۔اپنے ہتھیار پھینک کر ہاتھ سر سے بلند کرلو۔'' میری زوردار آواز اور پھر گاڑیوں کی ہیڈ لائیٹ نے انھیں حقیقتاً ڈرا دیا تھا۔گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے افراد بھی باہر آگئے اور پھر سب نے ہتھیار پھینک کر اپنے اپنے ہاتھ سر سے بلند کرلیے۔

میں عدنان سے مخاطب ہوا۔''یامین خان کا خیال رکھنا۔ہم ذرا نئے مہمانوں کا سواگت کرلیں۔''

وہ مسکرایا۔''ٹھیک ہے باس۔''

''چلیں لالہ!'' میں نے داؤد خان سے کہا اور ہم دونوں گنیں تھامے اپنی کمین گاہ سے باہر نکل آئے، ہماری دیکھا دیکھی ہمارے آدمی بھی چاروں طرف سے سامنے آگئے۔دشمنوں کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے تھے جیسے ہی ہم روشنی میں آئے انھوں نے مجھے اور لالہ داؤد کو پہچان لیا تھا۔اور کیوں نہ پہچانتے۔وہ صمد یار خان کے خاص افراد تھے۔اُن کی شکلوں ہی سے ظاہر تھا کہ وہ خباثت کے پتلے اور مجرم ذہنیت کے لوگ ہیں۔

شیر دل خان! تم اچھا نہیں کر رہے، تمھاری دشمنی صمد یار خان سے ہے ہم........''

''چٹاخ........'' میرے زوردار تھپڑ نے صرف اس کی بولتی ہی بند نہیں کی تھی بلکہ اس کے ساتھ اس کی باچھوں سے خون بھی رسنے لگا تھا۔اس کی آواز سے میں نے پہچان لیا تھا کہ وہ ظہور خان ہے۔

''ظہور خان! اگر میری دشمنی صمد یار خان سے ہے، تو تم بھی اسی کے پالتو ہو اور اب یہاں تمھاری آمد کا مقصد یقیناً ہمیں قیدی بنا کر ساتھ لے جانا تھا۔تو پھر گلہ کیسا؟''

اس بار ظہور خان سے کوئی جواب نہیں بن پایا تھا۔میں داؤد لالہ کے آدمیوں سے بولا۔''سب کی تلاشی لے

کران کے ہاتھ باندھ دو۔"

"یقیناً یامین خان تمھارے ساتھ ملا ہوا ہے؟" ظہور خان نے ہونٹ کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"گن پوائنٹ پر اچھے اچھوں کی سٹی گم ہو جاتی ہے تو یامین خان کس باغ کی مولی ہے کہ ہمارا ساتھ نہ دیتا۔" یہ کہہ کر میں نے عدنان کو آواز دی۔" عدنان! صاحب بہادر کو لے آؤ۔"

اگلے لمحے عدنان یامین خان کو ساتھ لیے سامنے آ گیا۔اس نے یامین خان کے پاؤں کی رسی تو کھول دی تھی البتہ اکلوتا ہاتھ نہیں کھولا تھا۔

اتنی دیر میں داؤد خان کے آدمی اپنی کار سے مضبوط رسیاں لے آئے تھے۔چند لمحوں میں انھوں نے اُن کے ہاتھ پشت پیچھے باندھ دیے۔

میں مہردل سے مخاطب ہوا۔" مہردل خان! ظہور خان کو ذرا سائیڈ پر لے آؤ تاکہ گپ شپ کر لیں۔"

"جی لالہ۔" کہہ کر اس نے ظہور خان کو کلاشن کوف کے بٹ سے ٹھوکا دیا۔

"چل اوئے۔" اور ظہور خان نے خاموشی سے مطلوبہ سمت قدم بڑھا دیے۔

" لالہ داؤد! ہم ظہور سے حویلی کے متعلق معلومات حاصل کرتے ہیں آپ ان میں سے کسی دوسرے سے پوچھ گچھ کریں ...... تاکہ کوئی غلط بیانی کرے تو ہمیں معلوم ہو جائے اور ہم اس غلیظ کا بوجھ اس دھرتی سے کم کر دیں۔"

"گڈ آئیڈیا۔" لالہ داؤد تحسین آمیز لہجے میں بولا اور ان میں سے ایک آدمی کو منتخب کر کے سائیڈ پر لے گیا۔

ظہور خان کو وہاں سے تھوڑا سا دور لے جا کر ہم نے زمین پر الٹا لٹا دیا۔

"چل بھئی! صمد یار خان کی حویلی کے بارے ساری معلومات بکنا شروع کر دے۔ وہاں کتنے آدمی ہیں ،فرار کا کوئی رستا ہے کہ نہیں، ہتھیار کون کون سے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔" میں نے جوتے کی نوک اس کی گردن پر رکھتے ہوئے پوچھا۔" اور ہاں یاد رکھنا، ذرا سی غلط بیانی تمھاری گردن کو کندھوں پر سے غائب کر سکتی ہے۔"

"خان جی کے علاوہ چھ آدمی ہیں۔سب کے پاس کلاشن کوفیں ہیں۔ایک ایل ایم جی بھی ہے اور فرار کے رستے سے تمھاری مراد اگر کوئی خفیہ سرنگ وغیرہ ہے تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

''کتنے پہرہ دار ڈیوٹی پر ہوتے ہیں؟''

''دو......ایک سامنے اور دوسرا عقبی جانب۔''

''تیز وطرار ہیں یا ڈھیلے ڈھالے؟''

وہ بولا۔''آج تو مستعد ہی ہوں گے، خان جی آیا ہوا ہے۔''

''صمد یار خان کیا کر رہا تھا؟''

''کچھ پینے پلانے کا شغل شروع تھا اور کچھ..........؟''وہ خاموش ہو گیا۔

میں مستفسر ہوا۔''اور کچھ......کیا؟''

''ایک مشہور مغنیہ آئی ہوئی ہے، جب بھی خان جی خوش ہوتا ہے اُسے ضرور بلاتا ہے۔گانے بجانے کے بعد.........ویسے آپ خود سردار زادے ہیں، سرداروں کی شوقین مزاجی آپ کے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہوگی، اس لیے وضاحت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''اس کے ساتھ سازندے وغیرہ بھی تو ہوں گے؟''میں نے اس کے نادر خیالات پر کوئی ریمارکس نہ دیے

''جی ہاں پانچ بندے ہیں۔''

''ظہور خان! اگر تم نے ذراسی بھی غلط بیانی سے کام لیا ہے تو..........؟''میری دھمکی ادھوری ہونے کے باوجود مکمل تھی۔

ظہور خان ہنس دیا۔''سردار زادے!......میں ایک جرائم پیشہ شخص ہوں صمد یار خان کے لیے اس لیے کام کر رہا تھا کہ وہ میری پشت پناہی کرتا ہے، پولیس سے تحفظ فراہم کرتا ہے اب لگتا یہی ہے کہ اس کے دن گنے جا چکے ہیں تو نمک حلالی میں سراسر میرا اپنا نقصان ہے اور نقصان کا سودا میں نہیں کیا کرتا۔یوں بھی ہم جرائم پیشہ لوگ صرف غرض کے ہوتے ہیں جہاں فائدہ نظر آئے وہی اپنا قبلہ بن جاتا ہے......آپ جان بخشی کا وعدہ کریں اور مجھ پر اعتبار کریں تو یقیناً میں آپ کے لیے صمد یار خان سے لڑنے کو تیار ہوں، بس مجھے اتنا یقین دلا دیں کہ آپ پیچھے ہٹنے والے نہیں ہیں۔''

''اگر تم نے ساری معلومات درست بتائی ہیں تو بے فکر رہو میں تجھے کچھ بھی نہیں کہوں گا، صمد یار خان کا ٹنٹنا

مکاتے ہی تجھے رہا کر دیا جائے گا۔ باقی تمہاری آفر کا شکریہ، تمہاری یہ آفر ادھار رہی کبھی ضرورت پڑی تو ضرور تجھے کام دوں گا مگر صمد یار خان کے خلاف تم جتنی بھی نیک نیتی سے میرا ساتھ دینے کا وعدہ کرلو مجھے اعتبار نہیں آئے گا۔"

"اچھا ایک بات یاد رکھنا حویلی کے اندر جانے کے لیے پختہ ٹریک بنا ہوا ہے جو مین گیٹ سے بھی بیس گز پہلے شروع ہوتا ہے۔ یہاں سے جاتے وقت اس ٹریک پر چڑھنے سے پہلے رک کر ایک دفعہ ہارن دینا اور پھر تین دفعہ ہیڈ لائیٹ جلانا بجھانا...... یہ اندر داخل ہونے کا اشارہ ہے۔ اگر آپ سیدھے گیٹ پر چلے گئے تو شاید پہرہ دار چوکنا ہو جائے کہ ہم طے شدہ طریقے کے مطابق اندر داخل نہیں ہو رہے۔ اور خیال رہے اس بات کا صرف مجھے ہی پتا ہے۔"

میں نے پوچھا۔" ویسے عام طور پر بھی اندر داخل ہونے کے لیے یہی طریقہ کار استعمال ہوتا ہے؟"

"بالکل !...... نہیں ...... نہیں بلکہ عام طور پر یہ طریقہ کار استعمال نہیں ہوتا۔" وہ تھوڑا سا گڑبڑایا اور میں چونک گیا۔

"مہر دل !...... جاؤ وہاں سے ایک اور آدمی پکڑ لاؤ۔"

"جی لالہ !......" کہہ کر وہ قیدیوں کی طرف بڑھ گیا۔ اس کی واپسی تک میں گہری سوچ میں کھویا رہا ...... ظہور نے بھی مجھے ڈسٹرب کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جیسے ہی مہر دل خان دوسرے آدمی کو لے کر لوٹا اس نے اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"سردار زادے !...... یقین مانو ......"

مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنا فقرہ مکمل کرتا میرے پاؤں کی بھرپور ٹھوکر اس کے کندھوں کے بیچ لگی اور وہ اوندھے منہ گر گیا۔ میں دھاڑا۔

"اگر اس کے بعد ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو یقیناً وہ تمہاری زندگی کا آخری لفظ ہوگا۔"

ظہور خان کے ساتھ میرا برتاؤ دیکھ کر آنے والا بھی خوفزدہ ہو گیا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر ایک زور دار تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھ بے! تمھارے لیے بہتر یہی ہوگا کہ کسی قسم کی غلط بیانی نہ کرنا......اب شروع ہو جاؤ؟''

وہ ہکلایا۔''کک......کیا بتاؤں؟''

''جب یامین خان نے صمد یار خان کو فون کیا تھا تو اس وقت تم سب کہاں تھے؟''

وہ جلدی سے بولا۔''خان جی کے پاس ہی تھے......ایک گلوکارہ آئی ہوئی تھی اس کے گانے سن رہے تھے ......اور ڈانس دیکھ رہے تھے۔''

''تفصیل سے بتاؤ؟''

وہ بولا۔''ہم سارے خان کے پاس ہی بیٹھے تھے۔یامین کی کال آئی تو خان جی کے حکم پر گلوکارہ نے ڈانس کرنا بند کر دیا۔اس کے بعد خان جی نے ظہور خان سے کہا کہ جاؤ یامین کی گاڑی دلاور خان کلے کے قریب خراب ہوگئی ہے اسے فوری طور پر وہاں سے لے آؤ اپنے ساتھ آٹھ دس افراد اور دو گاڑیاں لے جانا۔بس جی ظہور خان نے ہمیں ساتھ لیا اور ہم چل پڑے۔

میں نے اچانک پوچھا۔''لیکن صمد یار خان نے ظہور خان کو اکیلے میں بلا کر کیا کہا تھا؟''

''اک......اکیلے......نہیں تو......؟......اکیلے تو نہیں بلایا تھا؟''

میں نے سخت لہجے میں کہا۔''جھوٹ نہ بولو......مجھے پتا چل گیا ہے؟''

وہ سراسیمہ ہو کر بولا۔''خدا کی قسم نہیں بلایا تھا۔''

''اچھا......اب واپسی کے طریقہ کار کی وضاحت کرو؟''

''واپسی کا طریقہ کار......؟ایسا تو کوئی طریقہ کار نہیں ہے؟......غالباً آپ گھما پھرا کر میرے منہ سے کوئی ایسی بات اگلوانا چاہتے ہیں جسے بنیاد بنا کر میری ساری باتوں کو غلط قرار دے سکیں؟''

''مجھے بالکل تمھاری باتوں پر یقین ہے بس کسی اور کی غلط فہمی دور کرنی تھی۔''یہ کہتے ہی میں نے ظہور خان کے پہلو میں ٹھوکر رسید کی۔''پتر!......تم سے واپسی پر ملاقات ہوگی۔''

اسی وقت لالہ داؤد بھی وہاں پہنچ گیا......''ہوگئی پوچھ گچھ......؟''

''ہاں لالہ! صمد یار کے علاوہ چھ محافظ ہیں۔کوئی ڈانسر وغیرہ بھی آئی ہوئی ہے اس کے ساتھ تین چار

سازندے ہیں۔ سب اس وقت گانے بجانے کے شغل میں لگے ہوئے ہیں بس سامنے اور عقبی جانب ایک ایک محافظ ہے۔ تمام کے پاس کلاشن کوفیں موجود ہیں اور وہاں پر ایک ایل ایم جی بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ کسی نے کچھ اگلا ہو تو بتائیں؟''

''نہیں بس مجھے بھی اتنا کچھ ہی بتایا گیا ہے۔''

''تو چلیں پھر۔ لیٹ ہی نہ ہو جائیں۔'' سب کو ایک بار پھر اکٹھا کر کے ہم نے گاڑیوں میں بٹھایا اور پھر میں نے مہر دل خان سے کہا۔

''مہر دل خان! تم، عدنان اور لالہ داؤد کے تین آدمی ان قیدیوں کو حجرے میں لے جاؤ ان کے ساتھ واپسی پر نمٹ لیں گے۔''

''مگر لالہ! میں آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں؟''

''نہیں اب صرف حکم میرا چلے گا۔ میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا۔ اب جاؤ ہمارے پاس وقت بالکل کم ہے۔''

''نہیں لالہ!...... میں تو ضرور چلوں گا۔'' اس نے اصرار کیا۔

اگلے ہی لمحے میرا ہاتھ گھوما اور اس کے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ پڑا۔ ''تمھیں شاید قبائلی روایات بھول گئی ہیں...... بڑا بھائی کہہ رہا ہے قیدیوں کو واپس لے جاؤ اور تم حجت بازی میں لگے ہو...... جو کہا ہے وہ کرو۔''

وہ اپنا گال سہلاتا ہوا عدنان کی طرف مڑ گیا۔ میرے غصے میں چھپی محبت سے وہ واقف تھا۔ میں تو پہلے بھی اسے ساتھ لانے کے حق میں نہیں تھا۔ دو بھائیوں میں سے کم از کم ایک بھائی کو تو پیچھے ہونا چاہیے تھا۔ اسی طرح عدنان کو بھی میں نے اس لیے واپس کر دیا تھا کہ وہ سائرہ کا بھائی تھا۔ خدانخواستہ اسے کچھ بھی ہو جاتا تو سائرہ دکھی ہو جاتی اور اس کا دکھ میں کہاں دیکھ سکتا تھا۔ اور یوں بھی عدنان ہتھیار سے صرف اتنی واقفیت رکھتا تھا جتنی کوئی بھی عام آدمی رکھتا ہے کہ ٹریگر دبانے سے فائر ہوتا ہے اور بیرل کا رخ دشمن کی طرف کیا جاتا ہے اور بس۔ اس کے برعکس لالہ داؤد کے آدمی اچھے خاصے تربیت یافتہ تھے۔

لالہ داؤد کے تین آدمی مہر دل خان کے ساتھ بھیج کر ہم دشمن کی جیپوں میں بیٹھے اور جیپیں واپس موڑ کر صمد

یارخان کی حویلی کی طرف چل پڑے۔ میرا دل عجیب انداز میں دھڑکنے لگا۔ مگر میں خائف نہیں تھا۔ صمد یار خان کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ اُس سے ٹکرانے کے لیے پہلو میں شیر کا دل چاہیے تھا۔ جو آج حقیقتاً میرے پہلو میں دھڑک رہا تھا۔

یامین خان کو ہم نے اپنے ساتھ رکھا تھا۔ وہ میرے اور لالہ داؤد کے ہمراہ اگلی جیپ میں موجود تھا، رستے میں ہم نے ساری ضروری تفصیلات طے کر لی تھیں۔

صمد یار خان کی حویلی جنگل کے اندر واقع تھی۔ پختہ روڈ سے وہاں تک جانے کے لیے ایک کچا رستا بنا ہوا تھا، رستے کے دونوں جانب پتھر رکھ کر رستے کی نشاندہی کی گئی تھی، گو کثرت استعمال سے رستا ویسے ہی خوب واضح تھا شاید پتھروں کی لائن رستا واضح ہونے سے پہلے بنائی گئی تھی۔ طے شدہ منصوبے کے مطابق ہم حویلی کی طرف بڑھتے گئے۔ مین گیٹ پر بلب روشن تھا۔ یقیناً یہ روشنی جنریٹر کی مرہونِ منت تھی۔ گیٹ کے قریب پہنچنے پر جنریٹر چلنے کی ہلکی ہلکی آواز آنے لگی۔ ہمارے گیٹ تک پہنچنے سے پہلے ہی گیٹ کھل گیا تھا۔ یقیناً اگر ہم رک کر اشارہ وغیرہ دیتے تو پہرہ دار چوکنا ہو جاتا۔

یامین کی رہنمائی میں ہم نے جیپ پارکنگ کی مخصوص جگہ پر روکی اور نیچے اتر کر میں اور لالہ داؤد کا ایک آدمی عقبی گارڈ کے مورچے کی طرف بڑھ گئے۔ جبکہ آخری جیپ والوں نے اندر داخل ہو کر سامنے والے پہرہ دار کو قابو کرنا تھا۔

میں یامین سے عقبی مورچے کے پہرہ دار کی جگہ کے متعلق تفصیل سے معلوم کر چکا تھا۔ مورچہ زمین سے چھ فٹ بلندی پر بنا ہوا تھا اور اس کا طول و عرض اس قدر تھا کہ اس میں بمشکل ایک چارپائی آ سکتی تھی۔ حویلی کی دیواریں نو فٹ سے بھی بلند تھیں۔ لالہ داؤد کے آدمی کا نام صفدر تھا۔ میں اور صفدر دبے قدموں عقبی مورچے کے نیچے پہنچے مگر چوکیدار جیپوں کی آواز سن کر ادھر ہی متوجہ تھا۔ مجھے پہلے سے اس صورت حال کا اندازہ تھا اس لیے میں اپنے پسٹل کی نال پر سائیلنسر چڑھا چکا تھا۔ حویلی کی عقبی جانب روشنی کا خاطر خواہ انتظام موجود نہیں تھا اس لیے وہ ہمیں پہچان نہیں سکا تھا۔

''چرتہ ہلکا!......'' (کدھر لڑکے) اس نے مزاحیہ انداز میں پوچھا۔

میں اطمینان سے بولا......"ستہ ملاو دو تہ راغلے اوو؟" (آپ سے ملنے کے لیے آئے تھے)

"آپ کون؟" اس کے لہجے میں حیرانی تھی۔

میں نے پسٹل سیدھا کیا اور دوبار ٹریگر پریس کرتے ہوئے اس کی حیرانی کو گہری خاموشی میں بدل دیا ۔دونوں گولیاں اس کے سر میں لگی تھیں اس لیے اسے زیادہ دیر تک تڑپنے کی مہلت نہیں مل سکی تھی۔

"چلو!......" میں نے صفدر سے کہا اور واپس مڑ گیا۔

آخری جیپ والوں نے سامنے والے گارڈ کو پکڑ کر باندھ دیا تھا۔اندرونی عمارت سے گانے بجانے کی ہلکی ہلکی آواز آرہی تھی۔

لالہ داؤد نے کہا۔"میرا خیال ہے تمام مستی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔سیدھے اندر چلے چلتے ہیں؟"

میں نے مسکراتے ہوئے لالہ داؤد کی تائید کی۔"میں بالکل متفق ہوں۔"

"صفدر، اسلم، سلمان اور باقر! تم چاروں عقبی اور سامنے والے مورچے میں دو دو ہو کر چلے جاؤ گو کہ خطرہ نہیں ہے لیکن پھر بھی خیال کرنا، کیونکہ کسی بھی قسم کی ناگہانی صورت حال درپیش آسکتی ہے۔یہ نہ ہو کوئی ہماری بھی تاک میں ہو اور ہم بے خبری میں مارے جائیں۔باقی سب ہمارے ساتھ اندر جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے جناب۔" صفدر نے کہا اور باقیوں نے تائید میں سر ہلا دیا۔

پسٹل جیب میں ڈال کر میں نے کندھے سے لٹکی کلاشن کوف اُتار کر ہاتھ میں تھامی اور آگے بڑھ گیا۔سب نے میری تقلید کی تھی۔

میں نے اندرونی عمارت کا دروازہ جیسے ہی کھولا گانے بجانے کا تیز شور میری سماعتوں میں گونجنے لگا۔پشتو کی ایک مشہور گلوکارہ لہک لہک کر گا رہی تھی۔

"قرار اراشہ......قرار اراشہ" (اے میرے دل کے قرار آجاؤ)

"وڑالو......جانانہ......وڑالو......" (آ گئے ہیں محبوب......آ گئے ہیں) میں بلند آواز میں بولا۔اور گاتی بجاتی محفل میں ایک دم سناٹا چھا گیا، نہ صرف گلوکارہ کی آواز اس کے گلے میں گھٹ گئی تھی بلکہ سازندوں کے ہاتھ بھی ایک دم بے جان ہو گئے تھے۔

''واہ!......بھلا یہ کیا بات ہوئی......خود بلا رہے تھے کہ آ جاؤ......اور اب یہ حیرانی کیسی؟''میں نے مزاحیہ انداز میں کہا۔مگر وہ تمام ہونقوں کی طرح ہمیں گھورتے رہے۔

داؤد لالہ کے تمام آدمی گنیں تھامے خاموشی سے ہال کے چاروں کونوں میں پھیل گئے تھے۔

''قرار اراشہ!......ذرا قریب آؤ؟''میں نے اس مشہور گلوکارہ کو بلایا۔

وہ جھجکتے ہوئے میرے قریب آ گئی۔

''میری نگاہ میں تو تیری اچھی خاصی عزت تھی۔شکل سے بھی شریف لگتی ہو،مگر ایسی محفل میں......قرار اراشہ!......بہت غلط جگہ دیکھی گئی ہو......اس جیسے خبیث کے پاس۔''میں نے صمد یار خان کی طرف اشارہ کیا۔''یہ اور اس کے ساتھی اس قابل ہیں کہ......؟''

میری بات ابھی ادھوری ہی تھی کہ صوفے پر بیٹھے ایک آدمی نے ساتھ کھڑی گن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔میں کنکھیوں سے صمد یار خان کے آدمیوں پر نظر رکھے ہوئے تھا کیونکہ خود اس کے پاس کوئی ہتھیار موجود نہیں تھا۔میں نے بظاہر اس گلوکارہ کی طرف متوجہ رہتے ہوئے اپنی گن کا رخ ہتھیار کی طرف ہاتھ بڑھاتے آدمی کی طرف کیا اور پھر ہال فائر کی زوردار آواز سے گونج اٹھا۔اس کے ساتھ ہی میں نے اپنا فقرہ مکمل کیا۔

''انھیں گولی ماردی جائے۔''گولی اس کی چھاتی میں لگی تھی۔

''اس سے پہلے کہ باقی بھی میرے ہاتھ سے ضائع ہو جائیں......ان سے ہتھیار لے لو۔''میں نے صوفوں کے عقب میں کھڑے داؤد لالہ کے آدمی روشن خان سے کہا جو فائر کی آواز سے ایک دم چوکنا ہو گیا تھا ورنہ اس سے پہلے تو وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گلوکارہ کو گھور رہا تھا۔

روشن خان نے آگے بڑھ کر ان کی گنیں اٹھا لیں۔

''صغیر خان!......''میں داؤد لالہ کے دوسرے آدمی سے مخاطب ہوا۔''ان کی تلاشی بھی لے لو ویسے یہ کام تمھیں آتے ہی کرنا چاہیے تھا۔خواہ مخواہ میری ایک گولی ضائع کرا دی،پتا بھی ہے کلاشن کوف کی گولی کتنی قیمتی ہوتی ہے؟''

صغیر خان کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے آگے بڑھا اور ان کی تلاشی لینے لگا۔باقی تینوں بھی اس کی مدد کے لیے

قریب آگئے تھے۔

"لالہ! تم نے شادی بھی تو نہیں کی تو پھر کیا خیال ہے؟" میں نے لالہ داؤد کو چھیڑا۔

وہ مسکرایا۔ "شادی تو تمھاری بھی نہیں ہوئی شیر دل خانا۔"

"اوہ!...... میں تو بھول ہی گیا تھا۔ خیر چھوڑیں۔" میں دوبارہ اس گلوکارہ کی طرف متوجہ ہوا اور اطمینان سے بولا۔ "قرار اراشہ! ایسا ہے کہ اپنے کپڑے اتار دو۔"

"کک...... کپڑے؟" وہ گھبرا گئی تھی...... لالہ داؤد بھی حیرانی سے میری جانب دیکھنے لگا۔

"جی محترمہ!...... اگر شرم آ رہی ہے تو باتھ روم میں جا کر اتار دو...... اصل میں مجھے تمھارے کپڑے چاہئیں۔ وہ کیا ہے کہ بہت اچھے سلائی کیے ہوئے ہیں...... تم بے شک کوئی اور لباس پہن لو۔"

"مم...... میرے پاس اور لباس بھی موجود ہیں...... آپ ان میں سے کوئی پسند کرلیں وہ بھی بہت اچھے ہیں۔" اس نے شاید سچ مچ یہی سمجھ لیا تھا کہ مجھے اس کا لباس چاہیے۔

"اچھا...... مطلب تم پوری تیاری کر کے آئی تھیں۔ یقیناً چند دن رہنے کا پروگرام ہوگا...... خیر مجھے کیا۔" میں نے شانے اچکائے۔ "تم بس جلدی سے ایک اچھا سا سوٹ نکال لاؤ۔"

"مم میرا سامان...... گیسٹ روم میں پڑا ہے۔"

"تو پھر کیا...... جاؤ وہاں سے لے آؤ......" میں نے اشارہ کیا اور پھر روشن خان اور صغیر خان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "تم دونوں بھی اس کے ساتھ چلے جاؤ یہ نہ ہو اکیلے میں اسے ڈر لگے۔" وہ دونوں سر ہلاتے ہوئے اس کے ہمراہ ہو لیے۔

"تو...... ایم این اے صمد یار خان صاحب! آخر دوبارہ ملاقات ہو ہی گئی ناں! تھوڑے سے فرق کے ساتھ ...... وہ کیا کہتے ہیں۔"

بلندی کا بھروسا کیا
کبھی ہم تھے جہاں تم ہو

وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ "شیر دل خان!...... میں اپنی ہار تسلیم کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ دلاور خان

کا جانشین اپنے رتبے کے مطابق مجھ سے سلوک کرے گا۔"

"بالکل......خان جی!...... مجھے آپ کا سلوک بھولا تو نہیں ہے...... گو کہ میرے دوست راشد کے جسم پر اب وہ زخم تو نہیں رہے جو تمھارے پالتو کتوں کی مہربانی سے لگے تھے مگر میرے دل پر لگے گھاؤ ابھی تک نہیں بھر سکے ، میں نے کبھی مکھی بھی نہیں ماری تھی۔ پر اب انسان کو قتل کرتے ہوئے بھی میرے ہاتھ نہیں کانپتے۔ یہ ساری آپ کی عنایات ہی تو ہیں۔"

ایسے ہی وقت روشن خان اور صغیر گلوکارہ کے ساتھ ہال میں داخل ہوئے گلوکارہ نے ہاتھ میں سرخ رنگ کا ایک لباس اٹھایا ہوا تھا۔ ایک نظر ہال میں داخل ہونے والوں پر ڈال کر میں دوبارہ صمد یار خان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"خیر تو میں کہہ رہا تھا کہ میرے مسلک میں آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک اور عزت کے بدلے عزت ہے۔ ارشد یہاں موجود نہیں کہ تمھیں پھینٹی لگا سکے۔ چلو وہ کام لالہ داؤد کے آدمی کر دیں گے ...... بلکہ وہ میں معاف کر دیتا ہوں......تم بس یہ قرار اراشہ کا لباس پہن کر دکھاؤ......ذرا دیکھیں تو سہی کہ وہ لباس جو تم نے قرار اراشہ کے جسم پر سے اتارنا تھا وہ تیرے اپنے جسم پر کیسا لگتا ہے؟" میں نے اپنی کلاشن کوف لالہ داؤد کے حوالے کر دی اور گلوکارہ کے ہاتھ سے سرخ لباس لے کر صمد یار خان کو تھما دیا۔

"شیر دل خان!......میں معذرت کرتا ہوں......دیکھو......؟" مگر اس کی بات پوری ہونے سے پہلے میں نے ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔

"صمد یار خان!......تمھاری بہتری اسی میں ہے کہ یہ لباس پہن لو......اگر یہ قبول نہیں تو میں تمھاری دونوں آنکھیں نکال دیتا ہوں، اور یہ بدلہ ہوگا اس فعل کا، جو تم نے مجھے چوڑیاں پہننے پر مجبور کر کے انجام دیا تھا......کیا کہتے ہو؟"

"اس کی کیا گارنٹی ہے کہ تم اس کے بعد مجھے چھوڑ دو گے؟"

"میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس کے بعد تجھے معاف کر دوں گا اور ہاتھ تک نہیں لگاؤں گا۔"

"دیکھ لو شیر دل خان!......تم قبائلی سردار کے بیٹے ہو......تمھارا باپ آج تک اپنی زبان سے نہیں پھرا، یہ نہ ہو کہ تم بعد میں اپنی قسم سے مکر جاؤ؟"

"میں دلاور خان کا جانشین ہی ہوں...... زبان دی ہے تمھیں۔"

"ٹھیک ہے۔" صمدیار خان نے جلدی سے کہا اور پھر اپنا کوٹ اتارنے لگا۔

چند لمحوں کے بعد وہ گلوکارہ کا لباس پہنے کھڑا تھا۔ گو وہ لباس اس کے بدن پر کافی تنگ تھا۔ مگر کھینچ تان کر آ ہی گیا تھا۔

"بس یہی تمھاری بہادری تھی صمدیار خان! یاد ہے اس دن تم نے کس قدر قہقہے لگائے تھے؟"

میرے لہجے میں بیتے دنوں کا دکھ در آیا۔ "تم نے جان کے خوف سے یہ بے عزتی قبول کی ہے۔ جبکہ میں نے اپنے دوست کی جان بچانے کے لیے اپنی ہتک قبول کی تھی۔ اپنی فیملی کو جھگڑے سے بچانے کے لیے اپنی مردانگی کو داؤ پر لگایا تھا...... بخدا اگر صرف جان کا خوف ہوتا تو میں کبھی بھی چوڑیاں نہ پہنتا...... بہر حال میں نے زبان دی ہے...... اور سردار اپنی زبان سے پھرا نہیں کرتے...... جاؤ میں نے تجھے معاف کیا بس میرا بدلہ پورا ہو گیا۔"

"سچ مچ...... میں چلا جاؤں؟" صمدیار خان نے خوشی سے لرزتے ہوئے پوچھا۔

"جی بالکل...... میری طرف سے تم آزاد ہو۔"

"چچا جان!...... مجھ سے بھی تو پوچھیں ناں؟" میرے ساتھ خاموش کھڑا لالہ داؤد پہلی بار اس سے مخاطب ہوا۔

صمدیار خان کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا...... وہ ہکلایا...... "یہ...... یہ دھوکا ہے سراسر زیادتی ہے میرے ساتھ، شیر دل خان!...... تم ایسا نہیں کر سکتے میرے ساتھ؟" زنانہ کپڑوں میں وہ بہت عجیب دکھائی دے رہا تھا۔

"میں تو کچھ بھی نہیں کر رہا خان جی! میں نے تو تمھیں دل سے معاف کر دیا ہے۔ اب تم جانو اور تمھارا بھتیجا...... میں اگر تمھیں چھو بھی لوں تو جو چور کی سزا...... وہ تو خیر چور کو ہی ملتی ہے بہر حال میں نے معاف کر دیا ہے اور میں نے تم سے یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ تمھیں داؤد خان بھی معاف کر دے گا۔"

اتنا کہہ کر میں گلوکارہ کی طرف متوجہ ہوا۔ "قرار اراشہ! ذرا ادھر آؤ ناں؟"

وہ تیزی سے میرے قریب آ گئی۔

"بیٹھو ذرا گپ شپ کرتے ہیں۔" میں نے کہا اور وہ اطمینان سے بیٹھ گئی اسے پتا تھا کہ ایک سردار زادے کی اہمیت کتنی ہوتی ہے...... ایسے شکار کی تلاش میں تو وہ ہمیشہ سرگرم رہتی ہیں۔

"آپ کا نام شیر دل خان ہے ناں؟" اس نے لگاوٹ سے پوچھا۔

میں نے کہا۔"بابا جان نے تو یہی رکھا تھا......ویسے آپ کسی بھی نام سے پکار سکتی ہیں۔" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اسی وقت صمد یار خان، داؤد خان سے مخاطب ہوا۔

"بھتیجے! میرا یقین کرو...... بھیا کی موت قدرتی تھی...... یہ سراسر الزام ہے مجھ پر۔"

"تمھارا بھتیجا کہلانے سے بہتر ہے کہ میں موت کو گلے لگا لوں......لیکن میرا ابھی مرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے اس لیے تم چھٹی کرو۔" داؤد لالہ نے کلاشن کوف سیدھی کی تو صمد یار خان کا رنگ پیلا پڑ گیا اور جسم خوف سے لرزنے لگا تھا۔ موت کو سامنے دیکھ کر بزدل آدمی کی یہی حالت ہوتی ہے۔

"ایک منٹ لالہ!" اس کی انگلی ٹریگر کی طرف سرکتی دیکھ کر میں نے آواز دی اور وہ سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھنے لگا۔

"لالہ! یہ فقط تمھارا دشمن نہیں ہے۔ ایک اور شخص بھی ہے جسے اس نے تم سے بھی کئی گنا زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ کیا ہی خوب ہو کہ اس کا انجام اس شخص کی نظروں کے سامنے ہو؟"

"کون ہے وہ؟" لالہ داؤد نے کلاشن کوف کی نال جھکاتے ہوئے پوچھا۔

"گل رخ، یہ اس کے والدین کا بھی قاتل ہے، اس کے منگیتر یعنی تمھارے والد محترم کا بھی قاتل ہے۔ اس کی بیٹی کو اغوا کرا کے اسے ذہنی طور پر ٹارچر کرنے والا بھی یہی ہے اور اسی کی وجہ سے وہ برسوں سے جلاوطنی کی سزا بھی کاٹ رہی ہے۔"

"صحیح کہا شیر دل!...... یہ اصل مجرم تو اسی کا ہے۔"

"بس ٹھیک ہے......اسے یہیں قید کر دیتے ہیں...... یہاں ہمیں کسی طرف سے مداخلت کا اندیشہ نہیں ......مہر دل خان اور عدنان کو بھیج دیتے ہیں۔ وہ گل رخ کو یہاں لے آئیں گے۔"

"وہ یقیناً گاؤں پہنچ گئے ہوں گے......"

میں مسکرایا۔"نہیں......میں مہر دل خان کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ وہ سب ابھی حویلی کے مضافات

میں موجود ہوں گے۔

"وہ کیسے؟" لالہ داؤد حیران رہ گیا تھا۔

"ابھی خود سن لینا۔" میں مہر دل خان کو کال کرنے لگا۔

"جی لالہ!......؟" اس نے کال اٹینڈ کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

"مہر دل خان!......تم کہاں ہو؟"

"لالہ! میں وہ......دراصل..........عدنان بھائی کہہ رہے تھے کہ ہوسکتا ہے آپ لوگوں کو ہماری ضرورت پڑ جائے تو اس لیے ہم بھی آپ لوگوں کے پیچھے پیچھے چلے آئے اور اس وقت حویلی کے باہر موجود ہیں، اگر حالات آپ کے قابو میں ہیں تو ہم واپس چلے جاتے ہیں۔"

میں نے مسکراتے ہوئے لالہ داؤد کی طرف دیکھا۔ "نہیں ......اگر آ ہی گئے ہو تو حویلی کے اندر آ جاؤ۔ قیدیوں کو بھی لے آؤ۔"

رابطہ منقطع کر کے میں نے لالہ داؤد سے کہا۔

"پہرے داروں کو بتا دو کہ اپنے آدمی آ رہے ہیں ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔"

لالہ داؤد نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے روشن خان کو پہرے داروں کے پاس بھیج دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد مہر دل خان اور اُس کے ساتھی پہنچ چکے تھے۔

ایک نئی کار ان کے حوالے کر کے میں نے انھیں بغیر کسی تاخیر کے گل رخ کو لانے کے لیے بھیج دیا۔ جب کہ باقی آدمی آرام کرنے لگے۔ صمد یار خان اور اُس کے ساتھیوں کو ہم نے ایک کمرے میں بند کر کے اُن پر پہرے دار مقرر کر دیے تھے۔ گلوکارہ کی نیت میرے ساتھ آرام فرمانے کی تھی لیکن میں نے اسے نرمی سے منع کر دیا، اسے حیرانی تو بہت زیادہ ہوئی تھی کہ میں اتنی شاندار آفر کو ٹھکرا رہا ہوں۔ مگر بچاری میری طبیعت سے ناواقف تھی۔ ورنہ اس قدر حیران نہ ہوتی۔

☆......☆......☆

دوسرے دن رات گئے وہ لوگ واپس پہنچ گئے۔ گل رخ کے ساتھ عدنان حیدر کا والد فرمان حیدر بھی آیا تھا

۔دونوں میاں بیوی نے مجھے اپنے ساتھ لپٹا کر پیار کیا داؤد لالہ کو دیکھ کر گل رخ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے
۔جذباتی ملاپ کے ڈراپ سین کے بعد میں نے صمد یار خان کو وہیں بلا لیا تھا وہ اب تک اسی لباس میں تھا۔اسے
دیکھ کر گل رخ کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے تھے۔

"دیکھ لو بد کردار انسان!......آخر تیری رسی کھینچ لی گئی ناں؟"

جواباً وہ خاموش رہا تھا اس سے کوئی بات ہی نہیں بن پا رہی تھی۔

"اب بتا......کہاں گئی تیری وہ اکڑ......وہ غرور......ظالم تو نے اپنے خون کے رشتوں کو بھی معاف نہیں کیا
......کاش میں تمھیں موت سے بدتر سزا دے سکتی۔"

صمد یار خان کا سر جھکا ہوا تھا۔اس کے پاس اپنے مظالم کی کوئی توجیہ نہیں تھی۔

"داؤد بیٹا! مجھے گن دو؟" گل رخ، داؤد خان سے مخاطب ہوئی۔اور داؤد خان نے جلدی سے اپنی کلاشن
کوف اس کی جانب بڑھا دی۔

"صمد یار خان! کوئی آخری خواہش ہو تو بتا سکتے ہو؟" اس مرتبہ گل رخ کے غضب ناک لہجے میں ٹھہراؤ آ گیا تھا۔

"مجھے معاف کر دو گل رخ۔" صمد یار خان کے لہجے میں دنیا جہان کی بے بسی سمٹی ہوئی تھی۔"میرا ایک ہی بیٹا
ہے اور اسے میری ضرورت ہے۔"

"بھول گئے خان جی!...... برسوں پہلے ایک بیٹی کو اپنے والدین کی ضرورت تھی جب تم اس کی ضرورت کو
پورا نہ کر سکے تو آج کس طرح یہ مطالبہ کر رہے ہو کہ کوئی تمھارے بیٹے کی ضرورت کو سمجھے گا؟"

وہ گڑگڑایا۔"مم......میں رحم کی بھیک مانگتا ہوں۔"

"یہ میرے بس سے باہر ہے۔" گل رخ نے ٹریگر دبا دیا۔کلاشن کوف کا سیفٹی لیور برسٹ پر سیٹ تھا
۔گولیوں کی بوچھاڑ نے صمد یار خان کا سینہ چھلنی کر دیا تھا......وہ نیچے گر کر تڑپنے لگا۔گل رخ نے کلاشن کوف نیچے
پھینکی اور داؤد خان سے لپٹ کر رونے لگی۔

"ماں جی!......وہ اسی قابل تھا......اگر آپ اسے معاف کر دیتیں تب بھی اس نے اپنی روش ترک نہیں کرنی
تھی۔اچھا ہوا زمین ایک بدکردار کے بوجھ سے آزاد ہو گئی۔"

گل رخ چپ چاپ آنسو بہاتی رہی۔

انھیں وہیں چھوڑ کر میں قیدیوں کے پاس چلا گیا...... فائرنگ کی آواز سن کر سب کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔

''تو کیا خیال ہے بھئی تم سب کا؟...... تمھارا خان جی تو اپنے انجام کو پہنچ گیا اب تمھاری باری ہے۔''

ظہور خان جلدی سے بولا۔''شیر دل خان!......ہم حکم کے بندے ہیں، ہماری صمد یار خان سے کوئی رشتا داری نہیں تھی۔ اگر ہوسکے تو ہمیں معاف کردو ہم تمھارے خلاف یوں بھی کوئی ایکشن نہیں لے سکتے کہ ہم بہت دیر سے پولیس کو مطلوب ہیں۔''

''ظہور خان!......تم نے تو مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی تھی اور...... دھوکا دینے والوں کو معاف کرنا اپنے ساتھ زیادتی کرنا ہے۔''

''سردار زادے!......میری پوری کوشش تھی کہ جس کا نمک کھا رہا ہوں اسے بچا سکوں...... اب اس میں مجھے کامیابی نہیں ہوئی تو اس کی قسمت۔''

''روشن خان!......ان تمام کو کھول دو......اور جانے دو...... اگر آدھے گھنٹے بعد اس عمارت کے مضافات میں کوئی نظر آیا تو خود جواب دہ ہوگا۔''

میری بات سن کر تمام کے چہرے خوشی سے دمکنے لگے تھے۔ روشن خان نے تمام کی بندشیں کھولیں اور انھیں حویلی سے نکال دیا...... میں مہر دل خان کو ساتھ لے کر حویلی کی تلاشی لینے لگا۔ حویلی میں ایک بڑا سا تہہ خانہ بنا ہوا تھا...... وہاں بارود کا ڈھیر دیکھ کر ہم حیران رہ گئے تھے۔ مہر دل خان بارود کے استعمال سے اچھی طرح واقف تھا۔

''مہر دل!...... میرا خیال ہے اس حویلی کو دھماکے سے اڑا دیتے ہیں، تاکہ یہی سمجھا جائے کہ صمد یار خان دہشت گردی کا شکار ہوا ہے۔''

''بہت اچھا خیال ہے......'' مجھے عقب سے لالہ داؤد کی آواز سنائی دی۔ جانے وہ کس وقت وہاں پہنچا تھا۔

''ٹھیک ہے لالہ!...... سب کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔ ہم بارود لگا کر کے آتے ہیں۔

''او کے ہم حویلی کے لان میں منتظر ہوں گے۔'' لالہ داؤد باہر نکل گیا۔

مہردل خان نے بارود فٹ کیا اور فیوز کی تار بچھاتے ہوئے ہم باہر آ گئے۔ تمام لوگ حویلی کے صحن میں تیار کھڑے تھے۔

''اپنی گاڑیوں میں بیٹھ جاؤ۔'' میں نے چیخ کر کہا۔ جیسے ہی وہ بیٹھے میں نے انھیں چلنے کا اشارہ کر دیا۔ گاڑیاں ایک ایک کر کے حویلی سے نکلتی گئیں...... آخری گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر لالہ داؤد خود بیٹھ گیا۔ مہردل خان نے فیوز کو آگ لگائی اور ہم دوڑتے ہوئے کار میں بیٹھ گئے۔ داؤد خان نے ایک جھٹکے سے کار آگے بڑھا دی۔

''ہمارے پاس آدھے گھنٹے کا وقت ہے۔'' مہردل خان نے ہمیں اطلاع دی۔ ''اس لیے اتنی تیزی دکھانے کی ضرورت نہیں۔

''تمھیں کیسے پتا؟''

''فیوز کی ایک فٹ لمبی تار کے جلنے میں قریباً ایک منٹ لگتا ہے اور میں نے تقریباً تیس فٹ لمبی تار کو شعلہ دیا ہے اس لیے یقیناً آدھا گھنٹا لگ جائے گا۔''

ہم دونوں نے اثبات میں سر ہلا دیے...... اور پھر جب ہم اپنے گاؤں کے قریب پہنچے تو زوردار دھماکوں کی آواز ہمارے کانوں میں پڑی۔ بیس کلومیٹر دور ہونے کے باوجود دھماکوں کی آواز وہاں تک پہنچ گئی تھی۔

گلوکارہ اور سازندوں کو ہم نے گاؤں کے باہر سے ہی رخصت کیا اور خود گھر پہنچ گئے سب گھر والے ہمارے منتظر تھے۔ داؤد خان کے آدمیوں کو حجرے میں چھوڑ کر ہم گھر چلے گئے مور جان اور زرغونہ گل رخ سے مل کر بہت خوش ہوئی تھیں...... سائرہ اپنی امی سے مل کر خوشی سے آنسو بہانے لگی تھی۔

بابا جان نے مجھے اپنے بازوؤں میں بھر لیا تھا...... ''شیر دل خانا!...... میں جانتا تھا کہ میرا بڑا بیٹا شیر ہے شیر...... بس دل کا تھوڑا نرم ہے۔''

''بابا جان! اس کا مطلب ہے کہ آپ مجھے جانور سمجھتے ہیں؟'' میں نے مصنوعی خفگی سے کہا اور سب ہنسنے لگے



منظر وہی دل کو موہ لینے والا تھا۔ چاروں طرف سایہ دار اور پھل دار درخت بکھرے تھے۔ وہاں پھولوں کی بھی بہتات تھی۔ سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا مگر اس کی تمازت میں چاندنی روشنی جیسی ٹھنڈک تھی۔

مہر دل خان نے بارود فٹ کیا اور فیوز کی تار بچھاتے ہوئے ہم باہر آگئے۔ تمام لوگ حویلی کے صحن میں تیار کھڑے تھے۔

''اپنی گاڑیوں میں بیٹھ جاؤ۔'' میں نے چیخ کر کہا۔ جیسے ہی وہ بیٹھے میں نے انھیں چلنے کا اشارہ کر دیا۔ گاڑیاں ایک ایک کر کے حویلی سے نکلتی گئیں...... آخری گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر لالہ داؤد خود بیٹھ گیا۔ مہر دل خان نے فیوز کو آگ لگائی اور ہم دوڑتے ہوئے کار میں بیٹھ گئے۔ داؤد خان نے ایک جھٹکے سے کار آگے بڑھا دی۔

''ہمارے پاس آدھے گھنٹے کا وقت ہے۔'' مہر دل خان نے ہمیں اطلاع دی۔ ''اس لیے اتنی تیزی دکھانے کی ضرورت نہیں۔

''تمھیں کیسے پتا؟''

''فیوز کی ایک فٹ لمبی تار کے جلنے میں قریباً ایک منٹ لگتا ہے اور میں نے تقریباً تیس فٹ لمبی تار کو شعلہ دیا ہے اس لیے یقیناً آدھا گھنٹا لگ جائے گا۔''

ہم دونوں نے اثبات میں سر ہلا دیے...... اور پھر جب ہم اپنے گاؤں کے قریب پہنچے تو زوردار دھماکوں کی آواز ہمارے کانوں میں پڑی۔ بیس کلو میٹر دور ہونے کے باوجود دھماکوں کی آواز وہاں تک پہنچ گئی تھی۔

گلوکارہ اور سازندوں کو ہم نے گاؤں کے باہر سے ہی رخصت کیا اور خود گھر پہنچ گئے سب گھر والے ہمارے منتظر تھے۔ داؤد خان کے آدمیوں کو حجرے میں چھوڑ کر ہم گھر چلے گئے مورجان اور زرغونہ گل رخ سے مل کر بہت خوش ہوئی تھیں...... سائرہ اپنی امی سے مل کر خوشی سے آنسو بہانے لگی تھی۔

بابا جان نے مجھے اپنے بازوؤں میں بھر لیا تھا...... ''شیر دل خانا!...... میں جانتا تھا کہ میرا بڑا بیٹا شیر ہے شیر ...... بس دل کا تھوڑا نرم ہے۔''

''بابا جان! اس کا مطلب ہے کہ آپ مجھے جانور سمجھتے ہیں؟'' میں نے مصنوعی خفگی سے کہا اور سب ہنسنے لگے



منظر وہی دل کو موہ لینے والا تھا۔ چاروں طرف سایہ دار اور پھل دار درخت بکھرے تھے۔ وہاں پھولوں کی بھی بہتات تھی۔ سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا مگر اس کی تمازت میں چاند کی روشنی جیسی ٹھنڈک تھی۔

دھیمی دھیمی ہوا چل رہی تھی، جس کی سرسراہٹ میں ایک نغمگی تھی۔ ایسی نغمگی جو سماعتوں میں رس گھول دیتی ہے۔ وہ ایک نہایت ہی خوب صورت وادی تھی۔ اتنی حسین وجمیل جیسے جنت کا کوئی ٹکڑا۔ وہاں ایک شفاف پانی کا چشمہ رواں تھا۔ اُس چشمے کا پانی اِس قدر صاف وشفاف تھا کہ اُس کی تہہ میں سنہری ریت اور رنگین پتھروں کے ٹکڑے تک چمکتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ خوش آواز پرندے پھل دار درختوں پر چہک رہے تھے اور پھر مجھے وہ نظر آئی ...... وہی جو اس منظر کی جان تھی ...... میں دوڑتا ہوا اس کے قریب پہنچا ...... اس کے ہونٹوں پر دل آویز تبسم ابھرا اور وہ مدھر آواز میں بولی۔

''اٹھ بھی جاؤ ناں؟'' اور میری آنکھ کھل گئی ...... سائرہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہہ رہی تھی ...... ''تمھارے ساتھ ہی تو لیٹی ہوئی ہوں ...... کہاں خوابوں میں ڈھونڈتے پھر رہے ہو؟''

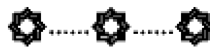
میں نے اس کے گرد اپنی بانہوں کا گھیرا ڈالتے ہوئے کہا۔ ''ڈھونڈتا کہاں ہوں پگلی اب تو میں نے تمھیں خوابوں میں بھی پالیا ہے۔''

ایسے ہی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور بابا جان کی بھاری آواز سنائی دی۔

''شیر دل خاناں! ...... تم نے اذان کی آواز نہیں سنی؟''

''سن لی ہے بابا جان! ...... بس وضو کر رہا ہوں۔''

''ہری اپ ...... ٹائم شارٹ ہے۔'' ان کے منہ سے انگلش کے الفاظ سن کر میں قہقہہ لگا کر ہنس پڑا، سائرہ آج کل انھیں زبردستی انگریزی پڑھا رہی ہے اور وہ سائرہ کی کوئی بات نہیں ٹالتے۔ سائرہ کے علاوہ ان کی دوسری بہو بھی ان کی نک چڑھی ہے۔ جی ہاں آپ صحیح سمجھے راشد کی بہن حنا کی شادی مہر دل خان سے ہوگئی ہے اور زرغونہ راشد کی دلہن بن کر ان کے گھر پہنچ گئی ہے۔



دھیمی دھیمی ہوا چل رہی تھی، جس کی سرسراہٹ میں ایک نغمگی تھی۔ ایسی نغمگی جو سماعتوں میں رس گھول دیتی ہے۔ وہ ایک نہایت ہی خوب صورت وادی تھی۔ اتنی حسین وجمیل جیسے جنت کا کوئی ٹکڑا۔ وہاں ایک شفاف پانی کا چشمہ رواں تھا۔ اُس چشمے کا پانی اِس قدر صاف وشفاف تھا کہ اُس کی تہہ میں سنہری ریت اور رنگین پتھروں کے ٹکڑے تک چمکتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ خوش آواز پرندے پھل دار درختوں پر چہک رہے تھے اور پھر مجھے وہ نظر آئی ...... وہی جو اس منظر کی جان تھی ...... میں دوڑتا ہوا اس کے قریب پہنچا ...... اس کے ہونٹوں پر دل آویز تبسم ابھرا اور وہ مدھر آواز میں بولی۔

''اٹھ بھی جاؤ ناں؟'' اور میری آنکھ کھل گئی ...... سائرہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہہ رہی تھی ...... ''تمھارے ساتھ ہی تو لیٹی ہوئی ہوں ...... کہاں خوابوں میں ڈھونڈتے پھر رہے ہو؟''

میں نے اس کے گرد اپنی بانہوں کا گھیرا ڈالتے ہوئے کہا۔ ''ڈھونڈتا کہاں ہوں پگلی اب تو میں نے تمھیں خوابوں میں بھی پالیا ہے۔''

ایسے ہی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور بابا جان کی بھاری آواز سنائی دی۔

''شیر دل خانا! ...... تم نے اذان کی آواز نہیں سنی؟''

''سن لی ہے بابا جان! ...... بس وضو کر رہا ہوں۔''

''ہری اپ ...... ٹائم شارٹ ہے۔'' ان کے منہ سے انگلش کے الفاظ سن کر میں قہقہہ لگا کر ہنس پڑا، سائرہ آج کل انھیں زبردستی انگریزی پڑھا رہی ہے اور وہ سائرہ کی کوئی بات نہیں ٹالتے۔ سائرہ کے علاوہ ان کی دوسری بہو بھی ان کی منہ چڑھی ہے۔ جی ہاں آپ صحیح سمجھے راشد کی بہن حنا کی شادی مہر دل خان سے ہوگئی ہے اور زرغونہ راشد کی دلہن بن کر ان کے گھر پہنچ گئی ہے۔

